مطالبِ بالِ جبریل

از

غلام رسول مہر

قیمت :- چھ روپے

ناشر :- چمن بک ڈپو - اردو بازار - دہلی نمبر ۶

مطبوعہ : خواجہ پریس دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

بانگ درا کے مطالب کی شرح میں تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے کہ کلام اقبال کی تشریح کیوں ضروری محسوس ہوئی۔ یہ پہلو بھی واضح کر چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں زیادہ بسط و تفصیل سے کام لیا جاتا اور ایک ایک مسئلہ کو کھول کھول کر بیان کیا جاتا تو شرحیں بہت ضخیم ہو جاتیں اور عام شائقین ان سے استفادہ نہ کر سکتے، لہذا تشریح مطالب کا ایسا انداز اختیار کیا گیا کہ کتابیں زیادہ ضخیم نہ ہونے پائیں اور اشعار کا مفہوم بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ مشکل الفاظ و تراکیب اور اشعار کے معنوی محاسن کی توضیح کے علاوہ مسائل کے متعلق بھی ایسے اشارے جا بجا کر دیئے گئے ہیں کہ خوانندگان کرام ان سے بہ طریق احسن مستفید ہو سکیں۔ کوشش برابر یہ رہی کہ اقبال کے مفہوم میں اپنی طرف سے کوئی آمیزش نہ ہونے پائے، تاہم اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ جو کچھ ان کتابوں میں لکھا گیا، اقبال کی غرض و غایت واقعی وہی

تھی۔ اگر کسی مقام پر کسی صاحب کو یہ احساس ہو کہ شارح نے اصل حدود سے تجاوز کیا ہے تو اس کا ذمہ دار۔۔ مجھ ہی کو قرار دینا چاہیئے۔ ایسے مقامات کے متعلق ارباب ذوق شارح کو مطلع فرمائیں گے تو وہ شکریے کے مستحق ہوں گے۔ یہ کتابیں کلام اقبال کے مطالعہ میں معاون کی حیثیت رکھتی ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

'بانگ درا' اقبال کی اردو نظموں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس میں ۱۹۲۲ء تک کا وہ سارا اردو کلام شامل ہے، جو افادۂ عام کے اعتبار سے اقبال کے معیارِ انتخاب پر پورا اترتا تھا اور جس کی اشاعت وحفاظت ان کے نقطۂ نگاہ سے ضروری تھی۔ اس میں ہر قسم کا کلام شامل ہے، مثلاً قومی نظمیں، قدرتی مناظر پر نظمیں، اخلاقی نظمیں، مرثیے، قطعے، غزلیات، ظریفانہ کلام وغیرہ 'بانگ درا' کی اشاعت سے ان کی توجہ فارسی پر مبذول ہو چکی تھی اور وہ 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' شائع کر چکے تھے، جنہیں ان کی مستقل تعلیم میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد 'پیام مشرق' اور 'زبور عجم' اور 'جاوید نامہ' شائع ہوئیں۔ یہ بھی فارسی ہی میں تھیں۔ ان کے بعد پھر اردو پر متوجہ ہوئے۔ اس دور کا پہلا مجموعہ 'بالِ جبریل' ہے، جس میں 'زبور عجم' کے انداز کی اردو غزلیں بھی ہیں، 'پیام مشرق' کے انداز کی رباعیات بھی۔ ان کے علاوہ بعض ایسی نظمیں ہیں جن کی مثال شاید ہی کسی زبان کے شعر و ادب میں مل سکے۔ مثلاً 'مسجد قرطبہ'، 'ذوق وشوق'۔ پھر متفرق قطعات بھی ہیں، جن کی بنا پر 'بالِ جبریل' کے آخری حصہ کو 'ضربِ کلیم' کی تمہید سمجھنا چاہیئے۔

'بانگ درا' کاروانِ ملت ہی نہیں، میرے اندازے کے مطابق کاروانِ انسانیت کے لیے جادہ پیمائی کی پہلی دعوت تھی۔ 'بال جبریل' میں بتلایا گیا ہے کہ جادہ پیمائی کے بعد اس قافلہ کو منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیئے۔ اقبال شمع اور شاعر میں فرماتے ہیں:

کہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری

ہاں سنادے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش!

اسی مناسبت سے اس مجموعۂ کلام کا نام 'بال جبریل' رکھا گیا۔ گویا جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، یہ اسلام کی الہامی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور انہیں تعلیمات پر عمل پیرائی کی دعوت ہے۔

بلاشبہ 'بال جبریل' میں مضمونوں اور عنوانوں کا وہ تنوع نہ ملے گا، جس سے بانگ درا مزین ہے لیکن اس کتاب میں اقبال کی اصل تعلیم زیادہ معین، زیادہ واضح اور زیادہ روشن نظر آئے گی اور یہ بھی ان کے فطری کمال کی دل آویزی و معجز نمائی سے لب ریز ہے۔ حقائق حیات کو شعر کے لباس میں پیش کرنا سہل نہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے 'بال جبریل' اور 'ضرب کلیم' کو دیکھا جائے تو اہلِ نظر کو اندازہ ہو سکے گا کہ اقبال عظمت کے کس بلند مقام پر فائز ہیں۔ ایسی مثالیں دنیائے شعر و ادب میں غالباً بہت ہی کم مل سکیں۔

'بال جبریل' کی تعلیم کا خلاصہ اس کے سر ورق والے شعر سے واضح ہے:

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں

نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

وہ زندگی کے نئے آفتاب کی نمود کا پیغام دے رہے ہیں تاکہ اس دنیا کے شام و سحر کی بے کیفی ختم ہو اور ان تازگی و شادابی کی نئی شان جلوہ گر ہو جائے۔

مسلم ٹاؤن۔ لاہور

۱۰ر جنوری ۱۹۵۶ء

مہر

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	ابتدائی حصہ (غزلیں)	۱۳-۴۸
۲	قصیدہ بہ اتباع سنائی	۴۸-۱۶۶
۳	رباعیات	۱۶۷-۱۷۴
۴	دعا	۱۷۴-۱۷۹
۵	رباعی	۱۷۹-۱۸۰
۶	مسجد قرطبہ	۱۸۱
۷	قید خانے میں معتمد کی فریاد	۲۰۷
۸	عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت	۲۱۰
۹	رباعی	۲۱۴
۱۰	ہسپانیہ	۲۱۵
۱۱	رباعی	۲۱۷
۱۲	طارق کی دعا	۲۱۸
۱۳	رباعی	۲۲۴
۱۴	لینن	۲۲۵
۱۵	فرشتوں کا گیت	۲۳۲
۱۶	فرمان خدا	۲۳۴
۱۷	رباعی	۲۳۸
۱۸	ذوق و شوق	۲۳۹
۱۹	پروانہ اور جگنو	۲۵۰
۲۰	جاوید کے نام	۲۵۱
۲۱	گدائی	۲۵۳
۲۲	ملّا اور بہشت	۲۵۵
۲۳	دین و سیاست	۲۵۶
۲۴	الارض للّٰہ	۲۵۹
۲۵	ایک نوجوان کے نام	۲۶۱
۲۶	نصیحت	۲۶۳
۲۷	لالہ زار	۲۶۴
۲۸	قطعہ	۲۶۶
۲۹	ساقی نامہ	۲۶۷
۳۰	زمانہ	۲۸۶
۳۱	فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں	۲۹۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
٣٢	روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے	291
٣٣	قطعہ	٢٩٢
٣٤	پیر و مرید	٢٩٤
٣٥	رباعی	٣٠٨
٣٦	جبریل و ابلیس	٣٠٩
٣٧	قطعہ	٣١١
٣٨	اذان	٣١١
٣٩	قطعہ	٣١٤
٤٠	محبّت	٣١٥
٤١	ستارے کا پیغام	٣١٨
٤٢	جاوید کے نام	319
٤٣	فلسفہ و مذہب	٣٢٠
٤٤	یورپ سے ایک خط	٣٢٣
٤٥	جواب	٣٢٤
٤٦	نپولین کے مزار پر	٣٢٥
٤٧	مسولینی	٣٢٨
٤٨	سوال	٣٣٤
٤٩	پنجاب کے دہقان سے	٣٣٤
٥٠	نادر شاہ افغان	٣٣٥
٥١	خوش حال خاں کی وصیت	٣٣٦
٥٢	تاتاری کا خواب	٣٣٨
٥٣	حال و مقام	٣٤١
٥٤	ابو العلا معرّی	٣٤٣
٥٥	سنیما	٣٤٤
٥٦	پنجاب کے پیرزادوں سے	٣٤٦
٥٧	سیاست	٣٤٩
٥٨	فقر	٣٥٠
٥٩	خودی	٣٥١
٦٠	جدائی	٣٥٢
٦١	خانقاہ	٣٥٣
٦٢	ابلیس کی عرض داشت	٣٥٣
٦٣	لہو	٣٥٤
٦٤	پروانہ	٣٥٥
٦٥	شیخ مکتب سے	٣٥٦
٦٦	فلسفی	٣٥٧

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۶۷	شاہین	۳۵۹
۶۸	باغی مرید	۳۵۹
۶۹	ہارون کی آخری نصیحت	۳۶۰
۷۰	ماہر نفسیات سے	۳۶۲
۷۱	یورپ	۳۶۳
۷۲	آزادیٔ افکار	۳۶۴
۷۳	شیر اور خچّر	۳۶۵
۷۴	چیونٹی اور عقاب	۳۶۶

عنوان

عنوان

اقبال نے خود فرمایا ہے کہ یہ شعر بھرتری ہری کے کلام سے ماخوذ ہے۔

بھرتری ہری زمانۂ قدیم میں مالوہ کا حکمراں تھا۔ ابتدائی زندگی عیش و عشرت میں بسر کی، پھر ایک دم طبیعت بادشاہی اور دنیاداری سے بیزار ہوگئی اور سب کچھ چھوڑ کر درویش بن گیا۔ غالباً اسی زمانہ میں اس نے بعض کتابیں لکھیں۔ زیرِ غور شعر بھرتری کے مندرجۂ ذیل حکیمانہ قول سے ماخوذ ہے:

عقل کے زور سے کسی شخص کا کسی مورکھ کو راہ راست پر لانے کے لئے کوشش کرنا ایسا ہی بے سود ہے جیسا کسی شخص کا مست ہاتھی کو کنول کے ڈنٹھل سے روکنا یا ہرس کے نازک ریشوں سے ہیرے میں چھید کرنا۔

اقبال کہتے ہیں کہ پھول کی پتی ہیرے کا جگر کاٹ سکتی ہے اور یہ ناممکن ممکن بن سکتا ہے، لیکن بے سمجھ آدمی پر نرم و نازک کلام کا کچھ اثر نہیں ہوسکتا۔

(۱)

ذات: باری تعالیٰ کی ہستی، وجودِ مطلق۔ **نقش بند:** نقش باندھنے والا، نقش بنانے والا، نقاش۔ **صفات:** باری تعالیٰ کی وہ صفتیں جن کی وجہ سے انسانوں میں ذات کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہے۔ **رستخیز:** قیامت۔

۱۔ میرے عشق کے نغموں سے ذات کی بارگاہِ خاص میں شور پیدا ہو گیا اور ان نغموں کے باعث صفات کے بت خانے سے پناہ خدا کے غلغلے بلند ہونے لگے۔

مطلب یہ کہ میں ذات باری تعالیٰ کا عاشق ہوں۔ جب میں نے جوشِ عشق میں آہ و فریاد شروع کی تو وہ اتنی دردانگیز اور اتنی پرسوز تھی کہ ذات باری تعالیٰ کی خاص بارگاہ میں ایک شور بپا ہو گیا اور صفات کے بت کدے سے تو الاماں والحفیظ کی صدائیں اٹھنے لگیں۔

اسلوب بیان کے اعتبار سے شعر میں دو لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں: ایک حریم دوسرا بت کدہ۔ حریم اس مقام کو کہتے جس میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ یقیناً ذات باری تعالیٰ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا اس کے لئے حریم کا لفظ نہایت موزوں ہے۔ باری تعالیٰ کے متعلق تصور باندھنے کے لئے صفات مقرر ہوئیں۔ یعنی ذات پاک علیم ہے، سمیع ہے، کریم ہے، رحیم ہے وغیرہ عاشقِ ذات نے ان صفات کو بت تصور کیا، اس لئے کہ یہ غیرِ ذات ہیں لہٰذا بت کدے کا لفظ استعمال کیا۔ عاشقِ ذات نہ صفات کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور نہ ان پر قناعت کر سکتا ہے۔ اسے حضوری کے امکان و عدم امکان سے

بھی کوئی بحث نہیں ہوتی۔ وہ چاہتا ہے کہ ذات کے بے حجاب دیکھے، اگرچہ خود ایک ہی جلوے میں بھسم ہو کر رہ جائے۔ اب شعر کے اسلوب بیان پر غور کیجئے۔ فرماتے ہیں کہ میری عاشقانہ صداؤں سے حریم ذات میں تو شور بپا ہوا لیکن صفات کے بت خانے سے پناہ بخدا کے نعرے اٹھنے لگے۔ اس لئے بھی کہ عاشق ذات کی فریاد صفات سے آگے بڑھنا چاہتی ہے، اس لئے بھی کہ یہ فریاد صفات کے بت توڑے بغیر ذات تک نہیں پہنچ سکتی۔ لہٰذا بت خانے سے الامان و الحفیظ کے سوا اور کیا سنا جا سکتا تھا۔

۲۔ حور اور فرشتے میرے تخیلات کی زنجیروں میں قید ہیں یعنی اگرچہ وہ غیر مادّی ہیں لیکن میں جس کی فریاد حریم ناز میں شور پیدا کر سکتی ہے، ان کی حقیقت کو خوب سمجھ چکا ہوں۔ میری نگاہ اتنی بے باک ہے کہ اس نے ذات کی تجلیات میں خلل پیدا کر دیا ہے یعنی وہ اپنی اصل حالت پر قائم نہیں رہیں۔

۳۔ اگرچہ میں نے تیری تلاش میں بت خانے اور کعبے کے نقشے تیار کر لئے اور جگہ جگہ مختلف قسم کی عبادت گاہیں بنا لیں۔ لیکن ان عبادت گاہوں میں تیرا کوئی نشان نہ مل سکا تو میں نے اپنی آہ و فریاد سے کعبے اور بت خانے دونوں میں قیامت برپا کر دی۔

۴۔ کبھی تو میری نگاہ میں اتنی تیزی پیدا ہو گئی کہ اس نے ہستی کا دل چیر ڈالا اور اس میں سے تیر کی مانند گزر گئی۔ کبھی وہ میرے اپنے ہی پیدا کئے ہوئے وہم و گمان میں الجھ کر رہ گئی۔

اس شعر میں انسان کی مختلف حالتوں کا نقشہ انتہائی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ اے میرے محبوب! اس کائنات کے سینے میں ہی تو ایک بھید تھا۔ تو نے یہ کیا غضب کیا کہ مجھے فاش کر کے رکھ دیا۔

اس نظم میں اصل خطاب محبوبِ حقیقی سے ہے۔ اشعار کے عام مطالب واضح کر دیے گئے، لیکن ان سے حقیقی لذت اندوزی ذوقی و وجدانی چیز ہے۔ محض تشریح پر موقوف نہیں۔

رباعی

اے محبوب! کیا تیری صراحی میں شراب نہیں رہی؟ یا کیا تو میرا ساقی نہیں؟ اگر ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں نہیں، اثبات میں ہے یعنی تو میرا ساقی بھی ہے اور تیرے پاس شراب کی بھی کمی نہیں تو مجھے بتا، کیا یہ مناسب ہے کہ سمندر سے پیاسے کو شبنم کی مانند چند قطرے مل جائیں؟ اسے تو رزاقی نہیں کہہ سکتے، یہ تو کھلی ہوئی کنجوسی ہے۔ رزاقی کی شان یہ ہے کہ سمندر سے پیاسا جس قدر چاہے پی لے۔ اس لئے کہ سمندر میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

(۲)

ا۔ اگر ستارے ٹیڑھے چل رہے ہیں اور ان کی رفتار درست نہیں تو اس کا ذمہ دار میں کیوں کر ہو سکتا ہوں؟ آسمان میرا نہیں، تیرا ہے اور تو ہی ستاروں کو سیدھا چلانے کا مختار ہے۔ میں دنیا کی فکر میں کیوں مبتلا ہوں؟ دنیا میری نہیں تیری ہے۔

مراد یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے

مطابق ہو رہا ہے جس سے ہمیں کوئی آگاہی نہیں۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ تکوین کے جھگڑوں میں نہ پڑیں اور خدا نے ہماری رہنمائی کے لئے جو حکم دے رکھے ہیں، ان کی تعمیل کرتے رہیں۔

۲۔ اگر لامکاں میں جہاں تیری ذات کی خاص جلوہ فرمائیاں ہیں، عشق و عاشقی کے ہنگامے نظر نہیں آتے تو یہ کس کا قصور ہے؟ اے خدا! لامکاں میرا نہیں، تیرا ہے۔ تو اپنی مرضی سے جہاں جو چاہے، پیدا کر لے۔

۳۔ ازل کی صبح کو جب اس کائنات کی پیدائش ہوئی، ابلیس نے تیرا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے انکار کا حوصلہ کیونکر ہوا؟ اس سوال کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں؟ وہ تیرا رازداں ہے میرا نہیں یعنی ابلیس کے انکار کی مصلحت بھی خدا ہی کو معلوم ہے، انسان یہ بھید نہیں پا سکتا۔

۴۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم بھی تیرے ہیں۔ تو نے انہیں خاتم الرسل بنایا۔ تو نے انہیں سب سے آخر میں اس کائنات کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ جبریلؑ بھی تیرے ہیں۔ وہ تمام انبیا کے پاس تیرا پیغام پہنچاتے اور تیرے احکام لاتے رہے۔ قرآن مجید بھی تیری نازل کی ہوئی آخری کتاب ہے۔ مگر یہ میٹھی بات جسے جذبۂ عشق کہتے ہیں، یہ بھی تو تیرا ہی ترجمان ہے، میرا نہیں۔

۵۔ اے خدا! تیری اس دنیا میں اسی وقت تک روشنی باقی ہے، جب تک خاکی انسان کا ستارہ چمک رہا ہے۔ اگر یہ ستارہ ڈوب گیا اور آدم خاکی پر زوال آگیا تو اس میں میرا کیا بگڑے گا؟ جو نقصان ہوگا، تیرا ہی ہوگا۔

(۳)

۱۔ اے میرے محبوب! تو اپنی تابدار زلفوں کو اور بھی تابدار بنا دے۔ ان میں پہلے بھی اگرچہ بڑے پیچ و خم ہیں ان میں اور اضافہ کر دے۔ میری عقل اور سمجھ میرے دل اور نگاہ سب کو زلفوں کے دام میں الجھا کر شکار کرلے یعنی میری ہر شی اپنے قبضہ میں لے لے اور مجھے اپنی ذات میں گم کر دے۔

۲۔ اے میرے محبوب! بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ عشق بھی پردے میں ہو اور حسن بھی پردے میں؟ تو حسن ہے یا تو اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دے اور ظاہر ہو جا یا مجھے ظاہر کر دے تاکہ میں عشق کے جوہر دکھا سکوں۔

۳۔ تو ایک وسیع سمندر ہے جس کے کنارے کا کچھ پتا نہیں لگ سکتا، میں ندا سی ندی ہوں۔ یا تو مجھے اپنی آغوش میں لے لے تاکہ میں بے کنارہ بن جاؤں یا مجھی کو وسعت دے کر بے کنارہ کر دے۔

۴۔ میں سیپی ہوں میری گود میں جو موتی ہے، اس کی آبرو تیرے ہاتھ ہے، یعنی تو ہی اسے آب و تاب بخش سکتا ہے، تو ہی اس کی قدر و قیمت قائم رکھ سکتا ہے۔ اگر میں بوت ہوں تو تو مجھے ایسا موتی بنا دے جو بادشاہوں کے لائق ہو۔

۵۔۔ اگر نئی بہار کے نغمے میری قسمت میں نہیں تو میرے ادھ جلے سانس کو بہار کی خوش خبری دینے والا پرندہ بنا دے۔

مطلب یہ کہ میری عمر مسلمانوں کو دنیا میں از سر نو عروج کی منزل پر پہنچانے کے لئے وقف رہی۔ اگر میں اس عروج کی بہار تک زندہ نہیں رہ سکتا تو اے باری تعالیٰ! اپنے لطف و کرم سے ایسی صورت پیدا کر دے کہ میرا وجود دور عروج کی

تمہید بن جائے۔

۶۔ مجھے تو نے بہشت سے کوچ کا حکم کیوں دیا تھا؟ تیرے حکم کے ماتحت میں اس دنیا میں آگیا اور جو کام سپرد ہوا تھا اس میں لگ گیا۔ یہ کام بہت لمبا ہے اور جلد ختم نہیں ہو سکتا۔ نہ میں اسے ادھورا چھوڑ سکتا ہوں۔ اب مہربانی فرما کر میرا انتظار کر۔

۷۔ قیامت کے دن جب میرا اعمال نامہ تیرے روبرو پیش ہوگا تو مجھے اپنے گناہوں پر یقیناً شرم آئے گی۔ یہ شرم رحیم و کریم خدا کی رحمت کو جوش میں لائے گی۔
شیخ سعدیؒ نے گلستاں کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ خدا بندے کی فریاد سُن کر فرشتوں سے کہے گا مجھے اپنے بندے سے حیا آتی ہے، میرے سوا اس کا کوئی نہیں۔ گویا گناہوں پر بندے کی ندامت اور شرمساری اس کی مغفرت کا سامان بن جائے گی۔

یہ شعر کہتے وقت اقبالؒ کے سامنے غالباً شیخ سعدیؒ کا یہ شعر تھا:

کرم بین و لطف خداوندگار
گنہ بندہ کردست و او شرمسار

بندے کے لئے شرمساری کے دو پہلو ہوں گے، ایک اپنے گناہوں پر شرمساری، دوسرے گناہوں کے باوجود بخشے جانے پر شرمساری

رباعی

اے خدا! مسلمانوں کے دلوں کو پھر اپنی محبت سے بھر دے اور انہیں

وفاداری کے راستے پر لگا دے۔ وہ اصل مقصود سے نا آشنا ہو چکے ہیں۔ انہیں پھر اپنی ذات بابرکات سے آشنائی کا شرف بخش دے۔ اگرچہ انہیں دولت و ثروت نہیں ملی۔ غریبی میں گزارہ کر رہے ہیں اور جو کی روٹی کھا رہے ہیں، تاہم انہیں حضرت علی مرتضیٰؓ کی سی قوت بازو عطا فرما۔

آخری شعر میں خوبی یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ بھی عموماً جو ہی کی روٹی کھاتے تھے۔ اقبال نے یہ مضمون کئی مقامات پر باندھا ہے۔ مثلاً "بانگ درا" میں:

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

(۴)

۱۔ اے خدا میری فریاد اثر کرے یا نہ کرے، لیکن اسے سن تو لے۔ واضح رہے کہ میں داد کا طلب گار نہیں، بلکہ ایسی جھنجھٹوں سے بالکل آزاد ہوں۔

۲۔ ایک طرف خاک کی مٹھی یعنی انسان ہے۔ پھر اس کے لئے دنیا میں بلاؤں اور مصیبتوں کے جھکڑ ہیں۔ آسمانوں کی پوری وسعت میں یہی جھکڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ میں کیا عرض کروں کہ تیرے شوق تخلیق کا یہ کرشمہ لطف و عنایت ہے یا قہر و غضب؟

۳۔ بے شک بہار نے پھول پیدا کئے، لیکن باغ کی ہوا میں پھولوں کا خیمہ قائم نہ رہ سکا۔ چند ہی روز میں کلیاں پھوٹیں، کھلیں اور مرجھا گئیں۔ اب تو ہی فرما کہ اسے فصل بہار کہیں یا اسے باد مراد سمجھیں؟

۴۔ میں بے شک قصور وار پردیسی ہوں، جسے کہیں سے اٹھا کر یہاں بھیج دیا گیا، لیکن یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ دنیا کا ویرانہ تیرے فرشتے آباد نہ کر سکے اسے

میں نے ہی آباد کیا اور گل و گلزار بنا دیا۔

۵۔ یہ دنیا جو آنی و فانی ہے اور اسے پائداری نصیب نہیں، میرے وجود سے پہلے ایک چٹیل میدان تھی۔ میری ہی محنت و جانفشانی سے اس میں رونق اور چہل پہل پیدا ہوئی اور اسی لئے یہ مجھے دعائیں دے رہی ہے۔

۶۔ میری طبیعت کو شروع سے خطرے پسند ہیں۔ میں بلاؤں اور مصیبتوں میں خوش ہوتا ہوں۔ مجھے وہ باغ ہرگز پسند نہیں، جہاں کوئی شکاری گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ یعنی میں نے ہر قسم کے خطرات قبول کیے اور اس دنیا کی رونق کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

۷۔ عشق و عاشقی تیرے قدسیوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ انہیں کا کام ہے، جن کے حوصلے بلند اور ہمتیں ارجمند ہوں۔

اس نظم میں انسان کی سرگزشتِ محنت و مشقت بیان کر کے اس کی اثر فضیلت ثابت کی گئی ہے۔

رباعی

اے خدا! مسلمان نوجوانوں کو میری صبح کے وقت کی فریاد عطا کر۔ یہ شہباز کے بچے ہیں، انہیں وہ بال و پر دے جن سے انتہائی بلندیوں پر اڑیں۔ میری آرزو اس کے سوا کچھ نہیں کہ بصیرت کا جو نور مجھے عطا ہوا ہے، وہ عام ہو جائے۔ اور ہر جگہ پھیل جائے۔

---

(۵)

مستعار: لفظی معنی مانگی ہوئی، اصطلاحی عارضی اور فانی۔

۱۔ فانی اور عارضی زندگی کے عشق کی حیثیت کیا ہے؟ جو وجود قائم نہ رہنے والا ہو وہ ہمیشہ قائم رہنے والے اور غیر فانی وجود سے کیا محبت کر سکتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی چند روزہ ہے، وہ خدا کی ذات سے عشق کے حوصلے کیا پورے کر سکتا ہے؟

۲۔ جس عشق کے چراغ کو موت کی پھونک گل کر سکے، اس میں فراق کی تڑپ اور محبوب کے انتظار کا کیا مزہ ہے؟

۳۔ میری حیثیت کیا ہے؟ لمحہ بھر کے لئے چمکنا اور ختم ہو جانا۔ چنگاری کا شعلے سے الجھنا اسراف بیجا ہے۔

اس شعر میں شعلے سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے اور شرر سے فانی انسان ہے۔

۴۔ اے خدا! پہلے مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر، پھر میرے تڑپتے ہوئے دل کے ذوق و شوق کا تماشا دیکھ۔

۵۔ مجھے وہ کانٹا دے جس کی چبھن اور خلش ہمیشہ قائم رہے اور وہ درد عطا کر جس کی ٹیس کبھی نہ مٹ سکے۔

(۶)

ناپید اکراں: جس کا کنارہ نظر نہ آئے۔ خود نگہداری: اپنے آپ کو نگاہ میں رکھنا۔ دنبالہ: پشت، پیچھے۔

۱۔ عشق میں میری خاک پریشاں ہو رہی ہے۔ یہ خاک پریشان ہو کر کہیں دل

نہ بن جائے۔ اب دل ہی کی وجہ سے میں مشکلات میں مبتلا ہوں۔ یہ نہ ہوتا تو عشق بھی نہ ہوتا۔ کہیں پھر انہی مشکلوں سے سابقہ نہ پڑ جائے۔

مطلب یہ کہ میں مر جاؤں گا تو میری خاک پریشان ہو جائے گی اگر اس سے پھر دل پیدا ہو گیا تو جو مشکل زندگی میں میرے لئے مصیبت کا باعث بنی رہی وہ زندگی ختم کے بعد بھی میرا پیچھا نہ چھوڑے گی۔

۲۔ بہشت کی حوریں کہیں مجھے آہ و فریاد پر مجبور نہ کر دیں! اس دنیا میں تو میرے دل کا سوز محفل کی رونق کا باعث بنا رہا، بہشت میں بھی یہی حالت پیش نہ آ جائے۔

۳۔ سفر میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسافر جس منزل سے گزر جاتا ہے اس کی یاد اسے تڑپاتی رہتی ہے۔ میرے سینے میں بھی ایک چبھن سی موجود ہے کہیں یہ چبھن چھوڑی ہوئی منزل کا غم نہ بن جائے۔ اگر ایسا ہوا تو میں سفر جاری نہ رکھ سکوں گا۔ اور گزشتہ منزل ہی کے غم میں الجھا رہوں گا۔

۴۔ عشق نے مجھے ایسا سمندر بنا دیا جس کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا۔ مجھے خوف ہے کہ میرا اپنی ذات پر نظر جمائے رکھنا ہی میرے لئے کنارہ نہ بن جائے۔

مطلب یہ کہ عشق انسان کو بے پایاں سمندر بنا دیتا ہے لیکن عشق کا خاصہ یہ ہے کہ عاشق محبوب میں گم ہو جائے۔ اگر وہ اپنی حیثیت بحال رکھنا چاہے گا تو وہ شے اس کا کنارہ بن جائے گی۔

۵۔ مجھے یہ اندیشہ پریشان کر رہا ہے کہ جب میں اس دنیا میں پہنچ جاؤں گا، جو رنگ و بو سے بالکل پاک ہے تو میرا [illegible] شوق اور محبوب کی تلاش جو محفل کے

پیچھے پیچھے جانے کی صورت اختیار نہ کرلے۔

اس شعر میں اس مشہور افسانہ کی طرف اشارہ ہے جو عام روایت کے مطابق مجنوں کو پیش آیا تھا یعنی لیلاٰ کے لئے قاصد کے ہاتھ پیغام بھیجا اور قاصد کے پیچھے پیچھے مجنوں خود بھی چل پڑا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس رنگ و بو کی دنیا میں تو مجھے محبوب مل نہ سکا دوسری دنیا میں بھی کہیں یہی کیفیت پیش نہ آجائے۔

۶۔ خاکی انسان کے عروج اور سربلندی کا تصوّر کر کے ستارے سہمے جا رہے ہیں۔ انہیں یہ ڈر کھائے جاتا ہے کہ یہ تارا جو پہلے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا تھا، کہیں پھر کمال کی منزل طے کرتا ہوا ماہِ کامل نہ بن جائے۔

رباعی

اے خدا! تیری دنیا مرغ و ماہی کا جہان ہے یعنی اس کائنات میں جو کچھ ہے، وہ تیرا پیدا کیا ہوا ہے۔ میری زندگی کی پونجی صبح کے وقت کی آہ و فریاد ہے اور اسی کو میں اپنی دنیا سمجھتا ہوں۔

تیری دنیا میں مجھے محکوم اور مجبور کی حیثیت حاصل ہے یعنی نہ حکم کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے نہ اختیار کی لیکن میری دنیا میں تیرے سوا کسی کی بادشاہی نہیں، اس لئے کہ میری آہ و فریاد کا مرکز صرف تو ہے۔ میں بے اختیار، تو مختار ہے۔

(۷)

پیدائی: ظہور۔

۱۔ اے ساقی! دنیا میں انقلاب آگیا۔ زمانہ بدل گیا۔ ستاروں کی گردش

تیز ہوگئی۔ ہر ذرّے کے دل میں قیامت کے دن جیسا شور وغوغا بپا ہے۔

۲۔ اللہ والوں کے پاس دین اور عقل کا جو سرمایہ تھا، لٹ گیا۔ کوئی شے باقی نہیں رہی۔ یعنی دین، عقل اور علم وہنر سے بالکل خالی ہوگئے۔ اے ساقی! یہ کس کافروں جیسے طور طریقہ والے کے خونریز غمزے کا کرشمہ ہے؟

۳۔ مسلماں اسی پرانی بیماری میں مبتلا ہیں، یعنی ان کے دل ایمان پر پختہ نہیں رہے وہ راہ حق سے ڈگمگا رہے ہیں۔ اے ساقی۔ اس بیماری کا علاج ایمان کا وہی آب حیات ہے، جسے حلق سے اتارتے ہی قلب وروح پر نشاط کی کیفیت چھا جائے۔ وہی دل کی کمزوری اور ناپختگی کو دور کر سکتا ہے۔

۴۔ اہل کعبہ یعنی مسلمانوں کے دل میں آرزو کا سوز پیدا نہیں ہوتا۔ آہ، وہ عالی ہمتی اور بلند حوصلگی سے خالی ہوگئے۔ اے ساقی! کیا تجھے اس کا سبب معلوم ہے؟ سبب یہ ہے کہ تو بے پردہ جلوہ نہیں دکھاتا۔ تیرے حسن کی تجلیاں اگرچہ آنکھوں کو منور کرتی رہتی ہیں، لیکن ابھی تک ان میں حجاب کا رنگ غالب ہے۔ حجاب بالکل اٹھ جائے تو مسلماں کے دل میں وہی ذوق وشوق اور وہی جذبہ وآرزو پیدا ہو جائے جو اسلاف کرام کی خاص دولت تھی۔

۵۔ ایران کی سرزمین بھی وہی ہے، اس کی آب وگل میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا مشہور شہر تبریز بھی اپنی جگہ باقی ہے جو حضرت شمسؒ کا وطن تھا، لیکن اے ساقی! کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ اس سرزمین سے پھر مولانا روم جیسا کوئی شخص پیدا نہ ہوا۔ اس لئے کہ کوئی شمس تبریزی تربیت کے لئے موجود نہ رہا۔

۶۔ اقبال اپنے اس کھیت سے ناامید نہیں، جو اس وقت ویران نظر آرہا ہے

مگر اس کے لئے تھوڑی سی آبیاری کا انتظام ہو جائے تو کھیت کی مٹی بڑی زرخیز ہے اور بڑی اچھی فصل دے گی۔

مراد یہ ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کی ظاہری حالت کچھ اچھی نہیں لیکن مایوس نہ ہو جانا چاہئے۔ ان قابلیت کے جوہر موجود ہیں۔ حالات ذرا موافق ہوں تو یہ ترقی کے اعلیٰ درجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

۷۔ میں وہ فقیر ہوں جو راستہ پر بیٹھا رہتا ہے اور آنے جانے والے اسے کچھ دے دلا جاتے ہیں لیکن خدا کی رحمت دیکھئے کہ اس نے مجھے بادشاہی کے بھید بتا دیئے اور میرے تھوڑے بھی کلام کو وہ درجہ عطا ہوا کہ اگر دولت کی شکل دی جائے اس کی قیمت کا اندازہ کیا جائے تو ایران کے مشہور بادشاہ خسرو پرویز کے تمام خزانے اس پر نچھاور کئے جا سکتے ہیں۔

رباعی

اے خدا! یہ تیرا انتہائی کرم ہے کہ مجھے بے جوہر نہ رکھا اور طغرل یا سنجر جیسے بادشاہ کا غلام نہ بنایا یعنی جوہر بھی دیئے اور بادشاہوں کی درباداری سے بھی دور رکھا۔

بے شک میری فطرت ہی یہ ہے کہ دنیا کے حالات پر گہری نظر رکھوں اور پیش آنے والے واقعات کا اندازہ کرتا رہوں یہ میرا طبعی جوہر ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے کسی جمشید کا پیالہ نہ بنایا۔

جمشید کا پیالہ بھی عام روایت کے مطابق آئندہ کے حالات بتا دیتا تھا۔ اسی

لحاظ سے جام جمشید اور اقبال میں ایک گونہ مناسبت ہوئی لیکن اقبال کا شرف یہ ہے کہ خدا نے اسے بادشاہوں سے بے نیاز رکھا۔

(۸)

تہی: خالی۔ تیغ جگردار: جوہردار تلوار، وہ تلوار جس کی کاٹ بے پناہ ہو

۱۔ اے ساقی! ایک مرتبہ پھر وہی پرانی شراب اور پیالے آجیں۔ یعنی کم مجھے کھویا ہوا مقام حاصل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس شراب سے مراد دین حق کی وہ خالص شراب ہے جو مسلمانوں کو از سرِ نو سابقہ عروج و عظمت پر پہنچا دے۔

۲۔ تین سو سال سے ہندوستان کے شراب خانے بند پڑے ہیں۔ یہ کب تک بند رہیں گے؟ اے ساقی! مناسب یہی ہے کہ پہلے کی طرح پھر تیرا فیض عام ہو جائے اور دین حق کی شراب سب میں بٹنے لگے۔

تین سو سال کی مدت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشارہ حضرت مجدد الف ثانی کی طرف ہے جنہوں نے جہانگیر کے عہد میں وفات پائی۔ انہوں نے اکبر اور جہانگیر کے دور میں احیائے شریعت اور تزکیہ باطن کے جو وسیع انتظامات فرما دیئے تھے اقبال ان سے بہت متاثر تھے۔

۳۔ اے ساقی میری غزل کی صراحی میں اس شراب کا کچھ حصہ باقی تھا۔ شیخ کا فتویٰ ہے کہ یہ بھی حرام ہے۔ یعنی میں خدمت دین کے سلسلے میں جو تھوڑا بہت کام کرنا چاہتا ہوں، ہمارے عہد کے علماء اسے بھی پسندیدہ نہیں سمجھتے۔

۴۔ تحقیق کا جنگل خدا کے شیروں اور جاں بازوں مردوں سے خالی ہو گیا۔ اے ساقی! اب وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جو یا تو صوفیوں کے غلام ہیں یا ملاؤں کے۔

"صوفی" سے مراد وہ لوگ ہیں، جنہوں نے جا بجا پیری کی گدیاں قائم کر رکھی ہیں پنجاب، سندھ اور سرحد کے علاقوں میں ان گدیوں کی کمی نہیں "ملا" سے مراد آج کل کے عام مولوی ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے آپس میں جھگڑتے اور مسلمانوں کو باہم لڑاتے رہتے ہیں۔

۵۔ ہم عشق اور علم دونوں کے مالک تھے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ عشق کی جوہر دار تلوار کوئی اڑا لے گیا۔ علم کے ہاتھ میں خالی میان رہ گیا جو کچھ کام نہیں دے سکتا۔ مطلب یہ کہ عشق حق موجود نہ ہو تو علم دین کی حیثیت وہی ہے۔ جیسے تلوار کے بغیر میان۔

۶۔ سینہ حقیقت شناسی کی تپش سے روشن ہو تو شعر کا سوز و گداز عین زندگی کا پیغام بن جاتا ہے۔ جو بھی اسے سنتا ہے، اس میں نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا سینہ روشن نہ ہو تو اے ساقی! شعر الٹی موت کی نیند سلا دیتا ہے۔

۷۔ اے ساقی! تیرے پیالے میں وہ شراب موجود ہے، جسے ماہ کامل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ مجھ پر لطف فرما، میری اندھیری رات کو اس ماہ کامل کی روشنی سے محروم نہ رکھ اور اس میں اجالا کر دے۔

رباعی

مکان اور لامکاں کی اصل خود خدا ہے۔ مکان کیا شے ہے؟ یہ بیان کا ایک طریقہ ہے جو ہم نے اختیار کر لیا ہے یعنی ایک اصطلاح بنالی ہے اور اس سے کام لینے لگے۔

اگر کوئی مچھلی حضرت خضرؑ سے یہ سوال کرے کہ حضرت! دریا کہاں ہے؟ تو بتاؤ اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟

اس رباعی کا مفہوم یہ ہے کہ اشیا کا خارجی وجود حقیقی نہیں محض ہمارے حواس نے یہ صورتیں قائم کر رکھی ہیں۔

(۹)

۱۔ میرے ساقی نے مجھے لا الٰہ الا ھو (نہیں کوئی عبادت کے لائق سوا اس کے یعنی خدا کے) کی شراب پلا کر میں اور تو کا فرق مٹا یا یعنی کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔

۲۔ نہ مجھے شراب چاہئے، نہ شعر، ساقی کا آرزومند ہوں، نہ چنگ و رباب کے نغموں کا۔ مجھے تو پہاڑ کی خاموشی، ندی کا کنارہ اور اس پر خودبخود اُگے ہوئے لالے کے پھول چاہئیں۔ یہی چیزیں میرے قلب و روح کے لئے سکون کا سامان بن سکتی ہیں۔

۳۔ شراب خانے کے درویش کی بے نیازی کا انداز اور رنگ ڈھنگ تو دیکھ، وہ آبِ حیات کے چشمے پر پہنچ کر اپنا ظرف توڑ ڈالتا ہے یعنی عاشق حق نہ آبِ حیات پینا چاہتا ہے نہ ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔

۴۔ میرے پاس جس چھوٹے سے ظرف میں شراب بھری ہوئی ہے، اسے غنیمت سمجھ۔ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ خانقاہوں میں صوفیوں کے تونبے خالی رہ گئے، یعنی ان کے کسی ظرف میں عشقِ حق کی شراب کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں۔

۵۔ میں نیا نیا نیاز بردلوں میں شامل ہوا ہوں، بہتر یہی ہے کہ محبوب میرے سامنے نہ آئے اور پردے میں رہے، اس لئے کہ دل تو ایک طرف، میری نگاہ، دل سے بھی بڑھ کر بے اختیار ہے اور اسے قابو میں رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس

شعر میں آغاز عشق کی بے تابیاں واضح کی گئی ہیں۔

۶۔ موتی اگرچہ سمندر کی لہروں میں دن گزارتا ہے لیکن وہ لہروں سے بالکل بے تعلق رہتا ہے اور اپنی فطرت کی پاکیزگی کے مصفّا پانی سے وضو کرتا ہے اپنی فطرت پاکیزہ ہونے کے باعث برابر پاکیزہ رہتا ہے۔

۷۔ رنگین و دل کش شعر کہنے والے شاعر کی نگاہ میں ایسا جادو ہے کہ گلاب اور لالے کے پھول اس کے فیض سے اور زیادہ شاداب و خوش رنگ بن جاتے ہیں۔

رباعی

عشق مختلف صورتیں اختیار کرتا اور مختلف بھیس بدلتا ہے کبھی وہ آوارہ اور بے ٹھکانے ہوتا ہے اسے گھر بار کی بھی سدھ بدھ نہیں رہتی کبھی وہ ایران کے مشہور بادشاہ نوشیرواں کی طرح بادشاہوں کا بادشاہ بن جاتا ہے۔

کبھی زرہ پہن کر میدان جنگ میں آتا ہے کبھی محض حفاظت کا یہ سامان ہی الگ نہیں کرتا بلکہ تلوار اور نیزہ بھی ساتھ نہیں لیتا۔

تاریخ میں ان مختلف صورتوں کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں مطلب یہ ہے کہ عشق حق کی کوئی خاص صورت نہیں موقع اور ماحول کے اعتبار سے اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔

(۱۰)

دیر پیوندی: دیر کے بعد ملنا۔ الوندی: الوند سے متعلق۔ الوند ایران کا ایک مشہور پہاڑ ہے۔ مشاطگی: بناؤ سنگار کرنا۔

۱۔ عشق میں محبوب کی آرزو کا سوز و درد نہایت بیش قیمت سرمایہ ہے اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں بندگی کا ذوق و شوق چھوڑ کر آقائی کی بے نیازی لے لوں تو میں یہ سودا کبھی نہ کروں گا۔

۲۔ آزاد بندے کوئی پابندی اور کوئی قید قبول نہیں کر سکتے۔ اے خدا! تیرے عاشقوں کے لئے تو نہ موجودہ دنیا رہنے کے قابل ہے، نہ آنے والی دنیا، اس لئے کہ یہاں مرنے کی قید اور آنے والی دنیا میں جینے کی قید ہے۔

اس دنیا میں کسی شخص کو موت سے چھٹکارا نہیں۔ وہ ہر حال میں مرے گا۔ یہ پابندی ہو گئی موت کے بعد آنے والی دنیا میں ہمیشہ کی زندگی ہو گی، لہذا وہاں جینے کی پابندی ہو گئی، آزاد بندے دونوں جگہ طبیعت کے خلاف پابندیوں میں جکڑے گئے۔

۳۔ جو عاشق محبت کے کوچہ میں آوارہ اور سرگرداں پھر رہا ہے محبوب کا پردے میں رہنا اس کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے کیونکہ محبوب کا جلوہ دیکھنے کے بعد نظر آتا ہے اور عشق کی آگ بھڑکتی رہتی ہے گویا محبوب کا فراق عشق کی آگ کے لئے ہوا کا کام دیتا ہے۔

۴۔ شہباز کے لئے آشیاں بنا کر رہنا ذلت کا باعث ہے۔ وہ پہاڑوں اور جنگلوں ہی میں زندگی کے دن بسر کر لیتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ عالی ہمت اور بلند حوصلہ افراد کو اسباب سے زیادہ [illegible] رہنا چاہئے اور یہ ان کے لئے زیبا بھی نہیں۔

۵۔ حضرت اسمٰعیل نے فرزندی کے جن قاعدوں اور طور طریقوں کا بے مثال

عملی نمونہ پیش کیا، وہ انہیں کس نے سکھائے تھے؟ ان کی تعلیم انہیں کہاں ملی تھی؟ کیا یہ سب کچھ کسی درس گاہ میں سکھایا گیا تھا؟ حاشا وکلا یہ تو ان کے والد ماجد حضرت ابراہیمؑ کی پاک نظر کا فیض تھا۔

اس شعر میں حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعۂ قربانی کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ؟ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝ (سورۂ صٰفٰت)

پھر جب حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے ہمراہ دوڑنے کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا، بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔ پھر تو بتا کہ تیری کیا رائے ہے؟ حضرت اسمٰعیلؑ نے کہا، ابا جان! وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم دیا جائے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابروں میں پائیں گے۔

گویا والد ماجد کی زبان مبارک سے قربانی کا اشارہ پاتے ہی بے تامل کہا کہ بارگاہ خداوندی سے آپ کے لئے جو حکم صادر ہوا ہے، اسے پورا کیجئے۔ فرزندی کے آداب کی اس سے بہتر مثال تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔ یہ تربیت درسگاہ کی نہ تھی۔ اور اقبال مسلمانوں کے نونہالوں کو اسی تربیت کا پیکر بنانا چاہتے ہیں۔

۶۔ میری قبر تمت اور عزم والے لوگوں کے لئے زیارت گاہ بن گئی ہے۔ وہ گروہ در گروہ چلے آرہے ہیں اور کیوں نہ آئیں؟ میں نے راستے کی گرد کو، جوہر طرف آوارہ

پھر ری تھی، پہاڑ کی طرح جمنے اور بے پناہ ہو جانے کے بھید بتا دیئے یعنی میں اس وجہ سے عالی ہمت انسانوں کے نزدیک احترام کا مرکز بنا کہ میری تعلیم نے ملت اسلامیہ کو اعلیٰ درجہ کے استحکام کا طریقہ بتا دیا۔

۷۔ ذاتی جوہروں کے حسن کو کسی بناؤ سنگار کی کیا ضرورت ہے؟ قدرت لالے کے پھولوں کو خود ہی مہندی لگاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اچھی اور دل نشین باتوں کے لئے آرائشگی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو خود بخود دلوں میں اتر جاتی ہیں۔

رباعی

اس رباعی میں بھی عشق کی مختلف حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ فرماتے ہیں عشق کبھی تو پہاڑوں کی تنہائی پسند کرتا ہے، جہاں کسی سے واسطہ نہ پڑے۔ کبھی وہ محفل اور اس کے سوز و سرور کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

کبھی محراب اور منبر کو زینت بخشتا ہے یعنی امام اور خطیب بن جاتا ہے۔ کبھی حضرت علیؓ کی طرح خیبر کا قلعہ توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ عشق کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کا نقشہ ہے اور ان تمام حالتوں کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔

(۱۱)

۱۔ اے میرے محبوب! کیا تجھے وہ زمانہ یاد نہیں، جب پہلے پہل میرا دل تیرے عشق میں مبتلا ہوا تھا؟ مجھے عشق کے سبق مل رہے تھے اور سبق یاد نہ ہونے پر تیری

نگاہ کے تازیانے مجھ پر پڑنے لگے۔

۲۔ موجودہ زمانہ کے جو بت درس گاہوں میں تیار ہوتے ہیں، وہ کس کام کے ہیں؟ نہ ان میں کافرانہ ادائیں موجود ہیں اور نہ ان کی تراش خراش میں آزر کی ہنرمندی کا کوئی کرشمہ نظر آتا ہے، یعنی نہ ان کا ظاہر آراستہ ہے نہ باطن۔

اس شعر میں موجودہ زمانے کے نظام تعلیم و تربیت کی بے مائگی واضح کی گئی ہے۔

۳۔ دنیا کی فضا اگرچہ بہت کشادہ ہے، لیکن اس میں ایسا کوئی گوشہ نظر نہیں آتا جہاں آرام اور بے فکری سے رہا جا سکے۔ یہ عجیب دنیا ہے۔ نہ یہ قفس بن سکتی ہے، نہ آشیاں۔ آرام اور بے فکری کی یہی دو صورتیں ہیں کہ یا تو کسی کی قید میں رہے، گھونسلا بنا کر آزادانہ زندگی بسر کرے۔

۴۔ اے ساقی! انگور کی بیل اس انتظار میں ہے کہ اس پر تیرے لطف و کرم کی بارش ہو، جس کی برکت سے اس میں تازگی آئے، انگور لگیں اور ان سے خالص شراب تیار ہو۔ یہ اس لئے کہ عجم کے شراب خانوں میں پہلی شراب باقی نہ رہی اور نئی شراب کی ضرورت پیش آگئی۔

۵۔ میں نے عشق و محبت کے نغمے الاپے تو میرے ہم نواؤں نے سمجھ لیا کہ یہ سب بہار کی آمد کے کرشمے ہیں، اس لئے کہ بہار آنے پر پرندے جوشِ مستی سے بے تکلف گانے لگتے ہیں۔ آہ، انہیں کیا معلوم کہ عشق و محبت کے نغمے الاپنا کس درجہ مشکل ہے اور ان میں دل و جگر کا خون کس طرح بے دریغ صرف کرنا پڑتا ہے۔

۶۔ اے خدا! اس دنیا میں زندگی کی رونق اور چہل پہل انہیں جانبازوں کے دم سے ہے جو تیری راہ میں شہید ہوئے۔ گویا یہ دنیا انہیں کی خاک اور خون سے

نثار ہوئی ہے۔ ان شہیدوں کا انعام کیا ہے؟ محض یہ کہ انہیں ہمیشہ کے لئے تڑپ اور بے قراری عطا ہو جائے۔ یعنی وہ اس دنیا میں کسی انعام کے خواہش مند نہیں، صرف یہ چاہتے ہیں کہ جن مقاصد کی خاطر انہوں نے جانیں دیں، انہیں پورا کرنے کے لئے ہنگامہ جہاد گرم رہے۔

۷۔ اے رحیم و کریم خدا! تیرے لطف و کرم کی بدولت میری زندگی کے دن گزر رہے ہیں نہ مجھے دوستوں سے گلے کی ضرورت پڑی، نہ زمانے کی شکایت میری زبان پر آئی۔ تیرے لطف و کرم نے مجھے ہر طرف سے بے نیاز کر دیا۔

رباعی

لایحزنون: اشارہ ہے اس آیت کی طرف: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (یاد رکھو، جو اللہ کے دوست ہیں، ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔)

اے خدا! مجھے ان بزرگوں کا سا عشق عطا کر جو پہلے زمانے میں گزر چکے ہیں اور مجھے اس پاک گروہ میں شامل کر دے، جسے تو نے خوف اور غمگینی سے محفوظ رہنے کی خوش خبر سنا رکھی ہے۔

میں عقل کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں فلسفہ اور حکمت کا کوئی بھی مشکل مسئلہ ایسا نہیں، جسے میں نے حل نہ کر لیا ہو۔ اب میری آرزو ہے کہ مجھے عشق کی دیوانگی کا منصب عطا ہو۔

(۱۲)

ہنگامۂ نشور: قیامت کا ہنگامہ۔

۱۔ گل لالہ کا ضمیر رنگین شراب سے لبالب بھر گیا۔ صوفی نے یہ کیفیت دیکھی تو شراب سے پرہیز کا قصہ ختم کر دیا اور پینے کے لئے تیار ہو گیا۔

۲۔ عشق نے جہاں بھی اپنی بساط بچھا دی فقیر اور درویشوں کو پرویز جیسے شہنشاہوں کی سلطنت کا وارث بنا دیا۔

یہ خالی دعویٰ نہیں، تاریخ انسانیت کا ہر صفحہ اس کا گواہ ہے۔ عشق سے مراد عشق حق بھی ہے اور عشق مقاصد بھی یعنی جہاں عشق حق ہوگا، وہاں درویشوں کو لازماً حکمرانی اور فرماں روائی کا درجہ حاصل ہو جائے گا لیکن عشق ایسی چیز ہے کہ اگر کوئی درویش محض سلطنت کا مقصد لے کر کھڑا ہو جائے اور اس کے لئے جانبازانہ جد و جہد میں لگا رہے تو عشق کا خاصہ ہے وہ بھی اپنے مقصد سے محروم نہ رہے گا۔ تاریخ میں ایسی بھی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

۳۔ اس دنیا کے ستارے بہت پرانے ہو گئے۔ آسمان بھی خاصا بوسیدہ ہو چکا ہے مجھے ایسی دقیانوسی دنیا کب پسند آ سکتی ہے؟ میں تو اس دنیا کا مشتاق ہوں جو ابھی پیدا ہوئی ہو اور اس میں جدت و تازگی کے آثار نظر آئیں۔

۴۔ کسی کو معلوم نہیں کہ قیامت کا ہنگامہ کیا چیز ہے؟ اس لئے کہ کسی نے یہ ہنگامہ دیکھا نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اے محبوب! تیری نگاہ لطف کا مجھ سے پھر جانا ہی میرے لئے قیامت ہے۔

۵۔ صبح کے وقت کی آہ و فریاد میں جو لذت ملتی ہے، اے محبوب! مجھے

اس سے محروم نہ کر میری آہ و فریاد تیرے تغافل اور بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ مجھے یہی پسند ہے، تو اس تغافل میں لطف و کرم کی آمیزش نہ کر۔

۶۔ بہار کا موسم میرے غمگین دل کو راس نہیں۔ اس میں باغ کے پرندے جو نغمے گاتے ہیں، وہ خوشی اور نشاط سے لبریز ہوتے ہیں اور غمگین دل ایسی فضا میں خوش نہیں ہو سکتا۔

۷۔ بے خبروں اور حقیقت ناشناسوں کا قول ہے کہ تو اپنے آپ کو زمانہ کے موافق بنالے جو لوگ زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ ہیں، ان کا اصول یہ ہے کہ زمانہ اگر تجھ سے موافقت نہ کرے تو اس کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو جا۔

مطلب یہ ہے کہ عالی ہمت جوانمرد زمانے کو زبردستی اپنے پیچھے چلاتے ہیں۔ جو لوگ ہمت سے خالی ہوتے، وہ زمانے کے پیچھے چلتے ہیں۔

رباعی

میں نے حضرت ابوالحسنؒ سے یہ نکتہ سیکھا کہ جسم کے مرجانے سے جان پر موت وارد نہیں ہوتی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ سورج اپنی کرنوں سے بیزار ہو جائے تو اس میں چمک کہاں باقی رہے گی؟ قرآن کریم میں روح کو خدا کا امر قرار دیا گیا ہے: قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي۔ خدا نور ہے، روح اس نور کی ایک کرن یا اس کا ایک پرتو ہے۔ جسم بے شک مر سکتا ہے۔ روح اس لئے نہیں مر سکتی کہ جس نور کا پرتو ہے، وہ ہمیشہ باقی اور قائم رہے گا۔

ابوالحسن سے مراد غالباً ابوالحسن خرقانیؒ ہیں۔

(۱۳)

۱۔ میں نے شعر گوئی میں جو کمال حاصل کیا، وہ میرے کسی کام نہ آیا، اس لئے کہ اے محبوب حقیقی! میں جیسا پہلے کم نصیب تھا، ایسا ہی اب ہوں اور تیری بے نیازی کی جو شان پہلے تھی، وہی اس وقت ہے۔

۲۔ مجھ پر اب تک یہ بھید نہ کھلا کہ میں کہاں ہوں اور تو کہاں ہے؟ جس دنیا میں میرا بسیرا ہے، اسے مکان سمجھنا چاہیئے کہ لامکاں؟ اس دنیا کا وجود میرے حواس کا نتیجہ ہے یا اسے تیری کرشمہ سازی سمجھا جائے؟

۳۔ میری زندگی کی راتیں کشمکش ہی میں گزر گئیں، کبھی دل مولانا مرحوم کے سوز وساز کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا اور کبھی امام رازی کی فلسفیانہ موشگافیوں کی طرف

۴۔ جو فریب کھایا ہوا شہباز گدھوں میں پل کر جوان ہوا ہو، وہ شہبازی کے طور طریقوں سے کیا آگاہ ہو سکتا ہے۔

یہ مسلمان قوم خصوصاً اس کے نونہالوں کا نقشہ ہے کہ جس فضا میں ان کی تربیت ہوئی ہے، وہ شہبازوں کی نہیں گدھوں کی فضا ہے، پھر ان سے شہبازی کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے؟

۵۔ محبوب کی ادائیں بیان کرنے کے لئے زبان کی کوئی قید نہیں اور میں زبان سے واقف بھی نہیں۔ مجھے تو وہ نغمہ چاہیئے جس سے دل کا کنول کھلے، خواہ وہ نغمہ فارسی زبان کا ہو یا عربی زبان کا۔

۶۔ فقیری اور بادشاہی میں کوئی لمبا چوڑا فرق نہیں۔ بادشاہی لشکروں کی

تیغ زنی کا نتیجہ ہوتی ہے اور فقیروں کی نظر تلوار چلاتی ہے یعنی بادشاہ سیاہ کی بدولت لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں، فقیر اور درویش اپنے فیض نظر کی برکت سے دلوں میں حکومت کے تخت بچھاتے ہیں۔

۷۔ مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟ کوئی جماعت سے تعلق توڑے بیٹھا ہے، کسی کے دل میں حرم یعنی مرکز اسلام سے بدگمانی پیدا ہوگئی ہے کبھی سوچا کہ اس پریشاں حالی کا سبب کیا ہے؟ یہ کہ جس شخص کے ہاتھ میں قوم کی باگ ہے اور جو قافلہ کا سالار ہے، اس میں دلوں کو موہ لینے کی خصلت موجود نہیں

رباعی

عقل کو اچھائی برائی سے کوئی واقفیت نہیں، وہ ظالم اپنی حد سے آگے بڑھی جارہی ہے۔ خدا جانے مجھے کیا ہوگیا! میری عقل دل سے بیزار ہے اور دل عقل سے۔

(۱۴)

ردائے نیلگوں: نیلی چادر۔

۱۔ میں سمجھتا تھا کہ میری تگ و دو کا اصل میدان اس آسمان کے نیچے ہے۔ پانی اور مٹی کے کھیل کو میں اپنی دنیا سمجھتا تھا۔

۲۔ جب تو نے بے حجاب ہو کر جلوہ دکھایا تو میری نگاہیں جس باطل طلسم میں الجھی ہوئی تھیں، وہ ٹوٹ گیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ میں جو کچھ سمجھ رہا تھا، وہ غلط تھا۔ میں اس نیلی چادر کو آسمان سمجھتا تھا، حالانکہ یہ میری نظر کا دھوکا تھا۔

۳۔ میں سورج چاند اور مشتری ستارے کو اپنا ہم سفر سمجھ رہا تھا اور یہی قافلہ ساتھ لیئے بروج کی منزلیں طے کرتا جاتا تھا، لیکن میرے یہ تمام ساتھی اور تمام ہم سفر تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گئے اور میں آگے بڑھتا گیا۔

۴۔ عشق نے مجھے پرِ پرواز دیئے اور ایک ہی جست میں تمام منزلیں طے کر گیا۔ میں پہلے بے خبری کے باعث زمین اور آسمان کو لا انتہا اور بے کنارہ سمجھ رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بے کنارہ نہیں۔ ان سے آگے بھی جا سکتے ہیں۔

۵۔ مجھے پسند نہ تھا کہ میرے عشق کا راز فاش ہو، لہٰذا اسے ہر ممکن کوشش سے چھپانے میں لگا ہوا تھا اور اس پر پردے بھی ڈال رہا تھا حتیٰ کہ آہ و فریاد بھی نہ کرتا تھا، مبادا میرا عشق ظاہر ہو جائے، لیکن انہیں پردہ داری کی کوشش نے میری محبت کے بھید طشت از بام کر دیئے گویا میں جس شے کو ضبطِ فغاں سمجھتا تھا تاکہ محبت چھپی رہے، وہی میری فغاں بن گئی۔

۶۔ میں جس آواز کو قافلہ کے کوچ کا اعلان سمجھتا تھا، وہ دراصل کسی ایسے مسافر کی دردبھری صدا تھی جو تھک کر قافلے سے بچھڑ گیا تھا۔

رباعی

اے خدا! خدائی میں خشک و تر کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو اچھا خاصا دردِ سر ہے۔

لیکن بندگی، پناہ بخدا! سر کا درد نہیں، جگر کا درد ہے، جو دردِ سر سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ اور مصیبت خیز ہے۔

(۱۵)

دانشِ نورانی: اس سے وہ عقل مراد ہے جو انسان کے دل و دماغ کو منوّر کر دے اور اسے حقیقتوں کے پہچاننے کے قابل بنا دے۔ یہ عقل نورِ ایمان اور نورِ یقین کے مترادف ہے۔ دانشِ برہانی: وہ عقل جس میں فلسفیانہ دلیلوں سے کام لیا جائے۔ یہ یقینی طور پر حقیقتوں تک نہیں پہنچاتی اور عموماً دلیلوں ہی کے اندھیرے میں ٹھوکر لگاتی رہتی ہے۔

۱۔ عقل کی دو قسمیں۔ ایک نورانی، دوسری برہانی۔ ایک کی روشنی میں انسان حقیقتوں تک پہنچ جاتا ہے، دوسری اسے دلیلوں ہی میں سرگرداں رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برہانی عقل حیرانی کو بڑھانے اور ترقی دینے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

۲۔ اے خدا! مٹی کے اس جسم میں جو بالکل بے حقیقت ہے، ایک ایسی چیز ہے، جو تیری نذر کے لائق ہے، لہٰذا میں اسی کو تیری نگہبانی میں دیتا ہوں اور وہ دل ہے۔ میں اس چیز کی نگہبانی نہیں کر سکتا، تو ہی اپنی رحمت سے نگہبانی فرما۔

مراد یہ ہے کہ انسان کے جسم میں دل ہی ایک چیز ہے جس کی اصلاح و درستی پر انسان کی پوری اصلاح و درستی موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس کی ہدایت کا انتظام ہو جائے تو انسان کبھی گمراہ نہ ہو سکے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: انسان کے جسم میں ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو جائے۔ اس میں خرابی آ جائے تو پورے جسم میں خرابی آ جائے۔ الا وھی القلب۔ یاد رکھو کہ وہ دل ہے۔ اقبال کا یہ شعر اسی حدیث سے

ماخوذ ہے۔

۳۔ میری آہ و فریاد اگر ستاروں تک جا پہنچی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں کیا کروں؟ تو نے ہی مجھے غزلوں کے ذریعہ سے آہ و فریاد کے طور طریقے سکھائے تھے تجھی سے مجھے یہ جوہر عطا ہوا تھا۔

۴۔ یہ کیا کہ آدمی روز پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ ان کے نقش بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نقش باطل تھا تو اسے بار بار بنانے سے کیا فائدہ؟ اگر یہ باطل نہ تھا تو ٹوٹتا کیوں ہے؟ اے خدا! کیا تجھے بنی آدم کی ارزانی اور بے قدری پسند ہے کہ وہ لگاتار پیدا ہوتے اور مرتے رہیں؟

۵۔ مان لیجئے کہ مجھے اہل یورپ نے مذہب سے برگشتہ کر دیا اور میرے ایمان و یقین کی بنیادیں ہل گئیں، لیکن اس دور کے ملّا تو یورپ نہیں گئے ان پر تو یورپی علوم و فنون کا پرتو نہیں پڑا، پھر وہ کیوں اسلام کے لئے باعث ننگ بن گئے۔

۶۔ جس وجود کے متعلق بے سمجھ اور نافہم لوگ کہتے ہیں کہ وہ تقدیر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اس میں ابھی اتنی قوّت باقی ہے کہ ان زنجیروں کو توڑ کر رکھ دے۔

تقدیر کے لفظی معنی ہیں اندازہ کرنا۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کا ایک اندازہ مقرّر کر رکھا ہے لیکن اس کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا۔ انسانوں نے اپنی کم ہمتی اور بے عملی کی بنا پر پیش آنے والی مصیبتوں کو تقدیر قرار دے رکھا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر دو آدمی اکٹھے سفر پر روانہ ہوں اور انہیں دس میل مسافت طے کرنی ہو، تو جو شخص تیزی سے چلتا جائے گا، وہ یقیناً جلد سے

جلد منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ جو شخص قدم قدم پر ٹھہرے گا یا انتظار کرے گا کہ سواری ملے تو آرام سے پہنچ جاؤں، وہ راستہ ہی میں رہ جائے گا۔ یہاں تقدیر کا کوئی سوال نہیں، صرف ہمت اور قوت عمل کا سوال ہے۔ ہمت اور قوت عمل ہی کی بنا پر انسانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ جب تقدیر کا یقینی علم کسی کو نہیں ہو سکتا تو قوتِ عمل کی حد کیوں مقرر کی جائے؟

مثال کے طور پر صفویوں کے آخری دور میں ایران کی قوت افغانوں کے مقابلہ میں عاجز رہ گئی تھی، لیکن نادر شاہ افشار نے ایرانیوں کی قیادت سنبھالی تو اسی قوت سے کام لے کر افغانوں اور ترکوں دونوں کی یورشوں ناکام بنا دیا۔ یہ ہمت اور جوانمردی کی برکت تھی۔ اسی طرح انسان بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں ہمت و جوانمردی ہو اور وہ اپنے مقاصد کی خاطر جان دینے کے لئے تیار رہے۔

اسلام انسان کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس کی بے پناہ قوتِ عمل خدا کی رضا کے مطابق صرف ہونی چاہیئے۔ وہ جو کچھ کرے، خدائی احکام کے مطابق کرے۔ اس طرح وہ خود اللہ کی تقدیر بن جائے گا۔

۷۔ اے مخاطب! تو بھی مٹ جانے کے لئے بیٹھا ہے، میں بھی مٹ جانے کے لئے بیٹھا ہوں۔ دونوں کے مٹ جانے میں کہیں اول کے فنا ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں۔

رباعی

اے خدا! میں انسان کی بے بصیرتی کا ماجرا کیا سناؤں، کیا یہ وہ انسان

ہے، جیسے تو نے خشکی اور تری کا بادشاہ بنایا تھا اور اشرف المخلوقات قرار دیا تھا؟ یہ تو نہ اپنی حقیقت کو پہچانتا ہے، نہ اسے تیری معرفت حاصل ہے، نہ یہ کائنات کے بھیدوں سے آگاہ ہے پھر یہ کس کام کا ہے؟ کیا اسے تیرے کمالِ تخلیق کا شاہکار سمجھ لیا جائے؟

واضح رہے کہ یہ رباعی یا اس قسم کے دوسرے اشعار میں مقصود خدا کی قوتِ تخلیق پر طنز نہیں۔ حاشا وکلا، یہ صحیح تعلیم دینے کا وہ پرتاثیر طریقہ ہے، جسے شاعرانہ طریقہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی انسان میں کوئی تو جوہر ہونا چاہیے۔ وہ خدا کو نہیں پہچانتا تو اپنے آپ کو پہچانے، یہ بھی نہیں ہو سکتا تو کائنات کی حقیقتوں سے آگاہ ہو۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی بھی کام وہ نہیں کر سکتا تو یقیناً وہ اشرف المخلوقات نہیں بلکہ ارذلِ مخلوقات ہے۔ سورۃ والتین میں قرآن مجید نے یہی حقیقت بیان کی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

ہم نے انسان کو بہترین انداز پر پیدا کیا پھر اسے پست سے پست حالت پر لوٹا دیا سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔

اس ارشاد کا مقصود بھی یہی ہے کہ انسان بے شک اشرف المخلوقات ہے لیکن اگر وہ ایمان اور عمل سے محروم ہو جائے تو پستی کی آخری منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ غرض اقبال کے اشعار کی حیثیت یہ نہ ہونا چاہیے اصل مقصود کو دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے شاعری کے نقطۂ نگاہ سے وہ اسلوبِ بیان اختیار کیا،

جس میں اصل دعوت سے زیادہ دل نشیں ہو سکتی تھی۔

(۱۶)

موعظہ: وعظ، نصیحت۔ پاژند: ژند کی تفسیر، پارسیوں کے عقیدے کے مطابق ژند وہ کتاب تھی جو ان کے پیغمبر و رہبر زرتشت پر اتری۔ قریہ: گاؤں، بستی۔ دماوند: ایران کا ایک مشہور پہاڑ۔ اسپند: حرمل، وہ کالا دانہ جو نظر بد کا اثر دور کرنے کے لئے جلایا جاتا ہے اور آگ پر پڑتے ہی تڑخ کر پھٹ جاتا ہے۔ شاعر تڑخ کی آواز کو اسپند کا نالہ یا فریاد کہتے ہیں۔ مثلاً خود اقبال نے کہا ہے:

فریاد در گرہ صفت دانہ سپند

شکر خند: خوشی کی ہنسی، تبسم، مسکراہٹ۔

۱۔ اے خدا! یہ فانی دنیا ہے تو تیری، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اس میں صاف دل، حق گو، ایمان دار اور باکمال انسان کیوں ذلیل و خوار ہیں؟

۲۔ ہندوستان پر فرنگیوں کی حکومت ہے۔ لوگ انہی کو اپنا آقا اور مولا سمجھتے ہیں، اگرچہ فرنگی کی حکومت میں مہاجن اور سرمایہ دار کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔

۳۔ تو عقل مند اور باکمال لوگوں کو گھاس کی ایک پتی بھی عطا نہیں فرماتا۔ فرنگی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ چند گدھوں کو گلاب اور پھول کے باغ بخش دیتا ہے، یعنی نالائقوں کو بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کر دیتا ہے۔

۴۔ گرجوں کی یہ حالت ہے کہ وہاں کباب بھی ملتے ہیں اور پھول جیسی سرخ شراب بھی۔ اس کے برعکس مسجد میں وعظ و نصیحت کے سوا کیا دھرا ہے؟

۵۔ بے شک تیرے حکم بالکل سچے ہیں۔ تو نے اپنی پاک کتاب میں جو کچھ فرمایا، وہ ہر لحاظ سے برحق ہے، لیکن ہمارے ان عالموں نے جو قرآن پاک کی تفسیر کرتے ہیں، اس کی آیتوں کو تاویلوں اور پیچیدگیوں سے پاژند بنا کر رکھ دیا ہے، یعنی خدائی احکام کی حیثیت ہی بدل کر کچھ سے کچھ بنا دی ہے۔

۶۔ تو نے نیک عمل والوں کو بہشت عطا کرنے جو وعدہ فرمایا ہے، اس میں بھی کلام نہیں، لیکن بہشت کو دیکھا کس نے ہے؟ وہ تو ابھی پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہے۔ یورپ کو جا کر دیکھیں تو اس کی ہر بستی بہشت کا نمونہ بنی ہوئی نظر آئے گی یہی وجہ ہے کہ ظاہر بیں یورپ کی بہشت کے شیدائی بن رہے ہیں۔

۷۔ میرے بلند خیالات مدّت سے آسمانوں کی وسعت میں آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں کسی نے انہیں اب تک قبول نہ کیا اور ان سے انسانوں کی زندگی میں کوئی خوش آئند تغیر پیدا نہ ہوا۔ بہتر یہ ہے کہ اب تو ان خیالات کو چاند کے غاروں میں نظر بند کر دے۔

۸۔ قدرت نے مجھے فرشتوں کے سے جوہر عطا کئے ہیں۔ میں اگرچہ خاکی ہوں اور عام انسانوں کی طرح خاک ہی سے پیدا ہوا لیکن مجھے اس خاکی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔

۹۔ میں وہ درویش ہوں، جو تیرے عشق کی شراب کے نشہ میں چور ہے۔ مجھے نہ مشرق سے تعلق ہے، نہ مغرب سے، نہ دلی کو اپنا وطن سمجھتا ہوں، نہ اصفہان کو اور نہ سمرقند کو، یعنی تیرے عشق کی مستی نے مجھے اس دنیا کے ہر تعلق سے بے نیاز کر دیا ہے۔

۱۰۔ میں وہی بات زبان پر لاتا ہوں جو میرے نزدیک سچی ہو، نہ میں مسجد کا ملّا ہوں جسے آج کل کے لوگ نادان اور احمق سمجھتے ہیں، نہ میں نے موجودہ زمانہ کی تہذیب کا کوئی اثر قبول کیا ہے یعنی نہ میرے خیالات دقیانوسی ہیں اور نہ نئی روشنی کا علم بردار ہوں۔

۱۱۔ مجھ سے اپنے بھی ناراض اور بیگانے بھی یعنی مسلمان بھی مجھ سے بگڑے بیٹھے ہیں اور غیر مسلم بھی اس لئے کہ موجودہ زمانے میں وہی شخص سب کو راضی کر سکتا ہے، جو جھوٹ بولے اور ریاکاری سے کام لے۔ میری کیفیت یہ ہے کہ میں ہلاک کر دینے والے زہر کو زہر ہی کہوں گا، شکر کبھی قرار نہ دوں گا۔ غرض نہ میں جھوٹ بول سکتا ہوں اور نہ سخن سازی کر سکتا ہوں۔

۱۲۔ ظاہر کہ جس شخص کی نظر ہر وقت سچّائی پہ رہے، وہ سچّائی ہی کو دیکھے، سچّائی ہی کو سوچے۔ وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو دماوند پہاڑ کیوں کر قرار دے سکتا ہے؟ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہوگا۔ میں ایسے جھوٹ کا روادار نہیں ہو سکتا۔

۱۳۔ میرے گرد و پیش وہی آگ جل رہی ہے جو نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے جلائی تھی، لیکن آگ کے شعلوں میں بھی صبر و ضبط کئے بیٹھا ہوں اور آہ تک میرے لب پر نہیں آتی۔ میں مومن ہوں، خدا پر میرا ایمان پختہ ہے۔ کیا میں حرمل کا کوئی دانہ ہوں کہ آگ میں پڑتے ہی تڑخوں اور پھٹ جاؤں؟

۱۴۔ میری حالت کا نقشہ کیا ہے؟ یہ کہ میرا دل سوز و گداز سے لبریز ہے، میری نگاہ ہمیشہ حقیقت پر رہتی ہے، میں صرف اچھائیاں ہی دیکھتا ہوں، عیب اور برائیاں تلاش نہیں کرتا۔ کسی کو دکھ نہیں دیتا، اپنی خودداری کے باعث ہر تعلق سے آزاد ہوں البتہ عشقِ حق کی زنجیر والا

میں جکڑا ہوا ہوں۔ جیب مال و زر سے خالی ہے لیکن خوش اور مطمئن بیٹھا ہوں۔

۱۵۔ میرا آزاد دل ہر حال میں خوش ہے۔ کیا کوئی شخص کلی سے مسکراہٹ کی لذت چھین سکتا ہے؟ کلی کا خاصہ ہی یہ ہے کہ کھلے اور مسکرائے، خواہ کوئی حالت پیش آ جائے۔

اقبال نے اپنی کیفیت بیان کرنے کے لئے ایسی نادر تمثال تلاش کی، جس کی نظیر مشکل سے ملے گی اور انداز بیان ایسا اختیار فرمایا جو کرامت سے کم نہیں

۱۶۔ اقبال خدا کے حضور میں بھی چپ نہ رہ سکا۔ کاش کوئی اس بے ادب بندے کا منہ بند کر دیتا۔

(۱)

جیسا کہ اقبال نے خود لکھا ہے، یہ اشعار حکیم سنائی غزنوی کے مزار مقدس کی زیارت کے بعد اس تقریب سعید کی یادگار میں لکھے گئے۔ اقبال ۱۹۳۳ء میں محمد نادر شاہ غازی فرماں روائے افغانستان کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے تھے۔ یہ دعوت اقبال کے علاوہ مسلمانوں کے دو اور ممتاز مفکروں اور ماہرین تعلیم کو دی گئی تھی، ایک مولانا سید سلیمان ندوی، اور دوسرے سر راس مسعود مرحوم مقصود یہ تھا کہ حکومت افغانستان کا محکمہ تعلیم نصاب کتب کی ترتیب کے سلسلہ میں ان کے مشوروں سے مستفید ہو سکے۔ اقبال پشاور، درہ خیبر جلال آباد کے راستہ کابل گئے تھے۔ غزنی، قلات اور قندھار کے راستے واپس آئے۔ اسی سفر کی یادگار میں انھوں نے اپنی مشہور مثنوی مسافر لکھی تھی، جو الگ بھی چھاپی گئی تھی۔ بعد میں پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے ساتھ

شامل کر دی گئی۔

اقبالؔ نے فرمایا کہ یہ اشعار حکیم سنائی ہی کے ایک مشہور قصیدہ کی پیروی میں کہے گئے۔ اس قصیدہ کے بعض منتخب اشعار بدیں غرض یہاں نقل کئے جاتے ہیں کہ اندازہ ہو جائے، قصیدہ کس درجہ بلند ہے اور اقبالؔ نے کیوں اس سے اتنا اثر قبول کیا کہ اس کی پیروی میں ایسے حقائق آموز شعر لکھے۔ حکیم سنائی فرماتے ہیں:

بہر چہ از راہ دور افتی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں
بہر چہ از دوست وامانی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

سخن کز روئے دیں گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

ز راہ جاں تواں آمد بہ صحرائے خرد ورنہ
بہ معنیٰ کے رسد مردم گزر ناکردہ از اسما

عجب نبود گر از قرآں نصیبت نیست جز نقشے
کہ از خورشید جز گرمی نہ بیند چشم نابینا

گر امروز آتش شہوت بکشتی بے گماں رستی
وگرنہ تفّ ایں آتش ترا ہیزم کند فردا

آخر میں دعا کے طور پر چند شعر لکھے ہیں:

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا، نہ در جنّت
ہمی گویم بہ ہر ساعت چہ در سرّا چہ در ضرّا

کہ یارب مر سنائی را سنائی دہ تو در حکمت
چناں کزوے بہ رشک آید روان بوعلی سینا

اقبال نے اپنے اشعار کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ تمہیدی ہے۔ دوسرے حصہ میں مشرق و مغرب کی کیفیت بیان کی ہے۔ تیسرے حصہ میں غلامی اور آزادی کی حقیقت واضح فرمائی ہے۔ چوتھے حصہ میں مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں کے مقابلہ کے لئے قرآنی تعلیم کو سب سے بڑا حربہ قرار دیا ہے اور آخر کے چند شعر نعتیہ ہیں کہے ہیں۔

نظم کے آغاز میں مولانا رومؒ کے مشہور شعر کا صرف ایک مصرع اس غرض سے نقل کیا ہے کہ حکیم سنائی سے استفادہ کے اعتراف کا تقاضا یہی تھا۔ پورا شعر یوں ہے:

عطارؒ روح بود و سنائیؒ دو چشم ما — ما از پس سنائی و عطارؒ آمدیم

یعنی حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ ہمارے لئے روح ہیں جس کی وجہ سے ہمیں حقیقت بینی اور حقیقت گوئی کی زندگی نصیب ہوئی۔ حکیم سنائی ہماری آنکھیں ہیں جن کی برکت سے دیکھنے کی سعادت ہمارے حصہ میں آئی۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے چلنے والے یعنی انہیں کے پیرو ہیں۔ جن بزرگ ہستیوں کے متعلق مولانا رومؒ کا یہ عقیدہ تھا ان کی عظمت کے لئے اور کسی شہادت کی کیا ضرورت ہے؟

حکیم سنائی کا نام مجدود، کنیت ابوالمجد اور تخلص سنائی تھا۔ ۵۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ سلاطین غزنویہ کے دربار میں قصیدہ گوئی کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ بہرام شاہ غزنوی ہندوستان کی مہم پر آ رہا تھا۔ حکیم سنائی اس تقریب سے قصیدہ تیار کر کے دربار جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک مجذوب ملا جسے لائے خوار کہتے تھے۔ وہ شراب خانوں سے تلچھٹ مانگ کر پیا کرتا تھا۔ سنائی کو دیکھ کر شراب فروش سے کہنے لگا: ایک پیالہ سنائی کے اندھے پن کے صدقہ میں بھی دینا۔

شراب فروش کو اس پر تعجب ہوا۔ لائے خوار نے کہا: اس سے بڑھ کر اندھا پن کیا ہوگا کہ دو چار جھوٹ سچ باتیں جوڑ کر کسی بے وقوف رئیس کو سنا دیتا ہے یہی اس کا ذریعہ معاش ہے۔ قیامت میں اگر سوال ہوگا کہ کیا لائے تو کیا جواب دے گا؟ بس اسی بات نے حکیم سنائی کی کایا پلٹ دی۔ پابرہنہ حج کیا۔ واپس آکر گوشہ نشین ہو گئے۔ کبھی باہر نکلتے تو ننگے پاؤں پھرتے۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ۵۷۶ھ میں انتقال ہوا۔ 'حدیقہ' ان کی نہایت مشہور کتاب ہے

خواجہ فریدالدین عطار ۵۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۲۷ھ میں وفات پائی۔ تصوف کی دنیا میں مشہور ہیں۔ 'منطق الطیر' اور متعدد مثنویاں ان سے منسوب ہیں۔ نثر میں ان کا 'تذکرۃ الاولیا' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

پہلا حصہ حلاج: بلفظی معنی دُھنیا۔ جو شخصیت عام طور پر منصور کے نام معروف ہے اس کا نام حسین بن منصور تھا چونکہ اس کے والد کا پیشہ روئی دھنکنا تھا، اس وجہ سے وہ حلاج مشہور ہوا۔ منصور کو بھی اسی نسبت سے حلاج کہتے ہیں۔ یہاں منصور مراد ہے۔ استغنا: بے پروائی، بے نیازی، سیر چشمی۔

(۱) میرے قلب و روح میں جو سودا بھرا ہوا ہے، وہ کائنات کی وسعت میں نہیں سما سکتا۔ اے جنون! تو مجھے اس خیال سے یہاں لایا تھا کہ یہ وسیع بیابان ہنگامہ آرائی کے لئے کافی ہوگا، لیکن تیرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

سودا سے مراد یہاں عشق ہے۔ اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عشق میں مجذوبی اور بے خودی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کے لئے کائنات کی وسعت

کوئی معنی نہیں رکھتی۔

(۲) رنگ و بو کا یہ طلسم جسے عرفِ عام میں دنیا کہتے ہیں، خودی کی قوت سے توڑا جا سکتا ہے، اسی کا دوسرا نام توحید ہے، لیکن اے مخاطب! اس حقیقت کو نہ تو سمجھا، نہ میں سمجھا۔

مراد یہ ہے کہ ہم میں اور ذاتِ باری میں جو پردہ حائل ہے وہ یہی دنیا ہے، جسے رنگ و بو کا کرشمہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ٹوٹ جائے اور پردہ اٹھ جائے تو پھر ذاتِ باری ہی باقی رہ جائے، یہ کام خودی انجام دے سکتی ہے اور یہی مقصد توحید ہے۔

(۳) اے غافل! تو دیکھنے والی نظر پیدا کر۔ نورِ مطلق کا تو خاصّہ ہی یہ ہے کہ چمکتا رہے جس طرح دریا کا خاصّہ ہے کہ لہریں لیتا رہے۔ اگر دریا میں لہریں نہ رہیں تو اس کا وجود ختم ہو جائے۔ اسی طرح تجلّی نورِ مطلق کا خاصّہ ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ تیرے پاس دیکھنے والی نظر نہیں۔

(۴) علم اور معرفت ایک دوسرے کے حریف نہیں۔ افسوس کہ ظاہر بیں اور حق ناشناس عالموں کی غلط فہمی کے باعث انہیں ایک دوسرے کا حریف بنا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے منصور کی سولی کو اپنا مدِ مقابل سمجھ لیا۔

یہاں علم سے مراد علمِ شریعت ہے اور معرفت سے مراد حقائق شناسی کا وہ مقام ہے جو شریعت پر صحیح اور پُرخلوص کاربندی کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ ان میں یقیناً کوئی دشمنی نہیں، بلکہ یہ علم و ایمان کے مختلف درجے ہیں۔ ایک درجہ عام اور دوسرا درجہ خاص۔ عام تصوّر کے مطابق منصور معرفت کے مقام پر پہنچا ہوا تھا۔ علمائے ظاہر نے اس حقیقت کو نہ سمجھنے کے باعث اپنا حریف

خیال کر لیا اور سولی پر چڑھا دیا۔

(۵) حکمرانی کی حالت ہو یا محکومی کی، جو زرہ خدا کے پاک بندوں کو دنیا پروری کے تیروں اور تلواروں سے بچائے رکھتی ہے، وہ بے نیازی، خودداری اور سیر چشمی کے سوا کچھ نہیں۔

مراد یہ ہے کہ حکمرانی اور محکومی دونوں میں قدم قدم پر نفس کے لئے آزمائشیں موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑی آزمائش مال و دولت سمیٹنے کی ہے۔ حکمرانی کی حالت میں مال و دولت کی حرص دوسروں کے حقوق چھین کر پوری کی جاتی ہے۔ محکومی کی حالت میں حاکموں کی خوشامد کرنے اور ان کا آلہ کار بن جانے سے اس حرص کی تسکین کا سامان پہنچایا جاتا ہے۔ خوددار اور دنیا کے مال سے بے نیاز انسان ایسے کسی فعل پر راضی نہیں ہو سکتے، لہذا ثابت ہوا کہ پاک بندوں کے بچاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ استغنا ہے۔

(۶) اے جبریل امیں! آپ میرے جذب و مستی کی پیروی نہ کریں۔ آپ لوگ عرشی ہیں، آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ ذکر، تسبیح اور عرش کے طواف میں لگے رہیں۔ جذب و مستی یعنی عشق کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ یہ مشقتیں ہم انسانوں ہی کے لئے چھوڑ دیں۔ آپ کی آرام طلبی ان مشقتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

دوسرا حصہ | اس حصہ میں اقبال نے مشرق و مغرب کی عام کیفیت بیان کی ہے۔

صہبا: شراب۔ گلیم: گدڑی۔ اویس رض: حضرت اویس قرنی رض۔ ابو ذر رض: مشہور صحابی حضرت ابو ذر غفاری رض، جو اسلامی فقر کا ایک عجیب و غریب نمونہ تھے۔ دلق: خرقہ۔ زہرا رض: حضرت فاطمہ رض کا ایک لقب۔

اسرافیل: ایک فرشتہ جو قیامت کے دن صور پھونکے گا۔ لا: عربی زبان کا حرفِ نفی جو کلمہ طیبہ کا پہلا حرف ہے۔ یہاں مراد ہے دہریت اور خدائی قانون کی نفی سے۔ اِلّا: عربی زبان کا حرفِ استثناء، مراد ہے اِلّا اللہ سے یعنی ہستی باری تعالیٰ اور اس کے مقررہ حکموں کا اقرار زبان پر عمل۔
تشنہ مستی: لفظی معنی ہاتھ تیزی سے چلانا، یعنی مشتاق و بے صبر مند ہونا۔
موجِ تند جولاں: زور شور سے اچھلنے والی لہر۔ نہنگ: مگرمچھ۔

(۱) میں مشرق و مغرب کے بہت سے شراب خانے دیکھ چکا ہوں۔ ان کی حالت کیا ہے؟ یہ کہ مشرق کے شراب خانوں میں شراب موجود ہے اور پلانے والا کوئی نہیں۔ مغرب کے شراب خانوں میں جو شراب بٹ رہی ہے، اس میں نہ کوئی لذت ہے، نہ کوئی مستی گویا دونوں جگہ کے شراب خانے عملاً بیکار ہو چکے ہیں۔

شراب خانوں سے مراد ہیں وہ علوم اور وہ اعمال جو انسانوں کو راہِ حق پہ چلاتے اور انہیں منزلِ مقصود پہ پہنچاتے ہیں۔ اقبال کا ارشاد ہے کہ مشرق والوں کے پاس الٰہی علوم کا بے بہا ذخیرہ موجود ہے لیکن اسے دنیا میں پھیلانے والا کوئی نہیں، لہٰذا عام لوگ کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مغرب والوں کے پاس جو علوم موجود ہیں، وہ راہِ حق کی طرف لے جا ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا وہ سراسر بیکار ہیں۔

اس کے بعد مشرق و مغرب کی کیفیت الگ الگ بیان کی ہے۔ پہلے مشرق کے متعلق فرماتے ہیں:

(۲) خدا کے وہ پاک بندے جن کے فقر نے روم و ایران کی شہنشاہیوں کا نقشِ باطل دنیا سے مٹا دیا تھا، وہ نہ اب ایران میں نظر آتے ہیں، نہ توران میں

یعنی مشرق کے تمام اسلامی ملک ان بندوں کے وجود سے خالی ہو گئے۔

(۳) عرب کی حالت کیا ہے؟ جسے کعبہ کا شیخ کہا جاتا ہے، کیا یہ وہی نہیں جس نے ابوذر غفاریؓ کے فقر کی گدڑی، حضرت اویس قرنیؓ کی درویشی کا خرقہ اور سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراؓ کی چادر مبارک چرا کر بیچی اور کھا گیا۔

مراد یہ ہے کہ کعبہ کا شیخ ہونے کے باوجود تمام اسلامی اوصاف و خصائص کھو کر صرف شکم پروری کو اپنا نصب العین بنا بیٹھا۔

حکیم سنائی نے بھی اپنے قصیدہ میں 'چادر زہرا' باندھا ہے:

نہ صوت از بہر آں آمد کہ سوزی مر بہر زہرہ

نہ حرف از بہر آں آمد کہ دزدی چادر زہراؓ

(۴) حضرت اسرافیل نے صاف گوئی میں میری بے باکی دیکھی تو بارگاہ باری تعالیٰ میں میرے متعلق شکایت کی، یہ بندہ تو ایسی باتیں کرتا ہے کہ شاید قیامت کے آنے سے پہلے ہی قیامت بپا ہو جائے۔

(۵) بارگاہ باری تعالیٰ سے ندا آئی، کیا یہ حقیقت قیامت کے ہنگامے سے کم ہے کہ چین کے رہنے والے ہزاروں میل کعبہ سے دور ہونے کے باوجود عمرہ و حج کے لئے احرام باندھ رہے ہیں اور خود اہل مکہ کی یہ حالت ہے کہ وہ بطحا میں سوئے پڑے ہیں۔

اس شعر کا دوسرا مصرع حکیم سنائی کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

چو علمت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

یہاں تک مشرق کی کیفیت تھی، اب اہل مغرب کی حالت کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

(۶) موجودہ زمانہ کی تہذیب کا شیشہ لا کی شراب سے لبالب بھرا ہوا ہے یعنی وہاں خدا سے بھی انکار ہے اور اس کے حکموں سے بھی انکار ہے۔ شراب پلانے والے کے ہاتھوں میں الّا کا پیالہ نظر نہیں آتا، یعنی اس مے خانے میں کوئی ایسا ساقی نہیں جو لوگوں کو خدا کے اقرار اور اس کے حکموں پر کاربندی کی تلقین کرے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مغرب کی سرزمین میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہوں، ابلیس کا زور بڑھے اور وہاں آئے دن تباہی خیز بلاؤں کا نزول ہوتا رہے۔ یہ نزول برابر جاری ہے۔ اور یورپ چیخ چلا رہا ہے۔

(۷) یورپ کے ساز سے چیخ پکار کے نوحے ابھی نیچے سروں میں نکل رہے ہیں، اس لئے کہ ساز بجانے والے نے اپنی مشاقی اور چابک دستی سے ان نوحوں کو دبا رکھا ہے لیکن وہ اس کوشش میں کب تک کامیاب ہوگا؟ یورپ پر جو ضربیں لگ رہی ہیں، ان کا نتیجہ یہی ہے کہ آخر ماتمی نوحے پورے زور سے بلند ہونے لگیں۔

(۸) یورپ کے دریا سے وہ تند و تیز لہر بھی اٹھ رہی ہے، جس سے تہ میں بیٹھے ہوئے مگرمچھوں کے ٹھکانے بھی الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ یورپ بڑی بڑی طاقتوں کا مرکز ہے، لیکن اس نے جو تہذیب پیدا کی ہے، وہی بالآخر ان طاقتوں کی تباہی کا سامان بنے گی۔

یہ اشعار سنہ ۱۹۳۳ء کے آخر یا سنہ ۱۹۳۴ء کے اوائل میں لکھے گئے۔ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء میں اقبال خدا کو پیارے ہو گئے۔ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم

شروع جس نے کم و بیش پانچ سال میں یورپ کو عبرتناک تباہی کا مرقع بنا دیا۔ دیکھئے اقبال کی پیش گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ یہ شعر دوسری جنگِ عظیم سے کوئی پانچ سال پیشتر کہا گیا تھا۔ اقبال نے تو اس جنگ سے تیتیس سال پہلے ۱۹۰۷ء میں بھی یہی پیش گوئی کی تھی، جب اہل یورپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

تیسرا حصہ | اس حصہ میں غلامی اور آزادی کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

(۱) غلامی انسانوں میں حسن اور زیبائی کے ذوق کو فنا کر دیتی ہے۔ غلام کبھی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا کہ حسن کیا ہے اور زیبائی کسے کہتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ جو کچھ اپنے آقاؤں اور حاکموں کی خوشنودی کو مدنظر رکھ کر کہتا ہے۔ اس کی ذاتی رائے اور بصیرت کار آمد نہیں رہتی حقیقت میں زیبا چیز وہی ہے جسے آزاد بندے زیبا کہیں۔

یہاں حسن و زیبائی سے مراد فکر و عمل کی اچھائی اور درستی ہے۔ اقبال کہتے ہیں، فکر و عمل کی اچھائی میں غلاموں سے رائے نہیں لی جا سکتی، اس لئے کہ انہیں اچھائی کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اچھائی کا فیصلہ صرف ان پر موقوف ہے جو آزاد ہوں۔

(۲) غلاموں کی بصیرت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ان کی آنکھیں بینا نہیں ہوتیں۔ یہ شرف صرف مردانِ حق کو عطا کیا جاتا ہے۔ انہیں کی آنکھیں

بینا ہوتی ہیں۔

(۳) دورِ حاضر کا قائد و رہنما اور مالک وہی تھا اسی کو سمجھا جا سکتا ہے جو ہمت سے کام لے اور زمانے کے سمندر سے کل آنے والے دور کے موتی نکالے۔

مراد یہ ہے کہ زمانے کی سیر و گردش جاری رہے۔ یہاں کوئی بھی چیز ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ حقیقتیں کبھی نہیں بدلتیں لیکن دنیا کے سامنے انہیں پیش کرنے کی کیفیتیں احوال و ظروف کے مطابق برابر بدلتی رہتی ہیں۔ قیادت کا درجہ اسی کے لئے زیبا ہے جس کی فکر و نظر اتنی گہری اور دور رس ہو کہ زمانے کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرے اور حقیقتوں کو ایسے انداز میں بیان کرے کہ آنے والی نسلیں راہِ حق پا کر اس پر کاربند ہو سکیں۔

چوتھا حصہ | سُبل: سبیل کی جمع، راستے۔ ختم الرُّسُل: رسولوں کا خاتم یعنی آخری رسول ؐ۔

(۱) فرنگی ایسا شیشہ گر اور شعبدہ باز ہے جس نے اپنے فن کے کمال دکھا کر پتھروں کو پانی بنا دیا۔ مجھے خدا نے ایسی اکسیر عطا کی کہ میں نے شیشے میں سنگِ خارا کی سی سختی پیدا کر دی۔

یورپ والوں نے ایشیا کی طاقت ور اور باعظمت قوموں کو اپنی شعبدہ بازی سے اس درجہ بے حقیقت بنا دیا کہ ان میں کسی کے مقابلہ کی قوت باقی نہ رہی۔ مجھے خدا کی مہربانی سے ایسی تعلیم دینے کی توفیق نصیب ہوئی جس کی بدولت ایشیا کی نازک اور کمزور قوموں میں نئے سرے سے مقابلہ اور ضرب کی ہمت پیدا ہو گئی۔

(۲) اس دنیا کے فرعون اور آتی طور طریقوں کے منکر پہلے بھی میری گھات میں رہے ہیں اور اب بھی ہیں، مگر مجھے نہ کوئی غم ہے اور نہ کوئی خوف، اس لئے کہ میری آستین میں وہ ید بیضا موجود ہے جس کی بدولت حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو شکست دی تھی۔

یہاں ید بیضا سے مراد لبظاہر قرآن پاک کی تعلیم ہے۔

(۳) خس و خاشاک اس چنگاری کو کبھی کر دبا سکتا ہے جسے خدا نے سر کنڈوں کے جنگل میں آگ لگانے کے لئے پیدا کیا؟

مراد یہ ہے کہ جو تعلیم میں دے رہا ہوں، یہ کسی بھی تدبیر سے رک نہیں سکتی اس لئے کہ مشیت ایزدی یہ ہے اس سے تمام ایشیائی قوموں میں زندگی کی نئی حرارت پیدا ہو جائے اور وہ پھر اپنا اصل مقام حاصل کر لیں۔

(۴) محبت کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ انسان اپنی حقیقت پہچان لے پھر اس پر قائم رہے اور اس کی حفاظت کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ محبت قیصر و کسریٰ جیسے بادشاہوں کے آستانوں سے بے نیاز ہے۔

یہاں محبت سے مراد عشق رسول ﷺ ہے جیسا کہ اگلے شعر میں اقبال نے خود واضح فرما دیا۔ گویا اس نظم میں زیر غور شعر کو وہی حیثیت حاصل ہے جو قصیدے میں گریز کو حاصل ہوتی ہے۔ گریز کے لفظی معنی ہیں دوڑنا، بھاگنا۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف رجوع کیا جائے۔ قصیدہ میں گریز سے یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر دوسرے مضمون بیان کرتے کرتے ایک دم اصل مدعا کی طرف متوجہ ہو جائے۔

(۵) اگر میں چاند اور ثریا کا شکار کر لوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، اس لئے کہ میں نے اپنا سر ایک بہت بڑی اور بلند ہستی کے شکار بند میں باندھ دیا ہے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع میرزا صائب اصفہانی کا ہے جس میں اقبال نے صرف ایک لفظی تغیر کیا۔ بہت بڑی صاحب دولت ہستی سے اشارہ حضرت رسول اکرم (صلعم) کی جانب ہے۔

(۶) وہ صاحب دولت ہستی کون سی ہے؟ وہ پاک ذات جو خدا تک پہنچانے والے راستوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ پاک ذات جس پر اس دنیا میں رسولوں اور نبیوں کے آنے کا سلسلہ ختم ہوا۔ وہ پاک ذات جو اس کائنات کی آقا و مولا ہے۔ وہ پاک ذات جس کی برکت سے راستہ کی گرد کو وادی سینا (کوہِ طور) کی تجلیوں کا رتبہ حاصل ہوا۔

(۷) عشق و مستی کی نگاہ میں وہی پاک ذات ہے جس کا ظہور اس کائنات میں سب سے اوّل ہوا اور دنیا کے لئے وہی پاک ذات پہلا اور آخری نمونہ ہے۔ وہی قرآن ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رض نے فرمایا: کان خلقہ القرآن (حضور انور صلعم قرآنی اخلاق کا مکمل عملی نمونہ تھے) اسی سے حق اور باطل میں فرق ہوا۔ اسی کو قرآن پاک میں یاسین اور طٰہٰ کے لقبوں سے یاد کیا گیا۔

(۸) اس پاک ذات کی نعت کے سمندر میں لاکھوں چمکیلے اور آب دار موتی باقی ہیں میں غوطہ لگاتا تو اور موتی نکال لاتا لیکن حکیم سنائی کا ادب دامن گیر ہوا اور میں نے مزید غوطے نہ لگائے۔

---

(۲)

تیمور: وسط ایشیا کا سب سے بڑا فاتح مسلمان۔ بابر تیمور کی چھٹی پشت میں تھا جس نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تیمور نے ایشیا کے اکثر چھوٹے بڑے بادشاہوں کو تباہ کیا اور بے شمار انسانوں کا خون بہایا۔

رستاخیز: قیامت۔ چنگیز: تاتاریوں کا وہ مشہور سپہ سالار جس نے تیرھویں صدی عیسوی میں اپنی خانہ بدوش قوم کو منظم کر کے ایک بے پناہ قوت پیدا کر لی پھر اسلامی ملکوں پر حملہ آور ہوا اور ایشیا کے تاریخی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی یورش میں کم و بیش ستّر لاکھ مسلمان موت کے گھاٹ اترے۔

(۱) یہ کون غزل کہنے والا ہے جس کا کلام دلوں میں سوز و گداز اور کیف و سرور پیدا کرتا ہے اور جس سے دانا لوگوں کی عقل پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

یہ شعر اقبال کے کلام کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ اس میں سوز و گداز بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ ماضی کی خوش گوار یاد تازہ کرتا ہے اور اس سے دل میں عمل کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کیف و سرور بھی ہے، اس لئے کہ شعر اپنی ظاہری صورت اور معنویت کے لحاظ سے بہت ہی نادر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جن لوگوں کو اپنی عقل و فکر پر ناز ہے، وہ بھی اس کلام سے ایسا گہرا اثر قبول کرتے ہیں، گویا ان پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ نیز اس سے عمل کا جوش اور جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

(۲) اگرچہ فقیری اور بادشاہی کے طور طریقے بظاہر یکساں ہیں لیکن ان دونوں

ہیں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ فقیرانہ شان دکھانے کے لئے کسی سلطنت کا محتاج نہیں۔ اس کے برعکس بادشاہی سلطنت کے بغیر خام رہتی ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ وجود پذیر ہی نہیں ہوتی۔

دونوں کے طور طریقے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہوں کی طرح فقیر بھی انسانوں کے بڑے حصہ پر حکومت کرتے ہیں۔ دونوں میں یکساں بے نیازی اور بے پروائی ہوتی ہے لیکن بادشاہ ملک و خزانے، فوج اور ساز و سامانِ جنگ کے بغیر کوئی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ بادشاہی قائم ہی نہیں رکھ سکتا۔ فقیر ایسے تمام سامانوں سے بے نیاز ہے۔ بادشاہ کے پاس جو لوگ آتے ہیں، دنیوی اغراض لے کر آتے ہیں۔ کوئی نوکری کا خواہاں، کوئی مال و دولت کا آرزومند، کوئی عزت کا طلب گار۔ فقیروں کے پاس صرف خدا کے لئے آتے ہیں۔ گویا بادشاہوں کی حکومت عموماً انسانی جسموں تک محدود ہوتی ہے اور فقیر دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

(۳) صوفیوں کے بھی حجرے تھے جن میں رہنے والے درویشوں کی فقیری کے لئے شیروں کے خونِ دل سے دستاویزیں تیار ہوتی تھیں۔ اب وہ فقیری اور درویشی باقی نہیں رہی۔

شیروں کے خونِ دل سے دستاویزیں تیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے شیر دلوں کے بیٹے ان درویشوں کے سامنے پانی ہوتے تھے۔

(۴-۵) اے درویشی کے حلقہ میں بیٹھنے والو! اس مردِ خدا کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے، جس کے گریبان میں قیامت کا ہنگامہ موجود ہو۔ جو ذکرِ حق کی گرمی سے

شعلہ کی طرح چمک رہا ہو اور جس کی فکر حقیقت تک پہنچنے میں بجلی کی طرح تیز ہو۔ یعنی حریتِ حق کی قابلِ ذکر خصوصیت یہی ہے کہ وہ جہاں بیٹھے، انقلاب پیدا کر دے۔ اس میں زندگی کی ایسی بے پناہ حرارت موجود ہو کہ مردہ دلوں کو اسی طرح زندہ کر دے، جس طرح قیامت کے دن مردے زندہ ہو جائیں گے۔ پھر اس کے ذکرِ حق میں خاص گرمی ہو اور وہ حقیقتوں کا جلد سے جلد صحیح اندازہ کر سکے۔ ایسے ہی لوگ قوموں میں زندگی کا نیا خون دوڑاتے اور انہیں منزلِ مقصود پر پہنچاتے ہیں۔

(۶) بادشاہی میں جب جنون کی علامتیں پیدا ہوتی ہیں تو اس کا علاج عام جنون کی طرح فصد کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر خدا تیمور اور چنگیز جیسے جابروں کو اٹھاتا ہے تاکہ وہ نشتر بن کر بادشاہی کے جسم سے فالتو خون نکال دیں اور اس کا مزاج اعتدال پر لے آئیں۔

یہ تاریخ کا عام سبق ہے۔ اس کی مثالیں ہر دور میں ملتی ہیں۔ بادشاہی میں جنون کی علامتیں پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کے بجائے عیش و عشرت میں ڈوب جاتی ہے اور رعیت پر ظلم و جور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر جابر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ قتل و خوں ریزی اور غارت گری سے عام تباہی پھیلا دیتے ہیں۔ تیمور اور چنگیز کا نام صرف مثالاً لیا گیا۔ تاریخ میں ایسی ہزارہا شخصیتیں موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک خاص واقعہ کا ذکر خالی از عبرت نہ ہوگا۔ مغلوں کے عہدِ زوال میں بندہ بیراگی نام ایک شخص نے خوں ریزی کا نہایت خوفناک دور شروع کر دیا تھا۔ یہ شخص اصلاً ہندو تھا، پھر سکھوں کے ساتھ مل کر ایک جمعیت

پیدا کرلی جنوبی و مشرقی پنجاب سے خوں ریزی کا آغاز کیا جہاں جاتا کسی مسلمان مرد، عورت، بچے، بوڑھے کو زندہ نہ چھوڑتا۔ مکانوں کو آگ لگا دیتا۔ کئی سال تک اس نے فتنہ بپا کئے رکھا۔ آخر نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا۔ فرخ سیر کا عہد تھا۔ بیراگی کو سزائے موت کا حکم ملا سزا جاری کرنے سے پیشتر پوچھا گیا کہ آخر تو نے اتنے ظلم کیوں کیے، حالانکہ تو دیکھنے میں خاصا عقل مند معلوم ہوتا ہے؟ اس نے جواب دیا:

تمام قوموں اور مذہبوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جب خلق خدا کی سرکشی اور عصیاں کاری حد سے بڑھ جاتی ہے تو حقیقی بدلہ لینے والا اعدا ان کے اعمال کی پاداش میں مجھ جیسے ظالم کو مقرر کرتا ہے تاکہ ہر ایک کو اس کی سزا مل جائے۔ بعد ازاں تم جیسے با اقتدار لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے کہ مجھ ایسے ظالموں کو عمل بد کی سزا دیں۔[۱]

ایں جوش و خروش ظالمان چیست   گر چوبِ خدا اصدا ندارد

(۷) عراق اور ایران کے اہل سخن مجھے کلام کی دادیوں دیتے ہیں کہ یہ ہندی کافر تلوار اور نیزے کے بغیر ہی خوں ریزی کر رہا ہے۔

مراد یہ ہے کہ اگرچہ میرے ہاتھ میں جنگ کا کوئی سامان نہیں۔ نہ تلوار ہے، نہ نیزہ، نہ کوئی اور چیز، تاہم میں وہ تعلیم دے رہا ہوں جس سے باطل کا سر قلم ہو جاتا ہے اور کفر و الحاد کے لشکروں کا خون سیل کی طرح بہنے لگتا ہے۔ یہ سب سے بڑی داد ہے جو اقبال کو اس کے کلام کی مل سکتی ہے۔

---

[۱] سیر المتاخرین صد ۴۰۳۔

(۴۳)

قارون: قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کا ایک فرد تھا، جسے خدا نے بکثرت مال و زر عطا کیا تھا۔ وہ راہِ حق سے منحرف ہو گیا۔ سمجھانے بجھانے کا بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے قارون اور اس کے گھر کو زمیں میں دھنسا دیا اور کوئی بھی اسے خدا کی گرفت سے بچا نہ سکا۔

افلاطون: یونان کا مشہور فلسفی۔ رومی: اشارہ ہے حضرت مولانا رومؒ کی طرف۔

کُن فیکُون: اشارہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف: بدیعُ السّمٰوٰتِ وَالاَرضِ اِذا قضیٰ اَمراً فَاِنّما یقولُ لہٗ کُن فیکُون (خدا ہی آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، سو ہو جاتا ہے) گویا خدا نے کائنات کو پیدا کرتے وقت کُن کہا اور وہ پیدا ہو گئی۔ جیجوں: ترکستان کا مشہور دریا۔

(۱) جنونِ عشق مجھے راز کی جو باتیں سکھا گیا ہے، اگر خدا کی رحمت سے مجھے جبریلؑ کی سی صلاحیت بیان عطا ہو جائے تو میں اس کا اظہار کر سکتا ہوں، یعنی جو باتیں میرے دل میں سمائی ہوئی ہیں، انہیں ٹھیک ٹھیک بیان کرنے کے لئے وحیِ الٰہی کی قوتِ بیان درکار ہے، چونکہ وہ باتیں قرآن پاک کی تعلیم سے ماخوذ ہیں، اس لئے عام انسانی بیان ان کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

(۲) لوگ ستاروں سے اپنی تقدیر کی باتیں معلوم کرنے کے خواہاں رہتے ہیں، وہ اس غرض سے نجومیوں کے پاس جاتے ہیں، میں حیران ہوں کہ ستارہ میری تقدیر کے متعلق کیا بتا سکتا ہے؟ وہ تو خود آسمانوں کی وسعتوں میں

خوار و خستہ پھر رہا ہے۔

(۳) زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ انسان کی فکر اور نظر میں جذب عشق کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اسے محبوب و مطلوب کے سوا کسی دوسری چیز کا ہوش نہ رہے۔ فکر و خیال پہ بھی محبوب ہی چھایا ہوا ہو اور نظر میں بھی اس کے سوا کوئی دوسرا نہ سمائے۔ محبوب کے سوا دوسرے خیالات میں سرگرداں رہنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ خودی کو موت آ جائے۔

(۴) یہ عجیب ماجرا ہے کہ مجھے خودی کی لذت عطا کر کے محبوب یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی ہستی کھو بیٹھوں۔

(۵) میں نہ قارون کے مال و زر کا خواہاں ہوں، نہ افلاطون کی سی عقل کا طلبگار ہوں مجھے تو یہ مطلوب ہے کہ ضمیر تمام آلائشوں سے پاک ہو، نگاہ میں بلندی ہو جائے اور محبوب کے شوق میں ہمہ تن مگن رہوں۔ جسے یہ تین دولتیں مل جائیں اور کسی شے کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔

(۶) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعۂ معراج سے میں نے یہ نکتہ حاصل کیا کہ آسمان انسان کی رسائی سے باہر نہیں۔

واقعۂ معراج کی اس معنویت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسے معراج کا نام کیوں دیا گیا؟ اور خود یہ واقعہ عالم انسانیت کے لئے عظمت و برتری کی کیسی نادر دستاویز ہے۔

(۷) خدا نے ازل کے دن کُن کہا اور یہ کائنات پیدا ہو گئی۔ کُن کی صدا ہر دم برابر آ رہی ہے اور جو کچھ خدا چاہتا ہے، وہ ہو رہا ہے۔ پھر کیا یہ سمجھا جائے کہ ابھی تک

کائنات کی تخلیق کا سلسلہ مکمل نہیں ہوا اور اس کا پورا ہونا باقی ہے؟

(۸) اے مخاطب! تیری عقل پر ابھی تک اہل یورپ کا جادو غالب ہے۔ یہ ایک خوفناک بیماری ہے، جس کا علاج صرف یہ ہے کہ تو مولانا روم رح کے عشقِ حق کی آگ میں جلے۔

(۹) مولانا ہی کے فیض سے میری نظر میں حق و باطل کو دیکھنے کی روشنی پیدا ہوئی انہیں کے فیض سے میرا چھوٹا سا کوزہ ان برکتوں سے لبریز ہوا، گویا اس میں دریائے جیحوں کی موج زنی کا نقشہ پیدا ہو گیا۔

(۴)

اس نظم میں انسان کا اشرف المخلوقات ہونا نہایت دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱) اے پانی، مٹی، ہوا کی دنیا! بتا، خدا کا کھلا ہوا بھید تو ہے کہ میں ہوں؟ کھلے ہوئے بھید سے مراد یہ ہے کہ صاف نظر آ رہا ہو، لیکن اس کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ وہ پاک ذات جو نگاہوں سے چھپی ہوئی ہے، اس کی دنیا تو ہے کہ میں ہوں؟ یعنی اس کے جلوے حقیقی شان سے تجھ میں نمایاں ہیں یا مجھ میں؟

مطلب یہ کہ یہ کائنات ویسا کھلا ہوا بھید نہیں، جیسا کہ انسان ہے۔ کائنات کی بے شمار چیزیں ہیں، جن کی حقیقت اور جن کا مصرف معلوم ہو چکا ہے، لیکن انسان کی حقیقت اب تک معلوم نہ ہو سکی۔ بلاشبہ کائنات خدا کی تجلیات کا مظہر ہے، لیکن جیسا جامع مظہر انسان ہے، ویسی کائنات کی کوئی شے نہیں۔

(۲) دکھ، درد، سوز، تپش اور رنج و غم کی وہ رات جسے زندگی کہتے ہیں اس کی صبح تو ہے کہ میں؟ اور اس کی اذان تجھے سمجھنا چاہیئے کہ مجھے؟

انسان کے ظہور سے پیشتر اس کائنات کی زندگی جیسی بھی تھی۔ اس کی صحیح تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ وہ درد، سوز اور غم کی ایک اندھیری رات تھی انسان پیدا ہوا تو رات ختم ہو گئی اور اس کی جگہ صبح کی روشنی نمودار ہوئی۔ انسان ہی ہے جس نے اس کائنات میں صبح کی اذان کہی۔ وہی ہے جس نے اس کائنات کی تخلیق کا مقصد معلوم کیا اور اس مقصد کی تکمیل میں لگ گیا۔

(۳) اے پانی، مٹی اور ہوا کی دنیا! تو بتا کہ شام اور صبح، رات اور دن کس کے پوشیدہ جوہروں کو آشکارا کرنے کے لئے چکر لگا رہے ہیں؟ زمانے کے کندھے پر بھاری بوجھ تو ہے کہ میں؟

مراد یہ کہ انسان کے جوہر تو ابھی تک پوری طرح آشکارا نہیں ہوئے اور غرض سے رات دن کا سلسلہ جاری ہے کہ یہ جوہر پوری طرح کھل جائیں لہذا انسان زمانے کے کندھے پر بوجھ نہیں بن سکتا۔ یہ پانی، مٹی اور ہوا کی دنیا بوجھ ہے۔

(۴) اے پانی، مٹی اور ہوا کی دنیا! تو خاک کی ایک مٹھی ہے اور تجھ میں بصارت و بصیرت کا کوئی جوہر موجود نہیں۔ میں بھی خاک کی ایک مٹھی ہوں، لیکن اپنے آپ کو دیکھنے والا اور اپنی حقیقت کو سمجھنے والا ہوں۔ اب تو بتا کہ زندگی کے کھیت کے لئے بہتا ہوا پانی تو ہے کہ میں؟ یعنی زندگی کے کھیت میں طراوت اور شادابی میری وجہ سے پیدا ہوئی، نہ کہ تیری وجہ سے۔

(۵)

اقبالؔ نے خود فرمایا کہ یہ شعر لندن میں لکھے گئے۔

خیام: خیمہ کی جمع۔

(۱) اے مسلمان! تو ابھی راستہ میں ہے اور منزلِ مقصود پر نہیں پہنچا، اس لئے تجھے کسی مقام کا پابند نہ ہونا چاہیئے۔ اپنے اوپر پابندی عائد کرے گا تو منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکے گا، لہٰذا تجھے مصر یا حجاز، ایران یا شام وغیرہ کی حد بندیوں سے اپنے آپ کو وابستہ نہ کرنا چاہیئے۔

اقبالؔ کا یہ عام مضمون ہے اور بیسیوں مرتبہ اسے مختلف رنگوں میں دہرایا ہے۔ اس شعر میں بالکل اچھوتا انداز اختیار کیا ہے اور استدلال بھی بالکل اچھوتا ہے یعنی مسلمان کا مقصد اس دنیا میں ابھی تک پورا نہ ہوا اور جب تک یہ مقصد پورا نہ ہو، اسے یورپ کا وہ سیاسی تصوّرِ قومیت اختیار نہ کرنا چاہیئے جسے عام طور پر جغرافیائی تصوّرِ قومیت کہتے ہیں یعنی ہر ملک کی الگ قومیت مسلمان اگر اسے اختیار کرے گا تو وہ اپنا نصب العین پورا نہ کر سکے گا۔

(۲) اے مسلمان! حور و قصور اور شرابِ طہور کا خیال چھوڑ دے۔ تیرا ہر عمل ہر غرض سے پاک ہونا چاہیئے اور جو عمل بے غرض ہو، اس کی جزا حور و قصور اور شرابِ طہور سے بہت بلند ہے۔

ہم نے حور و خیام کی جگہ حور و قصور کے الفاظ استعمال کئے جو عام اور مشہور الفاظ ہیں۔ اقبالؔ کے سامنے سورۂ رحمٰن کی یہ آیت: حُورٌ مَّقْصُوْرَاتٌ

فی اَلخِیاءِ (وہ پاک عورتیں جو خیموں میں بیٹھی ہیں) بادہ وجسام سے بہشت کی پاکیزہ شراب مراد ہے۔ لہذا اسے شراب طہور قرار دیا گیا۔

مقصود یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جو بھی عمل ہو، وہ بالکل بے غرضانہ ہونا چاہیئے خدا اپنی رحمت سے جو جزا چاہے دے۔ یہ مضمون نیا نہیں۔ مثال کے طور پر میرزا غالب کہہ گئے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

لیکن اقبال نے اس کے لئے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل نیا ہے۔

(۳) اگرچہ یورپ کے حسن کی بہار بہت دل کش ہے، لیکن اس کی حیثیت وہی ہے جو جال میں دانہ کی ہوتی ہے مقصود یہ ہوتا ہے کہ دانہ دیکھ کر پرندہ اتر آئے اور اسے جال میں پھانس لیا جائے۔ اے اونچا اڑنے والے پرندے! تو اس دانے اور جال سے بچا رہ۔

اس شعر میں مسلمان کو یورپی تہذیب سے محفوظ رہنے کی تلقین کی گئی ہے

(۴) اے مسلمان! تجھے خدائے تعالیٰ نے لا الٰہ الا اللہ کی وہ ضرب عطا کی ہے جو پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے سکتی ہے۔ تو ہی مغرب و مشرق کے عقدے کھول سکتا ہے اور ان کی مشکلیں دور کر سکتا ہے۔ عام تلواریں خاص وقت میانوں میں رہتی ہیں، لیکن اے مسلمان! تو تیغ ہلال کی طرح میان کے عیش و آرام سے بالکل کنارہ کش رہ یعنی تیرا کام یہ ہے کہ ہر وقت حقیقی ضرب لگاتا رہے۔ اور توحید کا پیغام دنیا کو پہنچاتا رہے اسی پر مشرق و مغرب کے عقدوں کا حل ہونا موقوف ہے۔

(۵) افسوس کہ تیرے رہنماؤں کو حضوری کا درجہ حاصل نہیں اور تیری نمازیں کیف و سرور سے خالی رہ گئی ہیں۔ ایسی نمازوں سے کیا فائدہ؟ اور ایسے امام تجھے کیوں کر منزل پر پہنچا سکتے ہیں؟

(۶)

ناخوش اندیشی: ایسی باتیں سوچنا جو بہت بری ہوں۔

(۱) مردانِ حق گی درویشی راز کی امانت دار ہے، اس لئے کہ اسے (درویشی کو) جبریلؑ سے عزیزداری کی نسبت حاصل ہے۔

جبریلؑ کو اس لئے جبریلِ امین یا روح الامین کہا گیا کہ وحیِ الٰہی کو ٹھیک ٹھیک اور بے کم و کاست امانت داری سے خدا کے رسولوں تک پہنچا دیتے تھے۔ مردانِ حق کی درویشی کا خاصہ بھی یہی ہے کہ وہ جن باتوں کو حق سمجھتے ہیں ان میں کمی بیشی روا نہیں رکھتے، اس لئے اس حد تک انہیں حضرت جبریلؑ سے خاص تعلق ہے۔

(۲) کوئی نہیں بتا سکتا کہ دنیا دار فقیہوں، دکھاوے کے صوفیوں اور حقیقت ناشناس شاعروں کی غلط اندیشیوں اور گمراہیوں نے کتنی قوموں اور جماعتوں کی کشتیاں غرق کر دیں۔

یہی گروہ ہیں، جن کے ہاتھ میں عموماً قوموں کی باگ ڈور رہتی ہے۔ فقیہ عوام کو دنیا کی باتیں سکھانے، صوفی راہ حق پر چلانے اور شاعر زندگی کی روح پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے فرائض بھول جائیں اور ایسی باتیں کہنے یا سکھانے لگیں جو قوموں میں دنیاداری، بے عملی، ریاکاری اور

تن آسانی پیدا کر دیں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ ترقی کرنے ابھرنے کے بجائے پستی میں گرتی جائیں۔ اس طرح ان کی عزت و عظمت کی کشتی فنا کی تہ میں پہنچ جائے گی۔

(۳) قوموں کو اس گرم نگاہ کی ضرورت ہے جس سے شیروں کے بھی ہوش اڑ جائیں۔ یہ گرم نگاہ عشق حق کے سچے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سرد آہ کی ضرورت نہیں جو قوموں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بزدل بناتی ہے۔

(۴) عشق کے طبیب نے مجھے دیکھا تو فرمایا، تجھے صرف یہ بیماری ہے کہ تیرے دل میں آرزو چٹکیاں نہیں لیتی۔

یہ اقبال کی حالت کا نقشہ نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کی حالت کا نقشہ ہے کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے دل میں سربلندی کی تڑپ پیدا نہ ہو، یہ تڑپ اسے ہر لحظہ بے قرار نہ رکھے، ہر آن اس کے دل میں چٹکیاں نہ لیتی رہے اور اس کی ہمت و جوش عمل پر تازیانے نہ لگاتی جائے۔ جس قوم میں سربلندی کی تڑپ موجود نہ ہو، وہ ترقی کیونکر کر سکتی ہے؟ اسے تو بیمار سمجھ لینا چاہیے اور بیماری کا خاصہ یہ ہے کہ جتنی لمبی ہوتی جائے گی بیمار کی صحت کے متعلق مایوسی بڑھتی جائے گی۔

(۵) جسے اہل نظر جان پاک کہتے ہیں، وہ کوئی اور ہی چیز ہے۔ یہ چہرہ کا رنگ نکھر جانا اور اس میں تروتازگی پیدا ہونا یا لہو کا رگوں میں دوڑتے پھرنا جان پاک نہیں۔ یہ چیزیں تو زیادہ کھانے پینے کا نتیجہ ہیں۔

زندگی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں انسان اور عام حیوان مشترک ہیں؛

یعنی کھانے پینے سے جسم کا موٹا اور صحت مند ہونا یا جسم کی رونق اور تروتازگی بڑھ جانا۔ انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے زندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے سامنے اعلیٰ حقانی مقاصد ہوں اور انہیں پورا کرنے میں جان لڑا دے۔ جان پاک اسی جسم میں ہوتی ہے جس میں انسانیت کی یہ اعلیٰ خصلتیں موجود ہوں۔ محض کھا پی کر فارغ البال رہنے سے جسم میں جان تو رہتی ہے لیکن اسے جان پاک نہیں کہہ سکتے۔

(۷)

اس نظم کے ابتدائی شعروں میں صبح بہار کا منظر نہایت دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اقبال نے اپنا پیغام دیا ہے۔

(۱) پھر اونچ نیچ اور نشیب و فراز لالے کے چراغوں سے روشن ہو گئے۔ باغ کے گانے والے پرندے پھر میرے دل میں نغموں کے ولولے پیدا کرنے لگے یعنی بہار کا موسم آ گیا، جا بجا پھول کھلنے لگے اور پرندوں نے راگ گانا شروع کیا۔ میرے دل میں بھی نغموں کا طوفان لہریں لینے لگا۔

(۲) جنگل میں پھول کھلے ہوئے ہیں یا پریاں پرے باندھے کھڑی ہیں، کسی کا لباس اودا ہے، کسی کا نیلا اور کسی کا پیلا یعنی ہر رنگ کے پھول بے شمار نظر آ رہے ہیں۔

(۳) صبح کی پر نم ہوا نے پھول کی پنکھڑی پر شبنم کا موتی رکھ دیا۔ سورج نکلا اور اس کی کرنیں اس موتی پر پڑیں تو اس میں اور بھی آب و تاب پیدا ہو گئی۔

(۴) قدرت کا حسن اپنی نمائش کے لیے کسی موقع، محل اور مجمع کا محتاج نہیں

اگر اسے اپنی بے نقابی کے لئے شہروں کے مقابلے میں جنگل زیادہ پیارے ہوں تو شہروں کو اچھا سمجھنا چاہیئے یا جنگلوں کو؟

مطلب یہ کہ بہار کا اصل لطف شہروں میں نہیں آسکتا۔ اس کے دل کش نظارے جنگل ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ قدرت سے حسن کو دیکھنے والوں کی کوئی پروا نہیں۔ اگر پروا ہوتی تو وہ اپنی نمائش شہروں میں کرتا۔ یہ اسے گوارا نہ ہوا اور جنگلوں کو اس نے اپنا منظر بنایا، لہذا ہمیں بھی تماشے کی غرض سے جنگلوں کا رخ کرنا چاہیئے۔

(۵) اگر تو زندگی کا کھوج لگانا چاہتا ہے تو اپنے من میں غوطہ لگا، وہیں تجھے یہ گراں قدر متاع ملے گی۔ اچھا تو اگر میرا کہنا مانے اور میری بات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تو نہ سہی، تو اپنی ذات سے تو وفاداری کا رشتہ نہ توڑ، یعنی تو اگر اپنا بھی بن جائے اور اپنی حقیقت بھی پہچان لے تو یہ بات تجھ پر روز روشن کی طرح آشکارا ہو جائے گی کہ من ہی میں ڈوبنے سے زندگی کا سراغ ملتا ہے۔

(۶) من کی دنیا کیا ہے؟ من کی دنیا سوز اور مستی، جذب اور شوق کی دنیا ہے۔ اس میں خدا کی لگن ہے۔ اس کے عشق میں ڈوبے رہنا ہے، اس کی طرف کھنچے جانا ہے اور اس کے شوق میں سب کچھ بھلا دینا ہے۔ اس کے برعکس تن کی دنیا کیا ہے؟ تن کی دنیا یہ ہے کہ اپنے نفع اور اپنی غرض کے لئے سودائی بنا رہے۔ اس سلسلہ میں مکاری اور چالاکی بھی بے تکلف کر لی جائے اور حق یہ ہے کہ ذاتی نفع کو نصب العین بنا لینے والے لوگ مکر و فریب کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔

(۷) من کی دولت ایسی ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے کہ ایک مرتبہ ہاتھ آجائے تو پھر ضائع نہیں ہوتی۔ تن کی دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے، اس لیے کہ دھن آتا ہے تو چلا بھی جاتا ہے۔ اسے پائداری حاصل نہیں۔

(۸) من کی دنیا میں اور بھی خوبیاں ہیں۔ مثلاً وہاں فرنگی کی حکومت نہیں کہ خطرہ ہو، یہ ہمیں اپنی غرض کے لیے استعمال کرے گی۔ من کی دنیا میں شیخ و برہمن کے بھی جھگڑے نہیں جنھوں نے قوموں کو گمراہ کر کے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

(۹) مجھے تو خدا مست درویش کی یہ بات پانی پانی کر گئی کہ تو غیر کے آگے جھک جائے گا تو من تیرا رہے گا، نہ تن، یعنی تیری وہ دولت بھی چھن جائے گی، جسے زوال نہیں، اور وہ دولت بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی، جس کے لئے دنیا بھاگی دوڑی پھرتی ہے، اگرچہ وہ عارضی ہے۔

(۸)

اقبال نے خود لکھا ہے کہ یہ شعر کابل میں کہے گئے تھے۔

(۱) مسلمان کی فطرت ہی یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ حسن اخلاق، ہمدردی اور محبت سے پیش آئے اور ان کی دل نوازی کرے، جو مردان حق خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، لطف و احسان اور شفقت و مروت ان کی عالم گیر خوبیاں ہیں، یعنی ہو نہیں سکتا کہ مسلمان جو راہ خدا کا غازی ہے، ان خصلتوں سے خالی ہو۔

(۲) اے خدا! مجھے درس گاہوں کے منتظموں سے یہ شکایت ہے کہ وہ شہبازوں کے بچوں کو مٹی میں کھیلنے کا سبق دے رہے ہیں۔

یہ موجودہ نظام تعلیم کی بنیادی خرابی کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کے بچوں میں

وہ جوہر پیدا کرنے چاہئیں، جو انہیں سربلندی اور بلند پروازی کے پیکر بنا دیں، لیکن یہاں انہیں ایسی تربیت دی جا رہی ہے کہ ہمیشہ کے لئے پستی اور کم ہمتی میں ڈوبے رہیں۔

(۳) جو لوگ مدت دراز سے دوسروں کا شکار بنے ہوئے تھے، ان کی نگاہوں کا انداز بدل گیا۔ یہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ میں نے شہبازی کا طریقہ روز روشن کی طرح آشکارا کر دیا۔

(۴) خدا مست درویش کے پاس لا الٰہ کے دو حرفوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ سب کو توحید کا پیغام دیتا ہے اور توحید کا پابند بناتا ہے۔ شہر کے فقیہ کے پاس عربی الفاظ کے بے شمار خزانے موجود ہیں۔ وہ تقریر و تحریر میں بڑے بڑے لفظ استعمال کرتا ہے۔ پھر ان کی تشریح میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے لیکن حقیقی پیغام نہیں پہنچاتا۔

مطلب یہ کہ اصل نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ مقصد یہ نہ تھا کہ ان علوم کے حاصل کرنے میں زندگیاں گزار دی جائیں جو دین کے سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ حقیقی مقصد یہ تھا کہ دین کی تبلیغ کی جائے۔ عام علماء نے پہلے مقصد کو اپنا لیا اور دوسرے سے غافل ہو گئے۔ جن پاک ہستیوں کے دل میں خدا کی سچی محبت ہے، وہ ہر ایک کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتی ہیں۔ عام علماء کی طرح الفاظ و فقرات کے پیچھے نہیں لڑھکاتیں۔

(۵) مجھے عام شاعروں کی طرح شراب، صراحی اور پیالے کی باتیں نہیں آتیں۔ لہٰذا مجھ سے یہ باتیں سننے کی امید نہ رکھ۔ میں تو پتھروں کو چیرنے والا ہوں۔

تعجب یہ ہے کہ تو مجھ سے شیشے بنانے کا تقاضا کر رہا ہے!

مطلب یہ کہ میں تو قوم میں زندگی کی روح پیدا کر رہا ہوں۔ میری آرزو تو یہ ہے کہ سب کو سخت کوش اور مجاہد بنا دوں۔ مجھ سے ایسے شعروں امید کیوں رکھی جاتی ہے جو محض دل بہلانے کے کام آئیں اور ان سے تن آسانی پیدا ہو؟

(۶) اے اقبال! تو نے یہ درویشی کہاں سے سیکھی جس نے تجھے اس درجہ پر پہنچا دیا کہ بادشاہوں میں بھی تیری بے نیازی کا چرچا ہو رہا ہے؟ جس درویش کی بے نیازی پر بادشاہوں کو بھی اچنبھا ہو، اس کی عظمت و بلندی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟

(۹)

(۱) زندگی کے نغمے میں اونچے نیچے سُر عشق کی برکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان مٹی کا پتلا ہے، اس میں سوز و گداز ۔ اور تڑپ عشق ہی پیدا کرتا ہے۔

(۲) عشق انسان کی رگ رگ میں اس طرح سما جاتا ہے جس طرح پھول کی شاخ میں نسیم صبح کی طراوت۔

(۳) اے انسان! اگر تو اس حقیقت کو نہ پہچانے کہ روزی دینے والا خدا ہے تو تو یقیناً بادشاہوں کا محتاج ہو جائے گا۔ اگر اس حقیقت کو پہچان لے تو دارا اور جمشید جیسے بادشاہ بھی تیرے دروازے کے بھکاری بن جائیں۔

(۴) دل کی آزادی شہنشاہی ہے اور پیٹ موت کا سامان ہے۔ اب

تو خود فیصلہ کر کہ تجھے دل کی آزادی چاہیئے یا پیٹ ؟

جن لوگوں کو دل کی آزادی حاصل ہو، وہ یقیناً بادشاہوں کے بادشاہ ہیں، اس لیئے کہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، لیکن جن کی نظریں پیٹ کی آگ بجھانے پر لگی ہوئی ہوں، وہ زندگی کی ہر اچھی نعمت کھو بیٹھتے ہیں، لہٰذا ان کو مردہ سمجھنا چاہیئے، اگرچہ زندہ ہوں۔ اقبال دل کی آزادی سکھاتے ہیں نہ کہ شکم پروری۔

(۵) اے مسلمان! تو مُلّا سے نہ پوچھ، اپنے دل سے پوچھ کہ کعبہ خدا کے "سچے" بندوں سے کیوں خالی ہو گیا ؟

اس سے پہلے شعر کو سامنے رکھ لیا جائے تو جواب خود بخود مل جاتا ہے، یعنی کعبہ مردانِ حق سے اس لئے خالی ہو گیا کہ وہ لوگ دل کی آزادی قائم نہ رکھ سکے اور شکم بندے بن گئے۔

(۱۰)

صاحبِ لولاک: اشارہ ہے ایک مشہور عوام حدیث کی طرف جس میں خطاب رسول اللہ صلعم سے ہے: لو لاك لما خلقت الافلاك۔ (اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)۔

پُرکار: مکار، ہوشیار۔

(۱) اے مسلمان! تیرا دل سوز و گداز سے خالی ہو گیا ہے اور تیری نظر دنیا داری کی آلائشوں سے پاک نہیں۔ پھر اس میں تعجب کا کیا مقام ہے کہ تجھ میں بے باکی، بے خوفی اور دلیری نہیں رہی۔

ظاہر ہے کہ بے باکی اسی دل میں پیدا ہو سکتی ہے، جو عشق حق کی حرارت سے لبریز ہو اور نظر ہر دنیوی غرض سے بالکل پاک ہو۔ جو فرد ان دونوں جوہروں سے خالی ہو جائے گا، اس میں دلیری اور جوانمردی باقی نہ رہے گی۔

(۲) اے غافل انسان! خدا نے تجھے صرف فہم وادراک ہی کی دولت نہیں دی بلکہ جس مٹّی سے تو بنا ہے، اس میں تجلّی کا ذوق پوشیدہ ہے۔

مطلب یہ کہ انسان صرف فہم وادراک اور عقل ودانش سے کام لینے کا خواہاں رہتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اپنے دل کو خدائی جلووں سے روشن کرے۔ اس کے اندر عشق حق پیدا ہو، حالانکہ خدا نے اسے یہ خصوصیت بھی دی ہے اور عشق حق کے بغیر فہم وادراک سے صحیح کام بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) جو آنکھ یورپی تہذیب کے سرمے سے روشن ہو، وہ ہوشیار، مکّار اور سخن ساز تو ہو گی، لیکن اس میں آنسو کبھی نہ آئیں گے، جو دل کے سوز و گداز سے پیدا ہوتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ فرنگی تہذیب دنیاداری کے مکروفن تو سکھا سکتی ہے لیکن دلوں میں سوز و گداز پیدا نہیں کر سکتی اور سوز و گداز کے بغیر انسان حقیقی انسانیت کا رتبہ نہیں پا سکتا۔

(۴) صوفی اور ملّا کو میرے جنون کی کیفیت کیا معلوم؟ ان کے تو دامن کا سرا بھی چاک نہیں ہوا۔

مراد یہ ہے کہ صوفی اور ملّا کے دل پر عشق حق کی تڑپ سایہ بھی نہیں پڑا وہ کیا جانیں کہ اہل حق پر اس سلسلہ میں کیا گزر رہی ہے؟ دین حق کو کیا کیا

خطرے درپیش ہیں اور اس کی خدمت کے لیے کیسی کیسی قربانیاں درکار ہیں؟

(۵) میری خاک کب تک ستاروں کے نظام کی محکوم رہے؟ اب تو میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ یا میں نہ رہوں گا یا آسمان کی گردش نہ رہے گی۔

(۶) میں بجلی ہوں یا تو پہاڑوں پر گر سکتی ہوں یا بیابانوں پر۔ گھاس پھوس پر گرنا میرے شایان شان نہیں۔

(۷) دنیا صرف اس مومن کی میراث ہے، جو جان پر کھیل جائے۔ جو شخص حضرت رسول اکرم صلعم کے اوصاف حسنہ سے اپنے قلب و روح کو روشن نہ کرے اور اس طرح مقام لولاک سے فیضان نہ پائے، وہ مومن کہلانے کا حقدار نہیں۔

(۱۱)

رازی: معروف عالم و امام جن کی تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب) بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ "مباحث مشرقیہ"، "شرح اشارات"، "فوائد غیاثیہ" وغیرہ ان کی معروف تصانیف ہیں۔ فخر الدین نام، رے (ایران کا مشہور قدیم شہر) میں پیدا ہوئے۔ سلطان غیاث الدین غوری ان کا بڑا معتقد تھا۔ ہرات میں وفات پائی۔

عہد عتیق: پرانا زمانہ۔ اقرار باللسان: زبانی اقرار۔

تصدیق: لفظی معنی کسی چیز کے صحیح اور سچا ہونے کی تائید کرنا۔ یہاں اس سے مراد تصدیق بالقلب ہے اس لئے کہ یہ اقرار باللسان کے مقابلہ پر آیا ہے۔ تصدیق بالقلب سے مراد ہے سچائی کی دل سے تصدیق و تائید۔

زندیق: بے دین، ملحد۔

(۱) خدا مست درویشوں کا طریقہ ابتدا ہی سے یہ رہا ہے کہ خواہ کتنی ہی تکلیفوں کا سامنا ہو، کتنے ہی خطرات ہجوم کر آئیں، لیکن ان کی زبان ہمیشہ دلی خیالات کا آئینہ ہوتی ہے، یعنی وہی کہتے ہیں، جسے ان کا دل حق سمجھے۔ جان بچانے یا خطرات سے بچنے کے لئے خلاف حق بات زبان پر نہیں لاتے۔

اس کائنات میں جتنے اہل حق گزرے ہیں، ان کا عام شیوہ اور طریقہ یہی رہا ہے۔ انہوں جانیں دے دیں، گھر بار لٹا دیئے، مگر حق کا دامن نہ چھوڑا۔

(۲) شراب خانے میں لوگوں کی کثرت کیوں ہے؟ کیوں سب اسی طرف بھاگے دوڑے چلے آ رہے ہیں؟ محض اس لئے کہ شراب خانے کا مالک بہت خوش اخلاق ہے۔

اس شعر میں جو بنیادی نکتہ بیان کیا گیا ہے، وہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ قرآن حکیم میں تبلیغ حق کے بڑے اصول تین بتائے گئے ہیں: اول حکمت یعنی دانائی کی پکی باتیں اس انداز میں کہنا کہ سننے والے کے دل میں اترتی چلی جائیں۔ دوسرا موعظہ حسنہ، نصیحت کی باتیں حسن و خوبی سے کہنا، تیسرا اگر کہیں بحث کی ضرورت پیش آ جائے تو نہایت اچھا طریقہ اختیار کرنا جس سے بحث کرنے والے کا دل سچائی پر یقین کے لئے کھل جائے۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنی بات کی پچ کرتے کرتے الٹا راستہ اختیار کر لے۔ قرآن نے خود رسول پاک صلعم کی ایک بڑی خصوصیت یہ بیان کی آپ دل کے نرم ہیں اور اسے اپنی رحمت قرار دیا: فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا انفضوا من حولك (سو یہ اللہ ہی کی رحمت ہے کہ تو انہیں نرم دل ملا،

اگر تو بدخو سخت دل ہوتا تو تیرے ارد گرد سے یہ تتر بتر ہو جاتے) تبلیغ کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ سچائی دوسروں کے دل میں اتر جائے۔ اس کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ تبلیغ میں انتہائی حسن اخلاق سے کام لیا جائے۔ دیکھئے استاد بچوں کو پڑھاتا ہے تو بھولا ہوا سبق بار بار یاد دلاتا ہے، انتہائی شفقت سے کام لیتا ہے تاکہ بچوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو۔ تبلیغ کے لئے اس سے بدرجہا زیادہ شفقت اور حسن اخلاق کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اس شعر میں یہی حقیقت بیان کی ہے، محبت کے شراب خانے میں لوگ اسی لئے زیادہ زیادہ جاتے ہیں کہ شراب پلانے والا خوش اخلاق ہے۔ دعوت حق کے لئے کام کرنے والے ہر شخص کا فرض یہی ہے کہ نرمی، ملائمت اور خوش اخلاقی سے کام لے خواہ وہ مولوی ہو یا واعظ، صوفی ہو یا درویش۔ محبت اور شفقت ہی لوگوں کو کھینچ کر اس کے پاس لا سکتی ہے۔

(۳) امام رازی اگرچہ بہت بڑے عالم اور امام ہیں، انہوں نے تفسیر میں نہایت عجیب اور باریک نکتے پیدا کئے ہیں، لیکن ان نکتوں سے ضعف یقین کا علاج نہیں ہو سکتا۔

مراد یہ ہے کہ دماغ کو حیران کر دینے والی نادر باتیں دل میں ایمان کی قوت نہیں پیدا کر سکتیں۔ یہ کام عشق حق ہی انجام دے سکتا ہے اور وہ علمی باریکیوں کا محتاج نہیں۔

(۴) مرید تو سیدھا سادہ تھا۔ جب اس نے پیر کی زبان سے سنا کہ گناہوں سے توبہ کرو تو اس بیچارے نے رو رو کر توبہ کر لی۔ میری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ!

پیر کو بھی توبہ کرنے کی توفیق بخشے، اس لئے کہ اس کے طور طریقوں میں کوئی
تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

اس شعر میں آج کل کے پیروں کی عام کیفیت بیان کی گئی ہے کہ
وہ مریدوں سے توبہ کراتے ہیں اور اپنے عمل درست کرنے کی طرف متوجہ
نہیں ہوتے۔ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند۔

(۵) انسان ابھی تک پرانے طلسم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور اس نے
اپنی بغل میں قدیم زمانے کے بت چھپا رکھے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ جن امتیازات نے انسانوں کو طرح طرح کی مصیبتوں
میں الجھایا، وہ اب تک باقی ہیں۔ اور جگہ جگہ ان کی پوجا ہو رہی ہے۔ مثلاً
نسل اور رنگ کا امتیاز، خاندان اور قبیلے، قومیت اور وطنیت کی لعنت،
یہ امتیازات مٹ جاتے تو آج انسانوں میں عالمگیر برادری کا جذبہ بہت
نمایاں ہوتا اور امن عالم کے خواب کی تعبیر نکل آتی۔

(۶) میرے لئے تو اسلام کا زبانی اقرار کر لینا ہی بہت بڑا کام ہے۔ ملّا کو
شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسے دلی تصدیق کا درجہ بھی مل گیا ہے۔

یہ حقیقت میں ملّاؤں پر طنز ہے۔

(۷) اگر انسان کا دل عشق حق سے لبریز ہو تو کفر بھی اسلام بن جاتا ہے۔
لیکن عشق حق نہ ہو تو مسلمان کو بھی کافر بے دین اور ملحد سمجھنا چاہیے۔

مراد یہ ہے کہ اسلام عربی زبان کے چند کلمے زبان سے کہہ دینے کا
نام نہیں۔ ضروری ہے کہ یہ دین حق جو احکام لایا، ان پر کاربند ہونے اور

ساری دنیا تک پہنچانے کی دلوں میں سچی تڑپ موجود ہو۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں لاہور جاؤں گا تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ لاہور کا رستہ اختیار کرے اور جو بھی ذریعہ ہاتھ آئے اس سے کام لے کر منزل مقصود پر پہنچ۔ ایسا نہ کرے گا تو لاہور جانے کا دعویٰ بالکل باطل ہوگا۔ یہی کیفیت دین کی ہے۔ جب تک اس پر عمل کرنے اور کرانے کا سچا جذبہ موجود نہ ہو، اس کا دعویٰ ہیچ ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا عشق حق کی سچی تڑپ موجود ہو تو جس شے کو ظاہر میں کفر کہتے ہیں، اسے بھی حقیقتہً اسلام سمجھنا چاہیئے تڑپ موجود نہ ہو تو نام کے مسلمان اور کام کے ملحد و بے دین میں حقیقتہً کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۴)

کور نگاہی: اندھاپن۔

(۱) تو اپنے متعلق فطرت سے گواہی لے لے۔ اس کی گواہی سچی ہوتی ہے۔ وہی تجھے بتا سکتی ہے کہ تو سیدھے راستے پر جا رہا ہے یا اس سے بھٹک گیا ہے۔

یہاں فطرت سے مراد دل کی گواہی اور اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اپنے دل سے فتویٰ طلب کر۔ انسان خلوص سے دل میں سوچے تو خود معلوم کر لے گا کہ اس کا عمل دینی مقاصد کے مطابق ہے یا نہیں۔

(۲) مسلمان اگر نام کا مسلمان ہے اور اس نے کافروں کے طور طریقے اختیار کر رکھے

ہیں تو اسے نہ بادشاہی کی نعمت مل سکتی ہے، نہ درویشی کی۔ نہ وہ دنیا کی عزت حاصل کر سکتا ہے، نہ دین کی۔ اگر وہ صاحب ایمان ہو تو درویشی کی حالت میں بھی اسے بادشاہوں کی سی شان حاصل ہوتی ہے۔

(۳) مسلمان اگر صرف نام کا مسلمان ہے اور عملاً کافر تو تلوار پر اس کا بھروسا ہوتا ہے، یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ دنیا سے لڑنے کے لئے وسیع ساز وسامان مہیا کرلے اور اس کے بغیر لڑنے کا اسے حوصلہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ اصلی معنی میں صاحب ایمان ہے تو تلوار کے بغیر بھی جنگ کرتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ مومن کا بھروسا ساز وسامان پر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی حقانیت کے بھروسے پر پوری دنیا کے مقابلے پر آتا ہے اور حقانیت کی برکت سے کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے۔

(۴) اگر مسلمان صرف نام کا مسلمان ہے تو وہ اپنے آپ کو تقدیر کا پابند بنا لیتا ہے۔ اگر وہ حقیقی معنی میں صاحب ایمان بن جائے تو اس کی ذات بجائے خود اللہ کی تقدیر ہوتی ہے۔

تقدیر کا پابند بنا لینے سے مراد یہ ہے کہ خود جد وجہد نہیں کرتا، ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے، اسے خدا کی تقدیر مان کر بیٹھا رہتا ہے حالانکہ خدا کی تقدیر کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسانی جد وجہد کی کوئی حد نہیں، پھر وہ کیوں برابر کوشش میں نہ لگا رہے؟ دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو بہادر اور جوانمرد میدان جنگ میں نکل آتے ہیں اور اپنی تمام قوتیں بے دریغ صرف کر کے دشمن پر فتح پاتے ہیں۔ تاریخ اس کے

کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ جو بزدل اور بے ہمت تھے، وہ کچھ بھی نہ کر سکے اور تاریخ میں ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں۔ مومن کی شان یہی ہے۔ وہ اپنی جد وجہد میں ایسا کمال پیدا کر لے کہ خود خدا کی تقدیر بن جائے، اس لئے کہ تقدیر جوشِ عمل کے نتائج کا نام ہے، اس لئے کہ مومن ہر کام رضائے باری تعالیٰ کے مطابق کرتا ہے۔ اس لئے اسے خدا کی تقدیر قرار دینا بالکل درست ہے۔

(۵) میں نے تو بھیدوں کا پردہ چاک چاک کر کے رکھ دیا اور ہر حقیقت کھول کھول کر بیان کر دی لیکن اے مخاطب! میں کیا کروں، تیرے اندھے پن کی بیماری بہت ہی پرانی ہو چکی ہے۔ یہ دور نہیں ہوتی اور تو کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ یہاں اندھے پن سے مراد آنکھوں کا نہیں، دل کا اندھا پن ہے۔

(۱۳)

اقبالؔ نے خود فرمایا کہ یہ شعر قرطبہ[۵] میں لکھے گئے۔

(۱) یورپ کی حوریں جن کے حسین و جمیل چہرے دیکھ کر لوگ تڑپ جاتے ہیں، یہ دراصل دل اور نظر دونوں کو راہ حق سے دور پھینک دینے والی ہیں۔ یورپ بظاہر واقعی ایک بہشت ہے، لیکن اس کے جلوے رکاب میں پاؤں رکھے تیزی سے اڑے چلے جا رہے ہیں، یعنی ان میں پائداری اور ثبات بالکل نہیں، اس لئے کہ ان کی ساری کشش و جاذبیت صرف نمائشی ہے۔

(۲) یہ چاند اور تارے وجود کے سمندر میں بھنور کی حیثیت رکھتے ہیں،

---

[۵] قرطبہ اسلامی اندلس کا دار الحکومت تھا۔ جہاں اقبال ۱۹۳۲ء میں گئے تھے۔ اس شہر کے مفصل حالات جامع قرطبہ والی نظم میں ملیں گے۔

تو اپنے دل اور نظر کی کشتی کو ان سے بچاتا ہوا لے چل۔

مراد یہ ہے کہ کائنات کی جتنی چیزیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی انسان کا مقصود نہیں بن سکتی۔ یہ تو اس کا راستہ روکنے والی چیزیں ہیں۔ اگر زندگی کو ایک سمندر فرض کر لیا جائے تو یہ تمام چیزیں اس کے بھنور ہیں۔ جو کشتی بھنور میں پھنس جائے، وہ باہر نہیں نکل سکتی اور اس کا سفر جاری نہیں رہ سکتا۔ انسان کا مقصودِ حقیقی ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں۔ اسے ہر شے سے دامن بچائے ہوئے مقصود ہی کی طرف بڑھنا چاہیے۔

(۳) چنگ و رباب کے نغمے میں ازل سے ایک ایسی مخفی تاثیر رکھ دی گئی ہے جو سمجھ میں نہیں آسکتی اور وہ آواز و آہنگ کی دنیا میں نہیں سما سکتی یعنی اس تاثیر کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چنگ و رباب کے نغموں کی یہ غیر معمولی تعریف غالباً اس لئے کی گئی کہ شعر قرطبہ میں لکھے گئے تھے اور اہلِ ہسپانیہ گانے بجانے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ اور اس کے بہت شائق ہیں۔

(۴) صوفیوں نے خانقاہوں کے سلسلے شروع کئے اور انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی، جسے دیکھ کر ملّاؤں اور عالموں نے بھی وہی طریقے اختیار کر لئے۔ گویا اسلام کے علمائے شریعت اور پیرانِ طریقت دونوں حقیقت سے خالی ہو گئے۔ اقبالؔ کی رائے یہ ہے کہ پیرانِ طریقت نے علمائے شریعت کو بھی اپنے طریقوں پر لگا کر برباد کر دیا۔

(۵) نتیجہ یہ نکلا کہ آج مسجدوں کے منبر اور محراب ان سجدوں کو ترس رہے ہیں،

جن سے زمین کی روح کانپ جاتی تھی یعنی علمائے شریعت کی وہ شان ہی نہ رہی جس کی برکت سے ان کے سجدے زمین کو لرزا دیتے تھے۔

(۶) میں مصر بھی گیا اور فلسطین بھی، لیکن وہ اذان کہیں نہیں سنی جس نے کسی زمانے میں پہاڑوں کو پارے کی طرح بےتاب و بےقرار کر دیا تھا۔

(۷) اے قرطبہ کی ہوا! شاید یہ تیرا ہی اثر ہے کہ میرے نغموں میں جوانی کے عہد کا سوز و کیف پیدا ہو گیا۔

(۱۴)

فاروقی: حضرت فاروق اعظمؓ کے اوصاف و خصائص۔ کراری:

حضرت حیدر کرارؓ کے اوصاف و خصائص۔ مشام تیز: سونگھنے کی تیز قوت۔ ظن و تخمین: گمان اور اندازہ۔

(۱) جس انسان کا دل بیدار ہو جائے اس میں حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت حیدر کرارؓ کے اوصاف و خصائص کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ آدمی تانبا ہے، دل کی بیداری اس کے لئے کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے اور اس تانبے کو سونا بنا دیتی ہے۔

(۲) اے مسلمان! کہیں سے وہ دل پیدا کر جو بیدار ہو۔ جب تک دل سویا ہوا ہو، نہ تیرا وار کارگر ہو سکتا ہے، نہ میرا۔ یعنی جو مہم درپیش ہے اسے سر کرنے کے لئے لازم ہے کہ پہلوں میں جاگتا ہوا دل ہو، ورنہ تو یا میں یا کوئی اور اس مہم کو سر کرنے کی عزت نہیں پا سکتے۔

(۳) تاتار کے جنگل میں مشک نافہ والے ہرن کا کھوج لگانے کے لئے تیز

سونگھنے کی قوّت درکار ہے۔ یہ دولت محض گمان اور اندازہ سے نہیں مل سکتی۔ مراد یہ ہے کہ حقیقی مقصود تک پہنچنے کے لئے اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں درکار ہیں، جو ٹھیک ٹھیک بتا سکیں کہ وہ کہاں ہے اور کیونکر مل سکتا ہے؟ یہ منزل گمان اور اندازے کی بنا پر طے نہیں ہو سکتی۔

اقبال نے مشام تیز کی ترکیب غالباً نظیری سے لی ہے، جس کا یہ مشہور شعر انہیں بہت پسند تھا:

نہ ہر مغز ے ببوئے نکہت از مصر و یمن گیرد
مشام تیز تا ید تا نصیب از زیرِ چین گیرد

فرمایا کرتے تھے کہ کئی مرتبہ اس پر غزل لکھنے کا خیال آیا لیکن مطلع دیکھ کر اسے ترک کر دیا۔

(۴) میں اس اندیشے کی بنا پر کب تک اپنی آہ کو روکے بیٹھا رہوں۔ کہ آہ کی تو آتش پرستوں کی اولاد تیری قسمت کی چنگاری اڑا کر نہ لے جائے۔

مطلب یہ ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں، اس میں قوموں کے لئے زندگی کا سامان ہے۔ میں نے ایک وقت تک تو یہ باتیں ضبط کئے رکھیں کہ مسلمانوں میں احساس پیدا ہو جائے اور وہ اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیں۔ غیر مسلم ہوشیار ہو کر مسلمانوں کی قسمت کے سرمایے پر قبضہ نہ کر لیں۔ لیکن اس اندیشے اور فکر کی بنا پر کب تک چپ بیٹھا رہوں؟ اب مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ دینا چاہتا ہوں، خواہ مسلمانوں کے بجائے دوسرے ہی اس سے مستفید ہو جائیں۔ اس شعر میں بھی دراصل مسلمانوں کے اندر احساس پیدا کرنے کی

غرض سے نیا اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔

(۵) اے خدا! تیرے سادہ لوح اور بھولے بھالے بندے کیا کریں اور کدھر جائیں؟ کہ موجودہ زمانے میں درویشی بھی سراسر دھوکا اور فریب ہے اور بادشاہی بھی دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔ درویش بھی مریدوں کو لوٹ رہے ہیں اور بادشاہوں کا کام بھی رعایا کو لوٹنے کے سوا کچھ نہیں۔ حالانکہ درویش خدا کا راستہ دکھانے کے دعوی دار ہیں اور بادشاہ رعیت کی حفاظت اور بہبودی کے ذمہ دار ہوتے ہیں لیکن دونوں نے اپنے حقیقی فرائض بھلا دیئے ہیں۔

(۶) آج کل کی تہذیب نے جو آزادی بخشی ہے، وہ صرف ظاہر میں آزادی ہے، باطن میں اسے آزادی نہیں قید و بند سمجھنا چاہیے۔

مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو بظاہر قید سے آزادی دے دی ہے اخلاق و مذہب کی کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ باطن بالکل تباہ ہو جائے۔ ایمان و اخلاق کا کوئی جوہر ان میں باقی نہ رہ جائے اور یہی ہوا۔

(۷) اے شراب کے آقا و مولا! اے حضرت رسول اکرم صلعم! آپ بہ نفس نفیس میرا علاج فرمائیں۔ میں نے جو علم حاصل کیا، وہ سراسر یورپی ہے اور میرا ایمان ایسا ہے جس کے دوش پر زنار بندھا ہوا ہے، یعنی وہ کافروں جیسا ہے۔

(۱۵)

غیاب: غائب ہونا، غیر حاضر ہونا۔ زبور عجم: اقبال کی مشہور فارسی تصنیف۔

(۱) خودی اگر کبھی شوخ اور تند بھی ہوتی ہے، تو اس میں غرور اور ناز نہیں

پایا جاتا کبھی کسی کو ناز کا احساس بھی ہو تو وہ ناز بھی نیاز کی لذت سے خالی نہیں ہوتا۔

مراد یہ ہے کہ اہل حق پیغام حق پہنچانے میں کبھی اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کرتے۔ اگر کبھی ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو عام لوگوں کے نزدیک ناز کی حیثیت رکھتی ہو تو غور کرنے پر اس میں بھی نیاز ہی کا پہلو غالب نظر آئے گا۔

(۲) عشق کی نگاہ ایسے دل کی تلاش میں ہے، جو زندگی کی روح سے لبریز ہو۔ عشق کی حیثیت شہباز کی ہے اور شہباز کے لئے زیبا نہیں کہ مردہ پرندے کا شکار کرے۔

(۳) میرے نغمے میں اس لئے دل فریبی کی کوئی ادا نہیں کہ حضرت اسرافیلؑ کے صور کی آواز میں دل نوازی اور دل آویزی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا یعنی میں اسی طرح مردہ دلوں کی زندگی میں روح پھونک دینا چاہتا ہوں جس طرح قیامت کے دن صور اسرافیلؑ سے تمام مردے زندہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا میرا نغمہ دلوں کو کیونکر لبھا سکتا ہے؟

(۴) میں یورپ کے ساقی سے شراب نہیں مانگ سکتا، پاک باز رندوں کا یہ طریقہ نہیں کہ غیروں سے شراب مانگیں اور ظاہر ہے کہ یورپ کا ساقی وہ شراب نہیں دے سکتا جس کی طلب پاک بازوں کو ہے۔

(۵) دنیا میں عشق کی حکومت کبھی عام نہیں ہوئی اور اسے عالم گیری نہیں ملی۔ کیوں؟ اس لیے کہ عمومیت اور عالم گیری زمانہ سازی پر موقوف ہے

اور عشق کا دامن اس بالکل پاک ہے، وہ کبھی زمانہ سازی نہیں کر سکتا۔

(۶) دوسرے لوگ میری محبت کی کہانی کو کتنا ہی پھیلا دیں، میں خود بیان کروں تو وہ لمبی نہیں۔ صرف دو لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے کہ مجھے محبوب کی حضوری حاصل ہو یا جدائی، وصال ہو یا فراق، ایک لگاتار بے قراری مجھ پر طاری رہتی ہے۔

(۷) اگر تجھ میں ذوق کا کوئی جوہر موجود ہے تو تنہائی میں میری کتاب زبور عجم پڑھا کر۔ اس کی حیثیت اس آہ و فریاد کی ہے جو آدھی رات کے وقت کی جاتی ہے اور ایسی آہ و فریاد رانگی باتوں سے خالی نہیں ہوتی۔

(۱۶)

ہرف: نشانہ۔ لاتخف: لفظی معنی نہ ڈر۔ اشارہ ہے سورہ قصص کے اس بیان کی طرف جس میں فرمایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو وادی ایمن کے کنارے کی بابرکت زمین کے درخت سے صدا آئی کہ اے موسیٰؑ! میں جہانوں کا پالنے والا خدا ہوں۔ وان الق عصاک فلما رأھا تھتز کانھا جان ولّی مدبرا ولم یعقب یاموسیٰ اقبل ولا تخف انک من الآمنین (قصص) (اور یہ کہ تو اپنا عصا ڈال دے پھر جب اسے سانپ کی طرح لہراتا ہوا دیکھا تو دیکھا تو حضرت موسیٰؑ منہ پھیر کر بھاگ گئے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ہم نے کہا، اے موسیٰؑ! اسلئے آ اور ڈر نہیں۔ بے شک تو امن پائے ہوؤں سے ہے یعنی تجھے کوئی خطرہ نہیں۔)

(۱) سپہ سالار نالائق ہے لشکریوں کی صفیں درہم برہم ہیں۔ افسوس

اس آدھے کھچے ہوئے تیر جیسی جس کا کوئی نشانہ نہ ہو۔

آخری مصرع کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ پہلا بالکل صاف اور واضح ہے کہ لشکر اور سالار کی حیثیت ایک تیر کی ہے جس کا کوئی نشانہ ہونا چاہیئے، لیکن جس لشکر کی صفیں درہم برہم ہوں اور سالار فرائض منصبی بجا نہ لا سکتا ہو، وہ تیر تو بے شک ہے، لیکن ایسا آدھا کھچا ہوا تیر ہے جو کبھی نشانہ پر نہیں پہنچتا۔

دوسرا مفہوم جسے اقبال کی داعیانہ حیثیت سے زیادہ مطابقت ہے یہ ہے کہ میں لشکر کو اپنی دعوت دینے کے لیے تیار تھا لیکن اس کی ابتر یہ سالار کی غیر شایاں حیثیت دیکھ کر میری دعوت کا تیر آدھا کھچا رہ گیا یعنی سوچا تو تھا کہ اس تک اپنی دعوت پہنچاؤں لیکن کیفیت دیکھ کر حوصلے نے جواب دے دیا۔ ارادہ مضمحل ہو گیا۔ اس کی حیثیت تیر نیم کش کی ہو گئی ہیں تو ناوک فگن ہوں، مگر تیر کیا چلاؤں جب نشانہ ہی موزوں نہ ہو۔

(۲) تیرے سمندر میں زندگی کا کوئی موتی موجود نہیں۔ میں ایک ایک لہر میں پھر پھر کر ڈھونڈ چکا اور ایک ایک سیپی کا منہ کھول کھول کر دیکھ چکا۔

یہ مسلمانوں کی عام حالت کا ماتم ہے۔

(۳) اے مسلمان! تو غیر اللہ کے تمام بتوں سے کنارہ کر لے اور اپنی خودی کے سمندر میں غوطہ لگا۔ ان بتوں کے عشق میں کیوں محنت و مشقت اٹھا رہا ہے اور بت خانے کے نقش و نگار میں اپنے جگر کا خون کیوں ضائع کر رہا ہے؟

(۴) میں موت اور عشق کے مقام کا بھید کھول کر کیا کروں؟ بس یہ سمجھ لے کہ عشق عزت کی موت کا دوسرا نام ہے اور موت یہ ہے کہ انسان بے عزتی

کی زندگی بسر کرے۔

(۵) حضرت پیر رومؒ کی صحبت سے یہ بھید مجھ پر کھلا کہ گریبان میں سر ڈال کر غور و فکر کرنے والے لاکھوں فلسفی وہ کام انجام نہیں دے سکتے جو ایک جانباز کلیم کے ذریعے سے انجام پا سکتا ہے۔ مسلمان کا کام فلسفیانہ موشگافیاں نہیں بلکہ پیغام حق دنیا کو پہنچانے کے لئے مجاہدانہ جانبازی درکار ہے۔

(۶) اگر کوئی شخص آج بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح باطل کے خلاف جہاد کے لئے تیار ہو جائے تو طور کے درخت سے اب بھی "لن ترانی" کی صدا سن سکتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ خدا نے باطل کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے جو قانون بنا دیا، وہ اپنی جگہ قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ خدا انہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ باطل کے خلاف جنگ کے لئے کوئی بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح تیار ہو جائے تو خدا کی مدد سے وہ کامیابی کی منزل پر پہنچے گا۔

(۷) یورپ کے علم و حکمت کا جلوہ میری نگاہوں چکا چوند پیدا نہ کر سکا، اس لئے کہ میری آنکھوں میں مدینہ منورہ اور نجف اشرف کی خاک کا سرمہ لگا ہوا تھا۔ یعنی میں نے اس طریق حق سے فیض حاصل کیا ہے جو حضرت رسول اکرم صلعم اس دنیا میں لائے اور جس کے فیضان کا ایک کرشمہ حضرت علیؓ تھے۔

(۱۷)

اقبالؔ خود وضاحت فرماتی ہے کہ یہ شعر یورپ میں لکھے گئے اور وہ ۱۹۳۳ء کے موسم سرما ہی میں یورپ گئے تھے۔

سواد: گرد و نواح۔

(۱) موسم سرما کی ہوا اگرچہ تلوار کی طرح تیز تھی لیکن لندن میں بھی میں نے بہت سویرے اٹھنے کے طور طریقے نہیں چھوڑے۔

اقبال بہت کم سوتے تھے اور بہت سویرے اٹھنے کے ابتدا سے ہی عادی تھے، اسی لئے انہوں نے کہا کہ تیز سردی کے باوجود میں معمول کے مطابق لندن میں بھی منہ اندھیرے ہی اٹھتا رہا۔

(۲) کسی جگہ میں کھل کر باتیں کرتا رہا اور میری گفتگو ہی گرمیٔ محفل کے لئے رونق کا سامان بنی رہی۔ کسی جگہ میرا ملنے جلنے سے دور رہنا سب کے لئے پریشانی کا باعث ہوتا رہا۔

یہ بھی واقعہ ہے۔ اقبالؔ نہ زیادہ پھرنا پسند کرتے تھے، نہ عموماً مجلسوں میں شرکت کے عادی تھے۔ البتہ جو ان کے پاس آجاتا اور وہ کچھ پوچھتا تو بڑی تفصیل سے جواب دیتے۔ لاہور میں ان کے قیام گاہ پر آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ کبھی نہ دیکھا گیا کہ انہیں کسی سے ملنا ناخوش گوار محسوس ہوا ہو۔ جو بھی آتا، اس سے بے تکلف ملتے اور جب تک وہ خود نہ اٹھتا، سلسلہ کلام منقطع نہ کرتے۔ لندن میں ملاقاتوں کے مروجہ آداب دوسرے تھے۔ اقبالؔ خود تو زیادہ باہر نہ نکلتے لیکن وہاں بھی جو ملنے کے لئے آجاتا، اس سے اسی

طرح بات چیت کرتے جس طرح لاہور میں کیا کرتے تھے۔

(۳) کاروبارِ حکومت کی باگ ڈور مزدوروں کے ہاتھ میں آجائے تو اس سے کیا ہوگا؟ کیونکہ کوہکن کے طریقے میں بھی شہنشاہ پرویز ہی کی حیلہ کاریاں نظر آتی ہیں۔

کوہکن یہاں مزدور کے ہم معنی ہے اور پرویزی شہنشاہی کے۔ اقبال مزدوروں کے طبقہ کی حکومتوں کا تماشا روس اور بعض دوسرے یورپی ملکوں میں دیکھ چکے تھے۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ صرف افراد بدلے اور حکومت کے طریقوں میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ رنگ پیدا نہ ہوا جس کی امید مزدوروں سے تھی۔ لہٰذا ان کے دل میں احساس پیدا ہوا کہ محض افراد کو بدل دینے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ ضرورت تو طرزِ عمل کے بدلنے کی ہے جس کی طرف انہوں نے اگلے شعر میں اشارہ کیا ہے۔

(۴) بادشاہی کا جاہ و جلال ہو یا جمہوریت کا تماشا یعنی طریق حکومت شخصی ہو یا عوامی اگر سیاست دین سے الگ کر دی جائے تو وہ محض چنگیزی رہ جاتی ہے جس میں ظلم و ستم، جور و جفا اور جبر و تشدد کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سیاست اسی صورت میں خلقِ خدا کے لئے راحت اور آسائش کا سامان بن سکتی ہے جب دین اس کی بنیاد و اساس اور روح رواں ہو، اس لئے کہ دین انسان کے اعمال کو ایک خاص دائرے میں رکھتا ہے اور ظلم کا کوئی امکان باقی نہیں چھوڑتا۔

(۵) روما کے گرد و نواح کو دیکھ کر دہلی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ یہاں بھی دہلی کی طرح جابجا کھنڈر موجود ہیں، جنہیں دیکھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے

یہاں بھی عظمت و برتری کا وہی نقشہ نظر آتا ہے، جس سے دہلی میں قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ پھر اس پرانے شہر میں دہلی ہی کی شان دل کشی موجود ہے۔

(۱۸)

ہفتاد و دو ملت: لفظی معنی بہتّر فرقے۔ مراد ہے بہت سے فرقے۔

فلک الافلاک: آسمانوں کا آسمان یعنی عرش۔

(۱) یہ ویرانہ جہت خانہ یعنی دنیا کیا ہے؟ گھاس پھوس کا ڈھیر ہے۔ اس میں سے آگ لگا دینے والی فریاد کے بغیر گزرنا مشکل ہے۔

مراد یہ ہے کہ دنیوی تعلقات قدم قدم پر انسان کے دامن سے کانٹوں کی طرح لپٹ جاتے ہیں وہ جب تک انہیں جلا کر خاک نہ کر دے، آگے نہیں بڑھ سکتا اور زندگی کی اصل مراد نہیں پا سکتا جلانے کے لئے آگ کی ضرورت ہے اور وہ اس نالہ و فریاد ہی سے لی جا سکتی ہے جو آگ کی طرح شعلہ افروز ہو۔

(۲) محبت کے شکار کی کہانی لمبی نہیں، صرف چند لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے۔ تیر لگا، اس کی خلش سے لذت حاصل کی۔ پھر شکار بند میں بندھ کر آرام اور چین پا لیا۔

(۳) جو حقیقت فرقہ بندیوں میں گم ہو گئی، اسے تو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا، جب تک تیرا فہم و ادراک فرقہ بندیوں کے داغ دھبوں سے پاک نہ ہو جائے۔

(۴) ایک شے اسلامی شریعت ہے، ایک شے اسلامیت کا جذب و عشق ہے۔ یہ جذب و عشق عرش کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔

(۵) اے ہوشمند سالک! اسلامی جذب وعشق کے بغیر نہ عمل کا راستہ مل سکتا ہے، نہ یقین کی شاخ تر و تازہ رہ سکتی ہے۔ یعنی یقین و عمل دونوں چیزیں اسلامی جذب وعشق کا نتیجہ ہیں۔

(۶) گستاخی اور بے باکی محبت کی رمزیں ہیں ہر عشق گستاخ نہیں ہوسکتا اور ہر جذب بے باکی پیدا نہیں کرسکتا۔

مراد یہ ہے کہ انسان میں جب تک سچا عشق الٰہی پیدا نہ ہوجائے، اس میں رندو بے باکی نہیں آسکتی۔ یہی عشق ہے جو انسان کو اپنے گھربار، اہل وعیال، خانماں سے بے پروا بنادیتا ہے۔ بڑی بڑی قوتوں کے مقابلے میں بے خوفی سے ڈٹ جاتا ہے۔

(۷) میری دیوانگی قیامت میں بھی نچلی نہ بیٹھے گی۔ یا تو میں اپنے گریبان کے پرزے اڑادوں گا یا خدائے پاک کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا یعنی عشق کا جوش جنوں قیامت کے دن بھی وہی رنگ دکھاتا رہے گا جو دنیا میں دکھاتا رہا ہے۔

(۱۹)

مہجوری: جدائی، علیحدگی۔ اہل حلقہ: یہ تصوف والوں کی اصطلاح ہے اس لئے کہ وہ کسب فیض کی غرض سے پیرومرشد کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں۔ ملتفت، متوجہ، مہربان۔

(۱) آسودگی یعنی دنیا سے علیحدگی اختیار کرلینا ترک کا انتہائی مقام نہیں۔ انتہائی مقام یہ ہے کہ خاکی یا نوری جو کچھ بھی اس کائنات میں نظر آتا ہے،

اسے مسخر کر لیا جائے۔

عام لوگوں کے نزدیک اسی کو کمال سمجھا جاتا ہے کہ دنیا سے علحدہ ہو کر انسان بنوں اور جنگلوں میں ڈیرے ڈال دے۔ اسے ترک نہیں کہ سکتے۔ اس لئے کہ ترک عزم چاہتا ہے۔ یہ تو دنیا سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ جانا ہوا اس میں کمال کونسا ہے؟ ترک حقیقت میں یہ ہے کہ خدا نے خاکی اور نوری جتنی چیزیں بنائی ہیں، انسان ان کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے، انہیں اپنے قبضہ میں کر لے۔ بایں ہمہ ان سے کوئی تعلق اور سروکار نہ رکھے۔ اس کا حقیقی معبود صرف وہ پاک ذات ہو، جو تمام محبوبیتوں کا مرکز ہے۔

(۲) اے تصوف والو! میں ایسی درویشی سے دور ہی اچھا جیسی تم لوگوں نے اختیار کر رکھی ہے۔ اس درویشی کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کہ اس میں کسی قسم کی برکت نہیں پیسوں کے لئے دوسروں کی محتاج ہے اور اس کی عام کیفیت ایک بیمار کی سی ہے۔

(۳) وہ قوم نہ درویشی کی اہل سمجھی جا سکتی ہے، نہ بادشاہی کی جس نے اپنی نالائقی سے وہ بیش بہا سرمایہ ضائع کر دیا، جو تیمور کے جانشینوں نے چھ پشتوں میں حاصل کیا تھا۔

تیموری متاع سے یہاں وہ سلطنت مراد نہیں، جو خود تیمور نے حاصل کی تھی۔ یہ اشارہ مغلیہ سلطنت کی طرف ہے، جو کابل و قندھار سے ارکان تک اور تبت سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کے ماتحت ہندوستان نے پہلی مرتبہ ایک جغرافیائی وحدت کی صورت اختیار کی۔ اس سلطنت کی

تعمیر کے لئے بابر سے عالمگیر تک تیموریوں کی چھ پشتیں لگاتار جدوجہد کرتی رہیں۔ ۱۷۰۷ء میں عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو دس پندرہ سال میں اس سلطنت کی بنیادیں بے طرح ہلنے لگی تھیں۔ مزید دس پندرہ سال گزرنے پر یہ عملاً ختم ہو گئی تھی۔ اقبال کہتے ہیں کہ جس قوم نے یہ عظیم الشان متاع اس آسانی سے ضائع کر دی۔ قدرت کی کارگاہ میں وہ قوم کس بنا پر بادشاہی یا درویشی کی اہل سمجھی جا سکتی ہے؟ اس لئے کہ نہ اس میں زورِ بازو رہا جو سلطنت کی حفاظت کے لئے لازم تھا اور نہ اسے دلوں پر تسلط رہا جو درویشی کا خاصہ ہے۔

(۴) اگر چاند جیسے چہرے والے ساقی کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچے تو اور بھی اچھا۔ میں نے شراب پینے سے معذرت کا جو اظہار کیا، وہ دراصل گرمیٔ محفل کی ایک کسوٹی تھا۔

مراد یہ ہے کہ ساقی نے مجھ پر اتنی نوازشیں فرمائیں اور اتنی مہربانیاں کیں کہ میرے ذوق کی انتہائی تسکین ہو گئی، یہاں تک کہ مجھے مجلس میں جام شراب پیش کیا تو میں نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ یہ معذوری کم ذوقی یا بے کیفی کا ثبوت نہ تھی بلکہ ساقی کی انتہائی نوازشوں کی دستاویز تھی حقیقت یہی ہے لیکن ساقی کے کان تک یہ بات نہ پہنچے تو اور بھی اچھا ہے تاکہ اس کی نوازشیں بہ دستور جاری رہیں۔

(۵) اہل فلسفہ، اہل معرفت اور اہل تصوف سب اس کوشش میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ذات پاک کا جلوہ انہیں نظر آئے لیکن ان میں سے کسی کو خبر نہیں

کہ جسے وہ تجلی سمجھتے ہیں، وہ تو بجائے خود مستوری ہے۔

مراد یہ ہے کہ ذاتِ پاک کو کوئی بے حجاب نہیں دیکھ سکتا۔ جسے جلوہ سمجھا جاتا ہے، وہ بھی ایک طرح کا پردہ ہی ہے۔

(۶) اگر محبوب مہرباں ہو تو پنجرے کا گوشہ بھی میرے لئے قید نہیں، آزادی ہے۔ اگر محبوب کی نظرِ عنایت نہ ہو تو پھر پنجرے کو چھوڑ کر باغ کی مجبوری کا ایک مقام ہو گا جیسا کہ قید خانہ ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب کی مہربانی ہو تو انتہائی مشکلات کی زندگی بھی عین راحت و آسائش بن جاتی ہے، مہربانی نہ ہو تو راحت و آسائش بھی مصیبت سے کم نہیں۔

(۷) بے شک میں کہتا ہوں کہ مغربی علوم سے اگرچہ دماغوں میں اک گونہ روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے عقل میں تیزی آجاتی ہے، لیکن دل لذتِ ایمان سے خالی ہو جاتا ہے اور یہ سراسر ویران بن جاتا ہے۔ تو میرے اس قول کو سوچے سمجھے بغیر نظر انداز نہ کر اور نہ مان، تجربہ کر کے خود اس کی سچائی کو آزما کر دیکھ۔

(۲۰)

(۱) عقل اگرچہ محبوب کے آستانے سے قریب ہی ہے، دور نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے محبوب کی بارگاہ میں حضوری کا درجہ نہیں مل سکتا۔ اس نوازش سے اس کی تقدیر کا خانہ خالی ہے۔

شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اقبال کا مدعا یہ ہے کہ دلیلوں سے بھی

کام لے کر انسان منزلِ محبوب کا پتا لگا لیتا ہے اور اس کے قریب پہنچ سکتا ہے، لیکن اس طرح حضوری کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۲) میں نے مانا کہ تیری آنکھ میں بصیرت کا نور ہے لیکن چاہیئے کہ خدا سے نورانی دل بھی طلب کرے جو حقائق کو دیکھ سکے۔ محض آنکھ کا نور دل کا نور نہیں بن سکتا۔

(۳) علم میں بھی ایک گونہ ذوق و شوق کی کیفیت موجود ہے، لیکن یہ ذوق و شوق صرف دماغ تک محدود رہتا ہے، دل تک نہیں پہنچتا۔ گویم علم ایسی بہشت ہے جو حور سے خالی ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو بہشت حور سے خالی ہو، اسے حقیقی معنی میں بہشت نہیں سمجھا جا سکتا۔

(۴) یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ موجودہ زمانے میں ایک بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا، جسے صاحب ذوق و شوق کہا جا سکے۔

(۵) ایک دیوانگی ایسی بھی ہے جس میں عقل و شعور اور ہوش و حواس قائم رہتے ہیں اور دیوانگی کے باوجود اسے منزل مقصود پر پہنچا دیتے ہیں ایک دیوانگی ایسی ہے، جس میں انسان ہوش و حواس اور عقل و شعور کھو بیٹھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اصل دیوانگی وہ ہے جس میں ہوش و حواس قائم رہیں اور یہ عشق حق سے پیدا ہوتی۔

(۶) بے صبری اور بے قراری درحقیقت دل کے زندہ ہونے کی دستاویز ہے۔ افسوس اس دل پر جو بے صبر و بے قرار نہیں۔

(۷) اے مخاطب! محبوب کے حضور میں باریابی سے محروم رہنا موت کے مرادف ہے، اگر تو زندہ ہو تو ناممکن ہے کہ محبوب کی بارگاہ میں حاضری سے محروم رہے

(۸) ہر موتی سیپی کو توڑ کر باہر نکل آیا۔ اے مخاطب! صرف تو ہے جس نے اپنے حقیقی جوہر نمایاں نہ کئے۔

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شے نے اپنی حقیقت نمایاں کر دی۔ انسان یہ فریضہ انجام نہ دے سکا دوسرا یہ ہے کہ ہر قوم اپنی زندگی کی متاع لے کر کائنات کے بازار میں پہنچ گئی۔ مسلمان اس زمانے میں اپنی برتری کے لئے کچھ نہ کر سکا۔

(۹) میں بھی اَرِنی کہہ رہا ہوں۔ یعنی یہ کہ اے خدا! تو مجھے اپنا جلوہ دکھا، لیکن اسے حضرت موسیٰؑ اور طور کا قصہ نہ سمجھنا چاہئے۔ یعنی میں یہ نہیں چاہتا کہ جلوہ دیکھوں اور بے ہوش ہو کر گر جاؤں۔ میری آرزو یہ ہے کہ جلوہ بھی نظر آئے اور اس کے دیکھنے کی تاب بھی بارگاہ الٰہی سے عطا ہو۔

(۲۱)

زجاج: شیشہ۔

(۱) خودی ایک ایسا بے پایا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اگر تو نے اسے اپنی کم نظری اور کم ہمتی سے ایک معمولی ندی سمجھ لیا تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

مراد یہ ہے کہ انسان کو خدا نے جو بے اندازہ قوتیں عطا کی ہیں، ان کا

حساب نہیں ہو سکتا لیکن انسان خود اپنی قوتوں کو محدود کر لے تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے۔

(۲) ہم پھونٹے والے گنبد یعنی آسمان کا طلسم توڑ سکتے ہیں۔ یہ شیشہ کی عمارت ہے سخت پتھر کی نہیں۔ ظاہر ہے کہ شیشہ کی عمارت آسانی سے توڑی جا سکتی ہے، البتہ سنگ خارا کے قلعوں کو توڑنا آسان نہیں۔

(۳) ہمت والے لوگ خود ہی ہیں ڈوبتے بھی ہیں اور اس کی تہ سے ابھر بھی آتے ہیں لیکن ناکارہ اور نکمے آدمیوں سے ایسے حوصلے کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔

(۴) ستاروں کو پہچاننے والا یعنی نجومی تیرے مقام اور مرتبے کے متعلق کچھ نہیں جان سکتا۔ تو تو ایک زندہ ہستی ہے اور ستاروں کے زیر اثر نہیں۔ جب ستاروں کے زیر اثر نہیں تو وہ شخص تیرے متعلق کیا جان سکتا ہے جس کا علم ستاروں تک محدود ہے۔

(۵) اس دنیا میں بہشت بھی ہے، حوریں اور جبرئیل بھی ہیں، لیکن تجھے ابھی تک نظر کی وہ شوخی اور دوربینی نصیب نہیں جو ان حقیقتوں تک پہنچ سکے۔

مراد یہ ہے کہ انسان حسن عمل سے اس دنیا میں جنت اور اس کی نعمتوں کے علاوہ خدا کا خاص قرب بھی حاصل کر سکتا ہے۔ کاش اسے حسن عمل کا یہ بلند مقام نصیب ہو سکے اور وہ اس کے نتائج و برکات کا اندازہ کر سکے۔

(۶) میرے جنون نے زمانے کے مذاق کو خوب پہچان لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے وہ لباس عطا ہوا جو پھٹا ہوا اور تار تار نہیں یعنی میں واقعی جنون عشق میں مبتلا ہوں۔ اگر میرے ظاہری طور طریقے پرانے زمانے کے دیوانوں اور جنونیوں جیسے

نہیں۔ وجہ یہ کہ میرے زمانے کا مذاق بالکل بدلا ہوا ہے۔

(۷) یہ کتنی عجیب بات ہے کہ فطرت بخشش کے اوج کمال پر پہنچ کر بھی بخل سے کام لیتی ہے۔ مثال کے طور پر لعل خالص کو دیکھو۔ سرخی کی شدت کے باعث وہ انگارہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے چنگاری کوئی نہیں اٹھتی۔

(۲۴)

(۱) صبح کی ہوا مجھے یہ پیغام دے گئی ہے کہ جن لوگوں کو خودی کی معرفت کا مرتبہ حاصل ہے یعنی جو اپنی ذات اور حقیقت کو بخوبی پہچانتے ہیں، وہ دنیا میں بادشاہی کرتے ہیں۔

(۲) خودی کی معرفت ہی سے تیری زندگی ہے۔ اسی سے تیری عزت ہے۔ خودی قائم رہے تو سمجھا جائے کہ تجھے بادشاہی مل گئی۔ قائم نہ رہے تو تیرے حصے میں روسیاہی، نامرادی اور ذلت کے سوا کچھ نہ آئے گا۔

(۳) اے فلسفی! تو نے مجھے منزل مقصود کا پتہ تو نہ بتایا۔ ہاں بھائی! تجھ سے کیا گلا ہو، نہ تو اس راہ میں بیٹھنے والا ہے، نہ چلنے والا۔

مقصد یہ ہے کہ فلسفی حقیقی منزل مقصود کے لئے کوشاں ہی نہیں ہوتا۔ اس راستہ پر چلتا ہی نہیں جو منزل مقصود تک لے جائے، ورنہ سمجھ لیا جاتا کہ چلتے چلتے تھک کر بیٹھ گیا ہے تاکہ سستائے یا چلا جا رہا ہے۔

(۴) میری شعر و شاعری کے حلقے میں وہ درویش موجود ہیں، جنہیں بادشاہی کے طور طریقوں سے آگاہی ہے لیکن وہ ابھی تربیت پا رہے ہیں اور ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی۔

(۵) اے مسلمان! تو نے خانقاہوں کے طور طریقے پسند کر رکھے ہیں، حالانکہ ان میں صحیح اسلامی روح موجود نہیں، میں کیا کہوں، یہ بڑی نازک باتیں ہیں۔ مجھے تو یہ طریقے اچھے معلوم نہ ہوئے۔ تو اگر انہیں پسندیدہ سمجھتا ہے تو جو کچھ تیرے جی میں آتا ہے، کر دیکھ۔

(۶) تیرا نصب العین یہ ہے کہ ہما کو شکار کرے، جو ایک روایتی پرندہ ہے اور بہت مبارک خیال کیا جاتا ہے لیکن ابھی تو ابتدائی دور میں ہے۔ خدا نے پرندوں اور مچھلی کے اس جہان کو بھی، جسے ہم دنیا کہتے ہیں، یونہی پیدا نہیں کیا۔ اس میں بھی ایک مصلحت ہے۔ تو بھی اسی جہان کو اپنے قبضہ میں لا تاکہ اصل نصب العین تک پہنچنے کے لئے خوب مشاق بن جائے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کو اونچے مقاصد کے لئے جد وجہد شروع کرنے سے پہلے وہ مقاصد تو پورے کر لینے چاہئیں جو خدا نے اس کے گرد و پیش مہیا کر رکھے ہیں اور جنہیں پورے کئے بغیر وہ اونچے مقاصد کی صلاحیت پیدا نہیں کر سکتا۔

(۷) تو عرب کا رہنے والا ہو یا عجم کا، تیرا ایک ہی پیغام ہے اور وہ ہے، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ (خدا کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں) یہی پیغام توحید تیرا اصل مقصد ہے لیکن لا الٰہ الا اللہ زبان سے کہ دینا کافی نہیں۔ اگر تیرا دل اس کا گواہی کے لئے تیار نہ ہو اور تو سراپا عمل بن کر اس کی حقیقی تصدیق نہ کرے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اجنبی زبان کا ایک کلمہ ہے، جس کا مطلب نہ تو سمجھا ہے، نہ کسی کو سمجھا سکتا ہے۔

(۲۳)

نخیل: کھجور کا درخت۔

(۱) تیری نظر اتنی بے حیثیت ہے کہ دور تک نہیں جا سکتی۔ تیرا ہاتھ اتنا چھوٹا ہے کہ بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تو کھجور کے اونچے درخت سے پھل نہیں توڑ سکتا تو کیا یہ درخت کا قصور ہے؟ یہ تو تیری وضع و ہیئت کا قصور ہے۔ شعر کا مدعا یہ ہے کہ بلند مقاصد کے لئے ارادے اور ہمتیں بھی بلند ہونی چاہئیں۔

(۲) مدرسے والوں نے تو تیرا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔ پھر لا الٰہ الا اللہ یعنی توحید کی صدا کہاں سے آئے؟

مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کا نظامِ تعلیم ایسا ہے جس سے مسلمان بچے اسلامی مقاصد کے لئے صحیح تربیت نہیں پا سکتے۔

(۳) اے غافل! خدائی خودی میں چھپی ہوئی ہے۔ تو اسے وہیں ڈھونڈ اور تیرے کاروبار کی درستی کا یہی طریقہ ہے۔

(۴) دل کی باتیں کسی ایسے درویش سے پوچھ جو درویشی کی حقیقت سے آگاہ ہو اور عام درویشوں کی طرح اس نے نمائش کے لئے گدڑی نہ پہن رکھی ہو۔ میری دعا ہے کہ خدا تجھے تیرے اصل مقام اور مرتبے سے آگاہی عطا کرے۔

درویش بے گلیم سے اشارہ نظر بہ ظاہر اپنی طرف ہے یقیناً اقبال حقیقت شناس درویش تھے۔ اگرچہ انہوں نے عام درویشوں کی طرح گدڑی

کبھی نہ پہنچی لیکن انہوں نے عام مسلمانوں کو دل کی باتوں سے آگاہ کیا اور صحیح مقام انہیں بتایا۔

(۵) اگر تیرا سر ننگا ہے اور تو اس پر حکم رانی کا تاج رکھنے کا خواہاں ہے تو اپنے ارادے اور ہمتیں بلند کر۔ اس دنیا میں تاج صرف شاہیں کے سر کے لئے زیبا ہے جو بلند ہمت ہوتا ہے۔

(۶) اے مسلمان! کیا کبھی تو نے سوچا کہ تو نعمت و جاہ سے کیوں محروم ہوا، شان و شوکت اور حکومت تجھ سے کیوں چھن گئی؟ تو سمجھ رہا ہے کہ تیرا ستارہ گردش میں آ گیا یا آسمان نے تجھ سے دغا کی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ستارے اور آسمان کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تیری تمام مصیبتوں کا اصل سبب یہ ہے کہ تیری خودی پر موت طاری ہو گئی۔ تو اس عزم و حوصلے سے خالی ہو گیا جو نعمتوں اور جاہ و جلال کی حفاظت کے لئے ضروری تھا۔

(۷) میں مدرسے اور خانقاہ دونوں سے غم و افسوس لے کر اٹھا۔ نہ ان میں زندگی کی کوئی روح نظر آئی، نہ عشق حق کی حرارت ملی، نہ خدا کی پہچان حاصل ہوئی، نہ ایسی نگاہ میسر آئی جو حقیقتوں کو دیکھ سکتی۔

مدرسے سے مراد ظاہری علوم کے ادارے ہیں اور خانقاہ سے مراد باطنی علوم کے ادارے۔ اقبال کے نزدیک یہ دونوں ادارے اپنی اصل روح سے خالی رہ گئے ہیں۔

(۴۴)

کساد: بے رواجی، کھوٹ۔

(۱) عقل یعنی فلسفہ کے پاس سنی سنائی باتوں کے سوا کیا رکھا ہے؟ اور تو ضعف یقین کی جس بیماری میں مبتلا ہے، اس کا علاج صاحب دل کی نظر ہی سے ہو سکتا ہے۔

(۲) تیرا مقام ہر مقام سے آگے ہے۔ زندگی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان لگاتار چلتا جائے اور کہیں نہ رکے۔

مراد یہ ہے کہ جس طرح دنیوی زندگی مسلسل جد و جہد کا دوسرا نام ہے اسی طرح روحانی زندگی بھی لگاتار ترقیات پر موقوف ہے۔ جو مقام سامنے آتا جائے، انسان کو چاہیے کہ اس سے آگے ہی آگے بڑھتا چلے۔

(۳) تیری گراں قدری خودی کی حفاظت پر موقوف ہے۔ تو خود سوچ کہ موتی میں آب و تاب کے سوا کیا رکھا ہے؟ جس طرح موتی کی قدر و قیمت آب و تاب سے ہے، اسی طرح انسان کی قدر و قیمت خودی سے ہے۔

(۴) زندگی اس کا نام نہیں کہ خون رگوں میں رواں دواں رہے۔ ایسی زندگی کس کام کی؟ اصل زندگی تو یہ ہے کہ انسان کا جگر سوز و گداز سے لبریز ہو۔

(۵) اے گل لالہ! جو اپنے حسن و جمال کے باعث دلکش معلوم ہوتا ہے، مجھ سے کیوں پردہ کر رہا ہے؟ میں تو صبح کی نسیم کے سوا کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ نسیم سحر پھولوں کی شادابی اور تازگی بڑھا دیتی ہے۔ گل لالہ کے لئے نسیم سے پردہ کرنا تو مناسب نہیں۔

(۶) یورپ کے بیوپاری جس شے کو کھوٹا سمجھ رہے ہیں اور ان کا

خیال ہے کہ اس سے تجارت مندی پڑ جائے گی وہ ہنر کے سوا کیا ہے؟

مطلب یہ کہ اہل یورپ نمائشی ہنر کی بنا پر دولت کما رہے ہیں۔ اصلی اور حقیقی ہنر کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے۔ سمجھ رہے ہیں کہ اس سے ان کے کاروبار کو نقصان پہنچے گا۔ وہ غلط مقاصد و افکار شائع کر رہے ہیں۔ اور جو چیزیں عالم انسانیت کے لئے مفید ہیں، انہیں پس پشت ڈال رہے ہیں۔

(۷) اقبال اگرچہ غریب و بے نوا ہے۔ اس کے باوجود بڑا سخی ہے لیکن اس کی حیثیت شعلے کی ہے اور شعلہ چنگاریوں کے سوا کیا دے سکتا ہے؟

مراد یہ ہے کہ اقبال کے پاس عشق حق کی حرارت کے سوا کچھ نہیں۔ جو بھی اس کے پاس آ جائے، اس کے دل میں وہی حرارت بھر دینا چاہتا ہے۔

(۲۵)

عتاب: غصہ، ناراضی۔ مآل: انجام۔

(۱) درویشی کی نگاہ میں سکندر جیسے شہرۂ آفاق بادشاہ کی شان کیا حقیقت رکھتی ہے؟ بھلا وہ بادشاہی بھی کوئی بادشاہی ہے، جو خراج کے لئے گداگری کی محتاج ہو؟

مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی بادشاہ گزرے ہیں، وہ رعایا سے خراج لے کر خزانے بھرتے اور اپنا خرچ چلاتے رہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جو بادشاہی مال و دولت کے لئے رعایا کے سامنے ہاتھ پھیلائے، وہ کس کام کی بادشاہی ہے؟ اور خدا مست درویش اسے کب قابل توجہ سمجھ سکتے ہیں؟

(۲) تو بتوں سے امیدیں لگائے بیٹھا ہے اور خدا کی رحمت سے مایوس نظر آتا ہے۔ ذرا یہ تو بتا کہ کافری اور کس چیز کو کہتے ہیں؟ کفر تو یہی ہے کہ جو سب کے دامن بھرنے والا ہے، اسے انسان بھلا دے اور جو خود دوسروں کے محتاج ہوں، ان سے اپنی بہتری کی امیدیں وابستہ کرے۔

(۳) آسمان نے ان لوگوں کو آقائی کے رتبے پر بٹھا دیا ہے، جنہیں وابستگانِ دولت کی پرورش کا سلیقہ بھی نہیں آتا یعنی جو لوگ اتنے لائق ہیں کہ آقائی کے عام طور طریقے بھی نہیں جانتے، وہ برسرِ اقتدار ہیں اور جو قابل ہیں، ان کے جوہروں کی قدر و قیمت پہچاننے والا کوئی نہیں۔

(۴) دل کا فیصلہ تو ایک نگاہ پر موقوف ہے، جس نگاہ میں شوخی نہ پائی جائے اسے دل بر کی نگاہ کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

(۵) بادشاہوں نے مجھے صرف اس خطا پر خفگی، ناراضی اور غصہ کا نشانہ بنا رکھا ہے کہ مجھے بادشاہی کا انجام معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہی کے طور طریقے زیادہ دیر تک چل نہیں سکتے۔ یہ ڈھانچا بہت جلد ٹوٹنے اور محو ہونے والا ہے۔ بادشاہوں کو چاہیئے کہ خود اس انجام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی اصلاح کریں، لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ مجھے قصور وار قرار دے کر عتاب کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

(۶) کون نہیں چاہتا کہ اسے سرداری کا مرتبہ حاصل ہو، لیکن جس سرداری میں خودی پر موت طاری ہو جائے، وہ کس کام کی ہے؟ حقیقی سرداری وہی ہے جس میں انسان کی خودی پر کوئی ضرب نہ پڑے۔

(۷) دنیا کو میری خدا مستی اور درویشی پسند آ گئی ہے۔ اسی لئے میری شاعری کو سب قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ورنہ میرا شعر کیا ہے اور میری شاعری میں کیا رکھا ہے؟

یہ انکسار ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اقبال کی شاعری ہی ان کی عظمت و رفعت کا ذریعہ بنی اور اسی کو انہوں نے اپنی حقانی تعلیم اور حیات آموز پیغام کا وسیلہ بنایا۔

(۲۶)

(۱) تو نہ زمین کے لئے پیدا ہوا ہے، نہ آسمان کے لئے ہے۔ دنیا تیرے لئے پیدا کی گئی ہے، تو دنیا کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بظاہر یہ شعر بہت سادہ ہے، لیکن اس میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے، وہ اتنی اہم ہے کہ تنہا یہی حقیقت عالم انسانیت کا نقطۂ نگاہ بدلنے کے لئے کافی ہے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی سب سے بڑی دستاویز ہے یعنی انسان ہیں دنیا کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ یہ دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے لہٰذا دنیا کی ہر شے انسان کی تابع ہے اور اسے اپنی ہمت و تدبیر سے ہر شے کو تسخیر کرنا چاہیئے، نہ کہ خود دنیا کا تابع ہو کر رہ جائے، جو اس کی پستی کی آخری منزل ہے۔

(۲) عقل اور دل دونوں محبت کے شعلے کی چنگاریاں ہیں۔ عقل کی چنگاری کا کام یہ ہے کہ گھاس پھوس کو جلائے۔ دل کی چنگاری کا کام یہ ہے کہ جنگل کو آگ لگائے یعنی عقل سے شکوک و شبہات کو دور کرنے کا کام لینا

چاہیئے اور دل سے تسخیر عالم کا۔

(۳) یہ چمن آہ و فریاد کی تربیت کا مقام ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ پھولوں سے دل بہلایا جائے یا گھونسلا بنایا جائے۔

مراد یہ ہے کہ دنیا عشق حق کی صلاحیت پیدا کرنے اور اسے ترقی دینے کا مقام ہے۔ یہاں کی نیرنگیوں میں دل نہ لگانا چاہیئے۔

(۴) تیری کشتی تو بے کنارہ سمندر کے لئے بنائی گئی ہے۔ یہ کب تک راوی، نیل اور فرات کے دریاؤں میں چکر لگاتی رہے گی؟

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان! تو نے اپنے مقصد و مدّعا کو چھوٹے چھوٹے خطوں میں محدود کر لیا ہے۔ حالانکہ تو جن مقاصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہ بہت بلند اور بہت وسیع ہیں۔

(۵) جو لوگ ستاروں کو راستہ کا پتا بتلاتے تھے، وہ آج اس درجہ بے بس ہیں کہ راستہ دکھانے والے کسی آدمی کے لئے بیٹھے ترس رہے ہیں۔

یہ مسلمانوں کے سابقہ اوج و عظمت اور موجودہ زوال و پستی کا مضمون ہے۔

(۶) قافلے کے سردار کو سفر کے لئے کیا سامان درکار ہے؟ یہ کہ اس کی نگاہ بلند ہو، اس کی باتیں دلوں میں گھر کر لیں، اس کی جان سوز و گداز سے معمور ہو۔

نگاہ کی بلندی سے مقصود یہ ہے کہ اس کے پیش نظر بلند مقاصد ہوں۔ سخن کی دل نوازی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس کی زبان پر آئے، وہ سننے والوں کے دلوں میں اترتا جائے اور انہیں قافلہ سالار سے مستحکم طور پہ وابستہ کر دے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں. ہمارے آقا و مولا صلعم کی ایک یگانہ خصوصیت یہ بھی کہ آپ دل کے نرم تھے اور خدا نے اس خصوصیت کو قرآن مجید میں اپنی رحمت قرار دیا۔ مسلمانوں کے ہر قافلہ سالار میں یہی خوبی منعکس ہونی چاہیئے۔ قافلہ سالار کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اہل قافلہ کی بہتری اور بہبود کا زیادہ سے زیادہ دلدادہ و شیفتہ ہو۔ ہر ایک کے لئے اس کے دل میں سچی تڑپ موج زن ہو۔

(۷) ذراسی بات تھی لیکن عجم والوں نے قصہ کی آرائش کے لئے اسے بڑھا چڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

(۸) میرے گلے میں ایک نغمہ ایسا بھی ہے، جسے سن کر حضرت جبریلؑ بھی تڑپ اٹھیں۔ میں ابھی اس دنیا میں ہوں۔ اس نغمے کو میں نے لامکاں کے لئے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے۔

(۲۷)

خدنگ جستہ: کمان سے نکلا ہوا تیر۔

(۱) اے مکاں کے قیدی! اگر تو حقیقت حال پر غور کرے تو جان لے کہ تو لامکاں سے دور نہیں۔ وہ مقام جسے نور مطلق کی خاص جلوہ گاہ کہا جاتا ہے، اس دنیا سے زیادہ فاصلہ پر نہیں، جسے خاک کی دنیا کہا جاتا ہے۔

(۲) تو غمگین نہ ہو کر جو ہری بھری چراگاہ خزاں کے خوف سے پاک ہے اور جو ہمیشہ ہری بھری رہے گی، تیرے گھونسلے سے دور نہیں۔

(۳) قلندری کے علم کا نچوڑ یہ ہے کہ زندگی کمان سے نکلا ہوا تیر ہے لیکن

وہ کمان سے دور نہیں گیا۔

اس شعر میں حیات سے مراد اس کائنات کی زندگی ہے اور کمان سے بظاہر اشارہ اس نور مطلق کی طرف ہے، جس سے زندگی کا ظہور ہوا۔ گویا فرماتے ہیں کہ زندگی اگرچہ اپنے اصل سرچشمے سے الگ ہو گئی ہے، اس کے باوجود سرچشمے سے اس کا تعلق باقی ہے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے دور چلی گئی۔

(۴) وہ فضا جو تیری پرواز کے لئے سازگار ہے، چاند اور ستاروں سے ذرا آگے ہے۔ تو قدم آگے بڑھائے جا۔ یہ مقام اس آسمان سے زیادہ دور نہیں، جو چاند اور ستاروں کے موتیوں سے آراستہ ہے۔

(۵) جو مسافر یا سالک حقیقتوں سے آگاہ ہے اور منزل کے بھیدوں کو جانتا ہے، اس سے یہ بعید نہیں کہ اپنے رہنما سے چھوڑ دینے کے لئے کبھی نہ کہے، یعنی نہ کہے کہ تو مجھے چھوڑ جا، میں خود ہی آگے چلا جاؤں گا۔

اس شعر کا انداز بیان ذرا پیچیدہ ہے۔ غالباً ردیف کی پابندی کے باعث یہ پیچیدگی ناگزیر ہو گئی۔ مضمون ایسا ہے جو چھوڑا نہ جا سکتا تھا۔ یعنی ایسے رہرو بھی بے شمار ہیں، جو خاص مقام تک رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، پھر اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو منزلوں پر منزلیں طے کر جانے کے باوجود رہنما سے یہ نہیں کہتے کہ اب اگلی منزلیں میں خود ہی طے کر لوں گا۔ آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ حالانکہ ان کی نکتہ دانی میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق قاعدے اور ضابطے بنانا خارج از بحث ہے۔

(۲۸)

اقبال نے خود فرمایا ہے کہ یہ شعر یورپ میں لکھے گئے

(۱) عقل نے مجھے فلسفیانہ نظر عطا کی۔ عشق نے مجھے رندوں کے طور طریقے سکھا دیئے۔ یعنی میں نے عقل و عشق دونوں سے فیض حاصل کیا۔

(۲) محبوب کی محفل اس نگاہ کی برکت سے رنگین و مست ہے، حالانکہ نہ اس محفل میں شراب ہے، نہ صراحی، نہ پیالہ گردش کر رہا ہے۔

(۳) میرے پریشان سے نغموں کو شاعری نہ سمجھ، خیال کی رنگ آرائیاں نہ قرار دے، میں شراب خانے کے اندرونی بھیدوں سے واقف ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں، میرے ذاتی علم کا نتیجہ ہے، افسانہ طرازی نہیں۔

(۴) تو کلی کو دیکھ کہ وہ نسیم صبح کی کتنی پیاسی ہے۔ کس شوق سے انتظار کر رہی ہے کہ ہوا چلے اور وہ کھل کر پھول بنے۔ اسی سے میرے دل کی پوری کیفیت آشکارا ہو سکتی ہے۔ یعنی جس طرح کلی کو نسیم سحر کی ضرورت ہے، اسی طرح مجھے محبوب کی نگاہ لطف درکار ہے۔ نسیم کے بغیر کلی پھول نہیں بن سکتی۔ میرا دل بھی التفات محبوب کے بغیر شگفتہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) بزم محبوب میں جتنے لوگ موجود ہیں، وہ سب لطف و کرم سے فیض یاب ہیں۔ صرف میں اس التفات سے محروم ہوں۔ گویا باقی سب آشنا ہیں اور صرف میں بیگانہ ہوں۔ اب مجھے بتایا جائے کہ اس حالت محبوب کی بارگاہ سے محرومی سمجھا جائے یا محبوب کی حضوری قرار دیا جائے؟ یہ سوال کرنے کی نوبت اس لئے پیش آئی کہ نظر بہ ظاہر حضوری ہے، لیکن اگر حضوری کے اصل مقصد

یعنی التفات محبوب کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے حضوری قرار دینا ممکن ہی نہیں۔

(۶) میں یورپ میں کچھ دن اور بھی ٹھہر جاؤں لیکن کیا کروں، یہ ویرانہ میرے جنون کو سنبھالنے کا اہل نظر نہیں آتا۔

مراد یہ ہے کہ یورپ میری باتوں کی تاب نہیں لا سکتا، اس لئے یہاں کیا ٹھہروں؟

(۷) اقبال عقل کے مقام سے تو بہ آسانی گزر گیا۔ اس منزل میں تو کوئی شے اس کے لئے رکاوٹ نہ بن سکی اور اس کی دامن گیر نہ ہو سکی لیکن عشق کے مقام میں وہ عقل مند سنبھلا نہ رہ سکا اور کھو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ اکثر آدمیوں کو عقل کے مقام میں چکر آئے ہیں اور وہ جا بجا اٹکتے جاتے ہیں، لیکن اقبال کو اس مقام سے گزر جانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ کہیں نہ اٹکا اور کہیں نہ رکا، مگر عشق کے مقام میں پہنچ کر اسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔

(۲۹)

امم: امت کی جمع، قومیں۔ طاؤس و رباب: دو سازوں کے نام۔ نادر: ایران کا مشہور بادشاہ، نادر شاہ افشار۔

(۱) آخر آسمان سے عاشق کی آہ و فریاد کا جواب ملنے لگا۔ اب محبوب باتیں کرتا ہے اور پردے اٹھ رہے ہیں۔

(۲) عشق کی مختلف حالتوں میں دراصل چنداں فرق نہیں ہوتا۔ ان

سب کی کیفیتیں یکساں ہوتی ہیں۔ ابتدا میں بھی سوز و گداز اور تڑپ سے سابقہ پڑتا ہے، آخر میں بھی یہی حالت باقی رہتی ہے۔

(۳) میں تجھے بتاتا ہوں کہ قوموں کی تقدیر کیا ہوتی ہے؟ وہ میدانِ زندگی میں اترتی ہیں تو ان کے ہاتھ میں تلواریں اور نیزے ہوتے ہیں، یعنی وہ جدوجہد اور رزم و پیکار سے اپنے لئے فخر و عزت کا مقام پیدا کرتی ہیں، جب انہیں آرزو کے مطابق ثروت و حکمرانی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ راگ رنگ، باجے گاجے اور عیش و طرب میں ڈوب جاتی ہیں۔ پہلی حالت ان کے عروج کا پتا دیتی ہے، آخری حالت ان کے زوال کا ماتم کرتی ہے۔

(۴) یورپ کے شراب خانے کے قاعدے سب سے نرالے ہیں، یہاں پہلے رندوں پر مستی طاری کرتے ہیں، آخر میں شراب دیتے ہیں۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ شراب پی کر مستی طاری ہوتی ہے لیکن یورپ پہلے مست کرتا ہے پھر شراب دیتا ہے یعنی پہلے پہل قوموں اور گروہوں کو اپنے ظاہری طور طریقوں میں الجھا کر اپنے دام میں پھانستا ہے۔ کسی کی مالی امداد کر دی۔ کسی کے لئے فوجی حفاظت کا بندوبست کر دیا۔ کسی کے لئے ریلیں اور سڑکیں بنا دیں جب اپنی خیر خواہی کا سکّہ بٹھا لیا، تو پھر اخلاقی تخریب کے تمام وسیلے مہیّا کر کے اس قوم کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

(۵) نادر شاہ جیسے بادشاہ کا دبدبہ اور تیموریوں کی شان و شوکت بالکل ہیچ ہے یہ تمام دفتر آخر خالص شراب میں غرق ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ بڑی بڑی قوموں کی شوکت کو عیش و عشرت ہی برباد کر دیتی ہے۔ بہ ظاہر اس شعر کا خیال اس مشہور مصرع سے لیا گیا ہے جو محمد شاہ رنگیلے نے اس وقت پڑھا تھا جب اسے نادر شاہ کا خط ملا تھا۔ کہتے ہیں کہ نادر کا خط آیا اور جواب کے لیے بار بار تقاضا ہوا تو محمد شاہ نے خط اٹھا کر شراب کے پیالے میں ڈبویا اور کہا:

این دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

نتیجہ یہ ہوا کہ نادر فوج لے کر ہندوستان پہنچ گیا اور مغلیہ سلطنت کی ساری دولت اٹھا کر لے گیا۔

(۶) محبوب کے خلوت میں بیٹھے رہنے کا وقت گزر گیا اور عام جلوہ گری کی ساعت آ پہنچی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ بجلی سے بادل کی آغوش چھوٹ رہی ہے۔

بجلی جب تک بادل کی آغوش میں تھی، اسے خلوت کا مقام حاصل تھا۔ اب آغوش کو چھوڑ رہی ہے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کی عام جلوہ گری کا وقت آ گیا۔

(۷) معنی کے طوفان کو سینے میں روکنا بہت مشکل تھا۔ آخر خستہ درویش نے کتاب کے تمام بھید ایک ایک کرکے کہہ ڈالے اور اس طرح دل کا بوجھ ہلکا کر لیا۔ کتاب سے مراد ہے قرآن پاک اور قلندر سے اشارہ اقبال نے اپنے متعلق کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے اسرار ایک طوفان کی طرح میرے سینے میں موج زن تھے۔ میں انہیں چھپا کر نہ رکھ سکا اور ایک ایک کرکے کہہ گیا۔

(۳۰)

بے سوادی: بے علمی۔ واہی: بے سروپا۔

(۱) اس دنیا کی ہر شے سفر کر رہی ہے۔ ہر چیز راستے پر چلی جا رہی ہے، چاند ہوں یا تارے، پرندے ہوں یا مچھلیاں، سب کی یہی حالت ہے کہ چلے جا رہے ہیں۔ کسی کے لئے یہاں قیام نہیں۔

(۲) اے انسان تو سب سے اونچا اور اعلیٰ ہے۔ اپنی حیثیت کا اندازہ کر۔ تو اس میدان کا مرد ہے۔ تو لشکر کا سالار ہے۔ نورانی اور حضوری مخلوق یعنی فرشتے اور قدسی بھی تیرے سپاہی ہیں۔

(۳) تو نے اپنے مرتبے اور اپنی قدر و منزلت کا کوئی اندازہ نہ کیا۔ غافل! اتنی بے علمی، ایسی کوتاہ بینی؟ تجھ پر سخت افسوس ہے۔

(۴) تو کب تک اس کمینی دنیا کا غلام بنا رہے گا، یا تو اسے چھوڑ کر کسی الگ تھلگ گوشے میں جا بیٹھ یا زور و قوت اور ہمت و تدبیر سے کام لے کر اسے اپنے قبضے میں لا اور اس پر حکم چلا۔ یہی دو صورتیں ہیں جو تجھے دنیا کی غلامی سے نجات دلا سکتی ہیں۔

(۵) میں کعبہ کے شیخ کو بھی دیکھ چکا ہوں، جسے مسلمان اپنا دینی رہنما سمجھتے ہیں۔ اس کی حالت کیا ہے؟ یہ کہ عمل اور سیرت میں کوئی حرارت اور تڑپ نظر نہیں آتی، جو دوسروں کو اپنی طرف مائل کر لے اور بات چیت سراسر بے سروپا، لغو اور بے اثر ہے۔

---

(۳۱)

نمودِ سیمیائی: ایسی نمائش جو حقیقت سے خالی ہو، یعنی نظر آئے لیکن اصل میں کچھ نہ ہو۔

(۱) اس دنیا کی ہر چیز اپنے آپ کو دکھانے اور نمایاں کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ ہر ذرہ بڑائی کی آرزو میں مٹا جا رہا ہے۔

(۲) اگر نمائش کا ذوق موجود نہ ہو تو زندگی موت کے ہم معنی بن جائے۔ خدائی درحقیقت خودی کی تعمیر ہی میں چھپی ہوئی ہے۔

یہ حقیقت کسی شرح کی محتاج نہیں کہ جس شے میں ذاتی کمالات کی نمائش کا ذوق و شوق نہ ہو، اس کی زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس پر زندہ ہونے کے باوجود وہی بے حسی طاری ہو جاتی ہے جو موت کا خاصّہ ہے۔

(۳) رائی بالکل بے حقیقت سا دانہ ہے لیکن خودی کے زور سے وہ پہاڑ پر بھاری ہو سکتا ہے۔ پہاڑ کی خودی کمزور ہو جائے تو اسے رائی کا دانہ سمجھنا چاہیئے۔

مطلب یہ ہے کہ وجود کی برتری اس کے بڑا یا چھوٹا ہونے پر موقوف نہیں، زورِ خودی پر موقوف ہے۔

(۴) تاروں کو دیکھو، وہ کس طرح آسمان کی وسعتوں میں آوارہ اور سرگرداں پھر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی میل جول نہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وجود کی قسمت میں جدائی لکھ دی گئی ہے؟

(۵) رات کے پچھلے پہر میں چاند پر نظر ڈالو، اس کے چہرے پر زردی چھا جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آشنائی اور دوستی کے راز و نیاز سے کبھی آشنا نہ ہوا تھا یعنی اس پر جدائی کی سراسیمگی طاری ہو جاتی ہے۔

(۶) اے انسان! تیرا دل ہی تیری قندیل ہے۔ تو نہ تاروں کی روشنی کا محتاج ہے، نہ چاند کا۔ تو خود ہی اپنا چراغ راہ ہے۔

(۷) یقین رکھ کہ اس دنیا میں تیرا ہی وجود حقیقی ہے۔ باقی جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب طلسمی نمائش اور خیال کی کرشمہ سازی ہے۔

(۸) تو ننگے پاؤں ہونے کا گلہ نہ کر اور اس جنگل کے کانٹوں سے نہ گھبرا۔ یہی کانٹے تیری تمام الجھنیں دور کر کے رکھ دیں گے یعنی اس زندگی میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، وہی انسان کے لئے عزم و ہمت کا پیغام ہیں۔ انہیں کی بدولت وہ ترقی اور برتری کے اونچے درجوں پر پہنچتا ہے۔

(۳۲)

(۱) یہ کس کی نگاہ لطف کا معجزہ ہے یا سمجھ لو کہ زمانے کی گردش کا کرشمہ ہے لیکن یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ایشیا میں اہل یورپ کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔

مراد یہ ہے کہ ایشیا کے ہر ملک میں اہل یورپ کے تسلط کے خلاف زبردست قومی تحریکیں جاری ہو چکی ہیں جن قوموں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ یورپ کی قوت، نئی نئی ایجادات اور تہذیب سے مسحور ہو چکی ہیں ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور وہ اب آزادی کے لئے میدان عمل میں نکل آئی ہیں۔

اس شعر میں سحر کا لفظ خاص غور کا محتاج ہے۔ اس کے معنی ہیں جادو یا طلسم۔ اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یورپ کا تسلّط حقیقی تسلّط نہ تھا۔ اس کی قوت بھی حقیقی قوّت نہ تھی محض ایک جادو تھا جس کے جال میں ایشیائی قومیں پھنس گئیں۔ اب وہ ٹوٹ گیا ہے اور سب پر آشکارا ہو چکا ہے کہ یورپ کو ہیبت انگیز سمجھنا فکر و نظر کا دھوکا تھا۔

(۲) آشیاں بنانے سے مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ نغمے گانے والوں کے لئے آشیاں بجلی کا حکم رکھتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے آزادی اور زندگی کے پیغام کا حامل بنایا ہے، وہ دنیوی راحت و آسائش کے سامان جمع بھی کریں تو بظاہر ان کے باقی رہنے کا امکان کم ہے۔ ان کے لئے بے سروسامان ہی رہنا بہتر ہے۔

(۳) تو خدا کا بندہ بن جائے تو یہ بندگی تجھے کائنات میں کارفرمائی کا درجہ عطا کر دے گی۔ اگر زمانے کا بندہ بن جائے تو یہ بندگی تجھے بھکاری بنائے رکھے گی۔ فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے، یہ کر یا وہ کر۔

(۴) تو اپنی خودی سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہو۔ اس کی حفاظت میں برابر لگا رہ کسے معلوم کہ تو بھی کسی کعبہ کی دہلیز بن جائے یعنی خودی کی حفاظت ہی تیرے لئے انتہائی عزت و احترام کا وسیلہ بن سکتی ہے۔

(۵) اے لا الٰہ الا اللہ کے وارث! اے دنیا کو توحید کا پیغام دینے والے! کتنا اندھیر ہے کہ تجھ میں نہ بات چیت کی وہ شان باقی رہی، جو

دلوں کو لبھا لیتی تھی اور نہ تیری سیرت میں کارفرمائی اور جہاد کے جوہر باقی رہے۔

(۶) وہ بھی وقت تھا، جب تیری نگاہ سے لوگوں کے دل سینوں میں کانپ اٹھتے تھے۔ افسوس کہ تیری درویشی اور خدامستی کا وہ جذبہ ضائع ہوگیا۔

(۷) اقبالؔ کی بات چیت کا رنگ ڈھنگ محرموں کا سا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کعبہ کے بھیدوں سے آگاہی حاصل ہو چکی ہے۔

(۳۳)

(۱) میں عقل مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے؟ میں تو اس فکر میں رہتا ہوں کہ میری منزل مقصود کیا ہے؟ سچ ہے انسان کو اس کاوش سے کیا حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ کس طرح پیدا ہوا اور کب پیدا ہوا۔ اس کا وجود میں آنا ایک مسلّم واقعہ ہے۔ سوچنا یہ چاہیئے کہ وہ کس غرض سے پیدا ہوا؟ اس کا مقصد و نصب العین کیا ہے؟ اسی سوال کا صحیح جواب اس کی زندگی میں وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے، جو فکر و عمل کی درستی کے لئے لازم ہے اور جو انسان کی زندگی کو واقعی بیش قیمت بنا سکتا ہے۔

(۲) تو خودی کو ترقی دیتے دیتے اتنی بلندی پر پہنچا دے کہ خدائے رحیم و کریم کسی معاملہ کا اندازہ مقرر کرنے سے پہلے تجھ سے پوچھے تو کیا چاہتا ہے؟

اقبالؔ کا یہ شعر بہت پڑھا جاتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش بہت کم کی گئی۔ یہ اسی حدیث کی ایک دل کشا تشریح ہے جس کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

"میرا بندہ برابر نوافل سے میرے قریب ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبّت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبّت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا وہ پاؤں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو ضرور اسے دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں اور مجھے کسی بات میں جسے میں کرنے والا ہوں، اتنا تردد نہیں ہوتا، جتنا مومن کی روح قبض کرنے میں ہوتا ہے۔ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناخوشی پسند نہیں کرتا۔" (بخاری۔ کتاب الرقاق)

اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ خدا بندے کے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ بن جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو خدا کی رضا میں گم کر دیتا ہے، لہٰذا خدا اس کے تمام اعمال کو عزّت کے لئے اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے اور یہ ایک طریق بیان ہے خدا کی انتہائی محبّت اور رحمت کے اظہار کے لئے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان اپنی خودی کو خدا کی رضا میں گم کر دے تو یقیناً اس کے فیصلے اس دنیا میں نظر بظاہر خدا کے فیصلے سمجھے جائیں گے۔

(۳۳) اگر میں کیمیاگر ہوں تو اس بیر بات چیت اور بحث کی ضرورت نہیں لیکن میرے پاس جو کیمیا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا نے مجھے سوزِ نفس عطا کیا ہے یعنی میری باتوں میں درد ہے، گداز ہے، اخلاص ہے، اپنے ہم جنسوں اور ہم قوموں کو سیدھے راستے پر لگانے کی تڑپ ہے۔ بس انہیں نعمتوں کی

بدولت میرے کلام میں وہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ یہ تانبے کو سونا بنا سکتا ہے۔

(۴) اے دوست! اس محبوب کی سرمگیں آنکھ کے متعلق تجھے کیا بتاؤں؟ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس میں مجھے تقدیر کی گہرائیاں نظر آئیں۔

(۵) اگر وہ فرنگی مجذوب یعنی نٹشے میرے زمانے میں ہوتا تو میں اسے سمجھا دیتا کہ کبریائی کا مقام کیا ہے؟ اقبال نے خود لکھا ہے کہ نٹشے اپنی قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔

اقبال نے اپنے کلام میں نٹشے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

قلبِ او مومن دماغش کافر است

یعنی اس کے دل میں ایمان کا جوہر موجود تھا لیکن اس کا دماغ غلط راستے پر لگ گیا۔ مقام کبریا سے غالباً اشارہ نٹشے کے سوپرمین (فوق البشر) کی طرف ہے۔ وہ انسانوں کو مومن و کافر کے بجائے قوی و ضعیف کی شکل میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کا قول یہ ہے کہ قوی اور زور آور کمزوروں پر حکومت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ قوت ہی دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اسی طرح انسان ترقی کرتے کرتے فوق البشر بنے گا۔ حالانکہ انسان کی عظمت، مادی قوت کی فراہمی پر نہیں بلکہ عقائد و اعمال کی اصلاح پر موقوف ہے۔ اسی طرح وہ عظیم الشان ہستیاں تاریخ کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوئیں، جنہوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیاں پلٹ دیں۔ انہیں میں سے انبیاءِ خاص انعام یافتہ تھے۔ بشریت کی منزل سے اوپر اٹھنے یا بشریت کے درجے کو بلند کرنے کا ذریعہ صرف روح و باطن اور سیرت و کردار کی آرائش ہے۔ اقبال

کہتے ہیں کہ نطشے کو اس کے زمانے میں کوئی صحیح ہادی نہ مل سکا۔ میرے زمانے میں وہ ہوتا تو میں اسے سیدھے راستے پر لگا دیتا۔

(۶) میری یہ کیفیت ہے کہ صبح کے وقت نغمے سنتا ہوں تو جگر خون ہو جاتا ہے۔ اے خدا! جس خطا کی یہ سزا مل رہی ہے، وہ کیا ہے؟

اس شعر میں اقبال نے اپنی انتہائی دردمندی اور احساس کی تیزی کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس شے کو انہوں نے خطا قرار دیا ہے، وہ حقیقت میں انسانیت کا ایک کمالی جوہر ہے۔ یعنی فطرت کا صحیح اور سلیم ہونا اور دوسروں کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو دیکھ نہیں سکتی اور سب کا غم کھاتی ہے۔

(۲۴)

کم کوش: لفظی معنی تھوڑی کوشش کرنے والے یعنی تن آسان۔

طائر لاہوتی: علم تصوف میں روحانی ترقی کی آخری منزل لاہوت ہے یعنی وہ مقام جہاں ذات باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گویا لاہوت کا مطلب ہے انتہائی بلند مقام۔ طائر لاہوتی وہ پرندہ جو روحانی ترقی کے بلند ترین مقام پر اڑنے والا ہو۔

(۱) جب عشق ذاتی پہچان کے طور طریقے سکھا دیتا ہے تو غلامی پر شہنشاہی کے بھید ظاہر ہونے لگتے ہیں یعنی نفس کی پہچان اور ذات کی معرفت غلاموں میں شہنشاہی کے جوہر پیدا کر دیتی ہے۔

(۲) خواجہ فرید الدین عطارؒ ہوں یا مولانا رومؒ، امام رازیؒ ہوں یا

SUPERMEN

امام غزالی رح، تنہا علم سے کوئی معرفت کے درجے پر نہ پہنچا اور صبح کے وقت کی آہ و فریاد کے بغیر کسی کو کچھ نہ مل سکا یعنی علم بے سود ہے جب تک اس کے ساتھ مخلصانہ عمل موجود نہ ہو۔

(۳) اے دانا رہنما! تیرے پیچھے پیچھے جو لوگ چلے آ رہے ہیں۔ ان سے مایوس نہ ہو۔ وہ تن آسانی اور راحت طلب تو ضرور ہیں، لیکن ذوق و شوق سے خالی نہیں۔

یہ بھی مسلمانوں کے رہنماؤں کو ہدایت کی گئی ہے۔ یعنی ان میں پہلے کی سی جفاکشی تو موجود نہیں، تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ذوق سے محروم ہو چکے ہیں۔

(۴) اے لاہوت کی فضا میں اڑنے والے پرندے! جس روزی سے تیری اڑان میں کمزوری آتی ہو، اس پر زندگی بسر کرنے سے موت بہتر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کے لئے اس دنیا میں سب سے بڑی آزمائش رزق کی ہے۔ اسی خاطر اکثر لوگ اپنے اصول چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن جو رزق انسان کو راہ حق سے برگشتہ کر دے، اسے قبول کرنے کے بجائے مر جانا بہتر ہے۔

(۵) جس درویش کی درویشی میں حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کی جھلک نمایاں ہو، وہ درویش دارا اور سکندر جیسے بادشاہوں سے افضل ہے۔

(۶) جواں مردوں کا شیوہ یہ ہے کہ سچی بات کہیں اور کسی سے ڈریں، وہ اللہ کے شیر ہیں، ان کے لئے لومڑی کے طور طریقے زیبا نہیں جو مکر و فریب کاری میں رسوائے عام ہے۔

(۳۵)

(۱) مجھے پھر یہ پیغام آیا کہ آدھی رات کے وقت اٹھ کر آہ و فریاد کر۔ اے راستہ چلنے والے ساتھی! ذرا ٹھہر جا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سامنے پھر کوئی مشکل منزل آگئی ہے یعنی راستہ کی مشکل منزلیں بارگاہ خدا میں آدھی رات کی عبادت اور گریہ و زاری سے طے ہوتی ہیں۔

(۲) تو بھی تھوڑی دیر کے لئے تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا۔ میں لڑائی کا یہ میدان دیکھ چکا ہوں اور اسی سے ایسی تلوار بن کر آیا ہوں جو میان کی روادار نہیں ہو سکتی اور ہمیشہ برہنہ رہتی ہے۔

(۳) کس شوخ نے مسجد کی محراب پر یہ مصرع لکھ دیا کہ جب قیام کا وقت آیا، نادان مسلمان سجدوں میں گر گئے۔

قیام اور سجدہ دونوں نماز کی اصطلاحیں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے جب اٹھنے اور میدانِ عمل ڈٹ جانے کا وقت آیا تو وہ اپنی بے عزمی کے باعث کچھ بھی نہ کر سکے۔

(۴) اے میری غریبی اور بے کسی کا تماشا دیکھنے والے! کبھی یہ بھی سوچا کہ میری یہ حالت کیوں ہوئی؟ اس لئے کہ جب محفل اجڑ گئی تو شراب کا پیالہ گردش کرتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ یعنی وہ لوگ ہی نہ رہے جو میرا پیغام سننے کے اہل تھے۔

(۵) اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا سوز و گداز دے دیا۔ وہ خود ایک آرام طلب آدمی تھا اور آرام طلبوں کے کام آیا۔ یعنی میں اگر کوئی بڑا

مجاہدانہ کارنامہ انجام نہیں دے سکا تو میرے مخاطب کون سے مجاہد تھے۔ وہ بھی تن آسان تھے اور انہیں پیغام پہنچانے والا بھی تن آسان مل گیا۔

(٦) میں اسی اقبال کو برسوں ڈھونڈتا رہا۔ وہ شاہین تھا۔ اور شاہین کو جال میں پھانسنا آسان نہیں ہیں بڑی مدت کے بعد اس کوشش میں کامیاب ہوا۔

(۳٦)

طغیان: طوفان، سیل۔ برّاقی: بجلی جیسی چمک دمک۔
خلاقی: تخلیق، پیداوار۔

(۱) میرے دل میں عشق کا طوفان موجزن نہ ہو تو میں زندہ ہی نہیں رہ سکتا اس لئے کہ میری زندگی عشق کے طوفان کے بغیر ہے کیا؟

(۲) فطرت مجھے بار بار نغمے چھیڑنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی محفل میں درد دل رکھنے والا۔ رکھنے والا کوئی نہ کوئی باقی ہے یعنی میں اسی لئے بار بار گا رہا ہوں کہ ابھی میرے نغموں سے فائدہ اٹھانے والے موجود ہیں۔

(۳) عشق کی جس آتشیں شراب نے تیرے اسلاف کے نشیمن پھونک ڈالے تھے، وہ آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ تیرے دل میں اس کے لئے کوئی سچی تڑپ نہیں۔ سچی تڑپ ہی نہ ہو تو ساقی کا گلہ کرنے سے کیا حاصل؟ وہ تو ہر طلب گار کو نوازنے کے لئے تیار ہے۔

(۴) اہل مغرب کی تہذیب کا اندازہ اس کی ظاہری چمک دمک کی بنا پر نہ کر کیونکہ یہ چمک دمک تو بجلی کے چراغوں کا کرشمہ ہے۔ یعنی مغربی تہذیب

کی ہر شے نمائشی ہے۔ اس کی ساری چمک دمک دکھاوے کی ہے اور باطن سراسر تاریک ہے۔

(۵) جب تک نگاہوں میں عالم گیری کا انداز پیدا نہ ہو، اس وقت تک دلوں میں عالم گیری کے ولولے نہیں اٹھ سکتے۔

(۶) میں خزاں کے موسم میں بھی شکاری کا ہدف نہ بن سکتا تھا، یعنی وہ مجھے شکار نہ کر سکتا تھا۔ ہوا یہ کہ جس شاخ پر میں نے گھونسلا بنا رکھا تھا، اس کے زیادہ تر پتے جھڑ گئے اور بہت کم باقی رہ گئے۔ یوں شکاری کو میرا پتا چل گیا۔ اور اس نے مجھے نشانہ بنا لیا۔

(۷) یہ میرے خیال کی پیداوار نہیں بلکہ حقیقت ہے جو بہت جلد بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے گی کہ اہل یورپ نے دنیا پر مسلط ہونے کی جو تدبیریں اختیار کر رکھی ہیں، وہ سب کی سب ناکام رہ جائیں گی۔ تقدیریں بدل جائیں گی۔ جو آج زمانے کے مالک و مختار بنے بیٹھے ہیں وہ نامرادی کی پستیوں میں گرا دیئے جائیں گے اور جو جگہ جگہ زار و نزار نظر آتے ہیں، ان کے نصیبے چمک اٹھیں گے۔

(۳۷)

(۱) تو فطرت کو عقل کے سامنے لا، یعنی تجھے جو فطری جوہر عطا ہوئے ہیں، ان سے عقل سلیم کے مطابق کام لے۔ رنگ و بو کے مقام یعنی دنیا کو مسخر کرنے کا طریقہ یہی ہے۔

(۲) تو اپنی خودی کھو چکا ہے۔ اس کھوئی چیز کو ڈھونڈ۔

(۳) جس فضا میں تارے چمک رہے ہیں، اس کی کوئی حد و نہایت نہیں۔

تو بھی اپنے دل میں ایسے مقام ہی کی آرزو ہے۔

(۴) تیرے باغ کی حوریں برہنہ ہو رہی ہیں تو پھول اور لالے کے چاک سی لے۔ یہ سل جائیں گے تو حوروں کی برہنگی دور ہو جائے گی۔

(۵) اگرچہ فطرت بھی ذوق سے خالی نہیں اور جو کام اس نے شروع کر رکھا ہے، اسے ادھورا نہ چھوڑے گی، پورا کرکے رہے گی، لیکن جو کام وہ اب تک نہ کر سکی، اسے تو پورا کر۔

مراد یہ ہے کہ فطرت کے بھروسے پر نہ بیٹھا رہ۔ خود بھی کچھ ہمّت کر۔

(۳۸)

فغفوری: فغفور چین کے بادشاہ کا لقب تھا۔ مراد ہے شہنشاہی۔ پیدائی: ظہور۔ شاہین کافوری: سفید رنگ کا شہباز جو بہت کمیاب ہے۔

(۱) یہ گرجے اور کعبہ کے پیشوا دین کے متعلّق جو کوششیں اور کاوشیں کرتے رہے، افسوس کہ ان سے سینے بے نور ہو جانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا یعنی انہوں نے دین کی اشاعت کا جو طریقہ اختیار کیا، وہ غلط تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سینوں میں نور پیدا ہو، لیکن نتیجہ برعکس نکلا۔

(۲) اے بے خبر! تو دل میں یقین پیدا کر۔ یقین ہی کی بدولت وہ درویشی ملتی ہے جس کے سامنے شہنشاہی بھی سر جھکاتی ہے۔

(۳) محبوب سے جدائی کا دکھ ہزاروں رنگ بدلتا ہے۔ کبھی وہ حیرت بن جاتا ہے، کبھی مستی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے، کہیں آہ سحر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی تمام کیفیتیں جو عاشق کو پیش آتی رہتی ہیں، وہ سب محبوب سے جدائی کی مختلف کیفیتیں ہیں۔

(۴) عشق اور مستی کی باتیں سمجھ کی حد سے باہر ہیں۔ صرف اتنا سمجھ میں آیا ہے کہ دل کی موت کا دوسرا نام دوری ہے۔

مراد یہ ہے کہ محبوب سے مکانی جدائی تو ہوتی ہی رہتی ہے، لیکن دل محبوب سے غافل ہو جائے تو اس سے بڑھ کر مصیبت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اصل دوری جو لاعلاج ہے وہی ہے۔

(۵) محبوب اپنے حسن کی مستی کے باعث جلوہ گری کیے بغیر رہ نہیں سکتا، لیکن میری آنکھوں کو جو بینائی دی گئی ہے وہ محبوب کے چھپ جانے اور پوشیدہ رہنے کے اسباب میں سے ہے، یعنی ظاہری بینائی سے محبوب کو دیکھا نہیں جا سکتا۔

(۶) کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ تقدیر کا کاروبار کن طریقوں پر چل رہا ہے؟ تیموری ترک جنہیں ہم لوگ مغل کہتے ہیں، عثمانی ترکوں سے کسی حالت میں بھی کم نہ تھے، لیکن تیموری ترکوں کا نشان تک باقی نہ رہا اور عثمانی ترکوں نے لڑ کر اپنی چھنی ہوئی آزادی محفوظ کر لی۔ ظاہری عقل کے مطابق دونوں کو کامیابی حاصل ہونی چاہیے تھی لیکن خدائی کارخانے کی مصلحتیں اور ہی ہیں۔

یہ مضمون اقبال نے فارسی میں بھی باندھا ہے۔

لوائے سطوت عثمانیاں دوبارہ بلند   بہ حیرتم کہ بہ تیموریاں چہ افتاد درست

(۷) سمجھ میں نہ آیا کہ اقبال درویشانِ حرم کے ہاتھ کیوں کر آ گیا؟ یہ تو

سفید رنگ کا شہباز تھا جو امیروں اور بادشاہوں کو بھی دستیاب نہیں ہوتا۔

(۳۹)

دانشِ حاضر: موجودہ زمانے کا فلسفہ اور سائنس۔ **چوب کلیم:** حضرت موسیٰؑ کا عصا جس سے فرعون کے ساحروں کا جادو باطل ہوگیا۔
گراں سیر: وہ مسافر جو بوجھ کی زیادتی کے باعث تیز نہ چل سکے۔
راحلہ و زاد: سواری اور راستہ کا خرچ۔ **نصاب:** وہ مقدار مال جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔

(۱) موجودہ زمانے کے فلسفہ اور سائنس نے پرانے زمانے کا جادو پھر زندہ کردیا۔ اس دور میں حضرت موسیٰؑ کے عصا کے بغیر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔
معلوم ہے کہ فرعون و موسیٰؑ کے زمانے میں مصر جادوگروں کا بہت بڑا مرکز تھا اور فرعون نے ان سب کو جمع کرکے حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کرایا تھا، لیکن جادوگر خدا کے بھیجے ہوئے جلیل القدر پیغمبر کا مقابلہ کیا کرسکتے تھے۔
اقبال کہتے ہیں کہ جو حالت حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تھی، وہی موجودہ زمانے کے سائنس اور فلسفہ نے اب پیدا کردی ہے۔ لہٰذا عصائے موسیٰؑ کے بغیر گزارہ نہیں، یعنی آسمانی ہدایت کا نور اور اسے دنیا میں پھیلانے کی قوّت فراہم کرنا لازم ہے۔ یہ دونوں چیزیں نہ ہوئیں تو پھر آج کل کے جادوگر ہمارے لئے زندگی دوبھر بنا دیں گے۔

(۲) عقل مکار اور فریبی ہے، وہ سیکڑوں بھیس بدل لیتی ہے۔ کبھی مُلّا بن جاتی ہے، کبھی زاہد اور کبھی فلسفی۔ عشق سادہ لوح اور صاف دل ہے، وہ کوئی

بھروپ نہیں بھر سکتا۔

(۳) عشق کے مسافروں پر کہیں ٹھہرنے کا عیش حرام ہے۔ وہ بظاہر ٹھہرے ہوئے بھی نظر آئیں تو سمجھنا چاہیئے کہ چل ہی رہے ہیں۔

(۴) تو اس لئے سست رفتار ہے کہ سواری اور زاد راہ کے غم کا بوجھ اٹھا رکھا ہے اور بوجھ والا مسافر تیز نہیں چل سکتا۔ اگر اس بوجھ سے سبک دوش ... ہو جائے تو نسیم کی مانند پہاڑوں اور دریاؤں سے گزر جانا مشکل نہیں۔ نسیم کے ساتھ سواری اور زاد راہ کا کوئی بار نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ دریاؤں اور پہاڑوں سے بے تکلف گزر جاتی ہے۔

(۵) درویش کا سرمایہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ آزاد زندگی بسر کر کے اس دنیا سے گزر جاتا ہے۔ اپنے گرد و پیش اسباب جمع نہیں کرتا۔ یہ سونے چاندی کی زکوٰۃ کا مسئلہ دوسروں کے لئے ہے، درویشوں کے لئے نہیں۔

(۴۰)

(۱) ستاروں سے آگے اور دنیائیں بھی ہیں۔ عشق کی آزمائشیں ختم نہیں ہوئیں۔ ابھی اور بھی آزمائشیں ہیں۔

مطلب یہ کہ دنیا دراصل عشق کی آزمائش کا میدان ہوتی ہے چونکہ اور بھی دنیائیں ہیں، اس لئے فرمایا کہ ابھی آزمائشیں ختم نہیں ہوئیں۔

(۲) یہ فضائیں زندگی سے خالی نہیں۔ یہاں اور بھی سیکڑوں قافلے موجود ہیں، جو چلے جا رہے ہیں، یعنی اس وسیع کائنات کا کوئی گوشہ زندگی کے گوناگوں نظاروں سے خالی نہیں۔

(۳) تو رنگ و بو کے اسی عالم پر قناعت نہ کر لے، جسے دنیا کہتے ہیں، اس کے
علاوہ بھی بہت سے باغ اور بے شمار گھونسلے ہیں۔
اگر ایک گھونسلا تیرے ہاتھ سے جاتا رہا تو اس کا غم کیوں کرتا ہے؟
کیا آہ و فریاد اسی گھونسلے پر موقوف تھی؟ اس کے لئے اور بھی بہت
سے مقام ہیں۔

(۴) تو شاہین ہے اور تیرا کام یہی ہے کہ بلند سے بلند تر اڑتا جائے۔ یہی
آسمان نہیں، تیرے سامنے اور بھی آسمان ہیں۔

(۵) تو اسی دنیا کے رات دن میں الجھ کر نہ بیٹھ رہ۔ اور بھی کئی زمان و مکان
ہیں، جن میں سے تجھے گزرنا ہے۔

(۶) وہ وقت گزر گیا جب میں اس محفل میں اکیلا تھا اور کوئی میری حالت
سے واقف نہ تھا۔ اب تو میرے بہت سے راز داں پیدا ہو چکے ہیں۔

(۲۱)

اقبال خود فرمایا ہے کہ یہ شعر فرانس میں لکھے گئے۔

(۱) یورپ کی قومیں اس تلاش میں ہیں کہ دنیا کی عیش و عشرت کو ہمیشہ
کے لئے قائم رکھنے کا کوئی نسخہ مل جائے۔ ان کی اس فضول و لایعنی خواہش
پر ایک بار نہیں، بار بار افسوس۔

(۲) کعبہ کے شیخ نے میری کہانی سنی تو فرمایا کہ تیری فریاد اب پختہ ہو گئی
ہے، اسے دل میں نہ تھام۔ کھلم کھلا سب کو سنا دے۔

(۳) حضرت موسیٰ نے بارگاہِ خداوندی میں یہ درخواست پیش کی کہ اے

باری تعالیٰ! تو مجھے اپنی صورت دکھا۔ میں ایسی کوئی بات کہنے کا حق دار نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے لئے یہ تقاضا جائز تھا۔ اس لئے کہ مقربانِ الٰہی میں سے تھے۔ مجھ گنہگار کے لئے ایسا تقاضا سراسر حرام ہے۔

(۴) اگرچہ اہلِ نظر کی آہ و فریاد عشق کا بھید کھول دیتی ہے، اس کے باوجود عشق کے طور طریقے عام نہیں ہو سکتے، یعنی عشق کا حوصلہ ہر دل نہیں کر سکتا۔

(۵) صوفیوں کے حلقے میں جو ذکر ہو رہا تھا، اس میں نہ کوئی اثر تھا، نہ سوز و گداز، نتیجہ یہ نکلا کہ تو بھی پیاسا رہا اور میں بھی، یعنی نہ تیری طلب پوری ہوئی، نہ میری۔

(۶) تیری بھی آخری منزل عشق ہے اور میری بھی آخری منزلِ عشق ہے، لیکن تو بھی اس میں کمال حاصل نہ کر سکا اور میری حالت بھی یہی ہے۔

(۷) افسوس ہے کہ تجھ سے فقیری کا بھید کھو گیا۔ تو اس کا اہل نہ رہا، اور سلطنت کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ روم و شام کی سلطنت فقیری کا مال ہے؟

(۴۲)

رحیل: کوچ۔

(۱) اگر انسان کی خودی علم سے پختہ ہو جائے یعنی علوم میں پوری مہارت حاصل کر لے تو فرشتوں کے سردار حضرت جبریلؑ کو بھی اس پر رشک آنے لگے۔ اگر خودی عشق سے مضبوط و مستحکم ہو جائے تو اس میں

وہ انقلابی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، جو خدا قیامت کے دن صور اسرافیلؑ کو عطا کرے گا۔

(۳) میں موجودہ زمانے کے فلسفے اور سائنس کے عذاب کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ آگ اور مجھے بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی طرح اس آگ میں ڈالا گیا تھا۔

مراد یہ ہے کہ یہ فلسفہ اور سائنس انسان کو جس طرف لے جاتے ہیں، وہ راہِ حق سے بہت دور ہے، اس لئے اسے آگ قرار دیا اور کہتے ہیں کہ میں اس آگ میں پڑ کر تمام مصیبتیں جھیل چکا ہوں۔ لہٰذا مجھے اس سے پوری آگاہی ہے، لیکن خدا کی رحمت سے یہ آگ انہیں جلا نہ سکی اور وہ اس سے سلامت نکل آئے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نمرود کی آگ سے نکل آئے تھے۔

(۳) خدا جانے، قافلہ کیوں منزل کے دھوکے میں آگرا ترنے اور ستانے کا آرزومند بن گیا۔ اگر وہ حقیقت سے آگاہ ہوتا تو جان لیتا کہ منزل پر ٹھہرنے اور ستانے سے سفر اور کوچ کہیں زیادہ شادمانی کا باعث ہے، یعنی جو لوگ راہِ حق میں جد وجہد کے شیدائی ہیں، وہ نتائج پر کبھی نظر نہیں رکھتے۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتے زندگی بھر اپنے کام ہی میں لگے رہتے ہیں۔

(۴) اگر تجھے بصیرت سے کوئی حصہ نہیں ملا، تو میری شاعری کے حلقہ میں نہ بیٹھ اور میری باتیں نہ سن، اس لئے کہ میں خودی کے نکتے بیان کرتا ہوں

اور یہ نکتے جوہر دار تلوار کی حیثیت رکھتے ہیں، جو بدن کو چھو بھی جائے تو گھاؤ ڈال دیتی ہے۔

(۵) مجھے آج یورپ میں تعلیم کا زمانہ یاد آتا ہے، جہاں دلیلوں سے کام لیا جاتا ہے، حالانکہ وہ دلیلیں فہم پر پے در پے پردے ڈالتی چلی جاتی تھیں۔ اب خدا کی رحمت سے مجھے حضور قلب کی لذّت حاصل ہوئی۔ اس لذّت کے مقابلہ میں 'حجاب دلیل' کی کیا حیثیت ہے؟

(۶) اے مسلمان رات اندھیری ہے اور تو اپنے قافلہ سے بچھڑ گیا ہے۔ میرے نغموں کا شعلہ اس حالت میں تیرے لئے چراغ راہ کا کام دے گا۔ یعنی میرے کلام کی روشنی لے کر تو اپنے قافلے سے جا ملے گا۔

(۷) کعبہ کی سرگزشت بہت ہی نرالی ہے، اگرچہ کہنے میں سادہ ہے، اس کے ساتھ ہی رنگین بھی ہے۔ اس کا آغاز حضرت حضرت اسمٰعیلؑ سے ہوا، حضرت امام حسینؓ اس آخری باب تھے۔

یعنی یہ پوری سرگزشت ایسی قربانیوں سے لبریز ہے، جو ہمیشہ اس دنیا میں تازہ و پائندہ رہیں گی اور ان کی یاد سے کائنات کی فضائیں کبھی خالی نہ ہوں گی۔

(۴۳)

(۱) درس گاہوں میں کہیں خیالات کا بانکپن بھی نظر آتا ہے؟ اور خانقاہوں میں کہیں بھیدوں کی لذّت بھی ملتی ہے؟

مراد یہ ہے کہ آج کل کے اسکول اور کالج فکر و نظر کی تازگی سے خالی

ہو گئے اور خانقاہوں میں بھی کوئی ایسا جوہر باقی نہ رہا جو لوگوں میں عشقِ حق کی حرارت پیدا کر سکتا۔

(۲) یہ بالکل ظاہر ہے کہ چلنے والوں کی منزل دور بھی ہے اور کٹھن بھی۔ اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ قافلے کا کوئی سالار اور رہنما نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں نتیجہ کیا ہوگا؟ قافلہ یا تو راستے سے بھٹک جائے گا یا سفر کی دوری اور مشکلات سے گھبرا کر چلنا چھوڑ دے گا۔

(۳) دین اور وطن کا معرکہ خیبر کے معرکے سے بھی بڑھا ہوا ہے میں پوچھتا ہوں کہ یہ معرکہ سر کرنے کے لئے ہمارے زمانے میں کوئی ایسی شخصیت بھی ہے جس میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے سے اوصاف ہوں؟

دین و وطن کے معرکے سے مراد یہ ہے کہ دین کو سیاست سے الگ رکھا جائے اور جغرافیائی حدود کو قومیت کا معیار بنایا جائے۔ اقبال عمر بھر اس کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ دین کو سیاست سے الگ کر دینے کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سیاست تمام اخلاقی معیاروں سے بے بہرہ ہو جاتی۔ ایسی سیاست یقینی طور پر ابلیسی اور چنگیزی سے کم نہیں ہوتی۔ قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود پر رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالم انسانیت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گیا اور ان میں مسلسل جنگیں شروع ہو گئیں جن کی وجہ سے امنِ عالم خطرے میں پڑا۔ یورپ ان بیماریوں کی عبرت ناک مثال ہے۔ اقبال انسان کی انفرادیت عالمگیر انسانی برادری، امنِ عالم اور حقانی سیاست کے داعی تھے۔ وہ یورپ کی ان بیماریوں سے ابتدا ہی میں آگاہ ہو گئے تھے۔

پھر متواتر ان سے بچے رہنے کی دعوت دیتے رہے۔ یورپ کے متعلق انہوں نے جو پیش گوئیاں کی تھیں، وہ حرفاً حرفاً پوری ہوئیں۔

انہوں نے سچ کہا کہ یہ معرکہ اپنی شدّت اور اثرات کی وسعت کے لحاظ سے جنگ خیبر کے مقابلے میں بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ خیبر کی جنگ حضرت علیؓ نے فتح کی تھی۔ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ دین اور وطن کے معرکے کے لئے بھی ایسی ہی شخصیت کی ضرورت ہے، لیکن آہ کہیں نظر نہیں آتی۔

(۴) علم کی حد سے آگے بڑھ کر صاحب ایمان کے لئے شوق کی لذّت بھی ہے اور دیدار کی نعمت بھی، یعنی لذّت شوق اور نعمت دیدار تنہا علم سے میسر نہیں آتیں۔ علم کے دائرے سے قدم آگے بڑھایا جائے تو یہ چیزیں ملتی ہیں۔

(۵) مے خانے کا شیخ کہتا ہے کہ یورپ کے ایوان کی بنیاد بھی کمزور ہے اور اس کی دیواریں بھی آئینہ کی ہیں۔

پیر مے خانہ سے مراد وہ شخص ہے جو حقیقت شناس ہو۔ ایوان فرنگ سے اشارہ یورپی تہذیب کی طرف ہے، یعنی یورپی تہذیب کی بنیاد مادّیت پر ہے۔ اس کا پورا کاروبار اخلاقی قدروں سے خالی ہے۔ لہٰذا اسے پائداری نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ قرآن کریم کے مقرّر کئے ہوئے اصول کے مطابق پائداری انہیں چیزوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو خلق خدا کے لئے مفید و نفع بخش ہوں۔

لہٰذا تہذیب یورپ کی عمارت کو سست بنیاد اور آئینہ دیوار فرمایا۔

(۴۴)

پیچاک: پیچ وخم۔

(۱) جو واقعہ ابھی پیش نہیں آیا اور آسمانوں کے پردے میں چھپا ہوا ہے، اس کا عکس میری عقل کے آئینے میں موجود ہے، یعنی آئندہ جو کچھ پیش آنے والا ہے، میری دوربینی نے پہلے سے اس کا اندازہ کر لیا ہے۔

(۲) تیری قسمت کا پلٹنا نہ ستارے کی رفتار پر موقوف ہے، نہ آسمان کی گردش پر۔ یہ میری بے باک آہ وفغاں پر موقوف ہے۔ میں سوز وگداز سے بھرے ہوئے شعروں میں جو تعلیم تجھے دے رہا ہوں، اس پر کاربند ہو جانے سے تیری بگڑی بن سکتی ہے۔ اس شعر میں ایک عام درجہ غلط عقیدے کی بھی تردید کی گئی ہے۔ جب کسی پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ میری قسمت کا ستارہ ڈوب گیا، آسمان کی گردش سے مجھ پر یہ بلا نازل ہوئی۔ یہ عقیدہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ستارے یا آسمان نہ کسی کا کچھ بنا سکتے ہیں، نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ بناؤ بگاڑ انسان کے عمل کی اچھائی یا برائی پر موقوف ہے۔

(۳) میں جو دعوت دے رہا ہوں، اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ میری آہ وفغاں میں کوئی زندہ شعلہ ہی نہیں جو تیرے دل میں عشق کی حرارت پھونک دے یا تیرا گھاس پھوس ابھی تک کسی قدر گیلا ہے اور اس میں نمی کا اثر باقی ہے اس لئے شعلہ کارگر نہیں ہوتا۔

(۴) کیا عجب ہے کہ میرے صبح کے نغموں سے وہ آگ بھڑک اٹھے، جو تیری خاک میں دبی ہوئی ہے۔

مراد یہ ہے کہ اے مسلمان! میرے شعروں سے تجھ میں زندگی کی نئی روح پیدا ہو جاتی چاہیئے۔

(۵) یہی خاک رات دن کا طلسم توڑ کر رکھ دے گی، اگرچہ وہ ابھی تک تقدیر کے پیچ و خم میں الجھی ہوئی ہے۔

(۴۵)

زرّاقی: مکر و فریب۔

(۱) صوفی کے حلقہ میں عشق و عاشقی کا سوز و گداز نہیں رہا۔ صرف کراموں کے افسانے باقی رہ گئے۔

(۲) بادشاہ کے محل اور درویش کی خانقاہ دونوں کی حالت بگڑ گئی۔ افسوس کہ تخت اور مصلّا دونوں انتہائی مکّاری اور فریب کاری کا مرکز بن گئے۔ تخت سے اشارہ ہے بادشاہی کی طرف اور مصلّا سے درویشی کی طرف۔

(۳) موجودہ زمانے کے صوفیوں اور ملّاؤں کے اعمال نامے بالکل کورے اور خالی ہیں۔ قیامت کے دن یہ اعمال نامے خدائے پاک کے روبرو پیش ہونگے تو یقیناً یہ شرمساری کا باعث بنیں گے، اس لئے کہ دین کے اجارہ دار ہونے کے باوجود ان لوگوں سے کوئی بھی شایاں کام نہ ہو سکا۔

(۴) جو بندہ رنگ، نسل اور وطن کی پابندیوں سے آزاد ہوا اور فکر و نظر میں عالم گیری پیدا کرے، وہ نہ چینی کہلائے گا، نہ عربی، نہ رومی سمجھا جائے گا، نہ شامی۔ اسلام انسانوں میں یہی عالم گیری پیدا کرنا چاہتا ہے۔

(۵) رات جو شراب پی گئی تھی، اس کا نشہ تو اتر گیا، لیکن ساقی کی محبت و نوازش بدستور دلوں میں موجود ہے۔

(۶) اگر میں باغ میں ایسے نغمے گاتا ہوں جو دلوں کو تلخ و ناخوش گوار معلوم ہوتے ہیں تو انہیں برداشت کر لے اس لیے کہ کبھی کبھی زہر بھی تریاق کا کام دے جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ میں جد و جہد، جفاکشی اور ہمت و مردانگی کا پیغام دیتا ہوں۔ عیش و عشرت کے ماتوں کو یہ پیغام خوش گوار معلوم نہیں ہو سکتا، لیکن اسی میں ان کی بیماریوں کا علاج پوشیدہ ہے۔

(۷) جس شعر میں بجلی کا سوز و گداز اور تب و تاب ہو وہ بادشاہوں اور امیروں کے مال و دولت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

(۴۶)

(۱) اگرچہ اہل یورپ کی دیوانگی بھی بڑی چالاک و ہوشیار ہے، لیکن اس کے زور سے کسی کا گریبان چاک نہ ہو سکا یعنی یورپ نے اگرچہ علوم و فنون اور فلسفہ و سائنس میں ترقی کے بڑے بڑے کمالات دکھائے، مگر دلوں میں وہ عشق پیدا نہ ہو سکا جو اس دنیا کی زندگی میں انسان کا بہترین سرمایہ ہے اور جس پر آخرت کی پاکیزہ زندگی کا انحصار ہے۔

(۲) یقین کی شراب نے زندگی کے ضمیر کو سوز و گداز سے بھر رکھا ہے۔ اے خدا! میری دعا ہے کہ یہ آگ بھڑکائی مدرسے والوں کو بھی نصیب ہو، یعنی خدا کرے، وہ بھی یقین کی دولت بہرہ یاب ہوں۔

(۳) کہکشاں، ستارے اور نیلے نیلے آسمان سب اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ خاکی انسان کب عروج کی منزلیں طے کرتا ہوا اوپر پہنچتا ہے؟

(۴) کیا موجودہ زمانے کی حقیقی پونجی یہی ہے کہ دماغ میں تو علم کی روشنی موجود ہے

لیکن دل نور ایمان سے بالکل خالی ہونے کے باعث سراسر تاریک ہے اور نگاہوں سے حد درجہ شوخی اور بے باکی ٹپکتی ہے۔ یہ پونجی کس کام کی ہے؟

(۵) اگر تو بینائی سے محروم ہو تو اس دنیا کی حقیقت تجھ پر نہیں کھل سکتی۔ ورنہ حق یہ ہے کہ صاحب ایمان کی حیثیت آگ کی ہے اور یہ دنیا محض کھاس پھوس ہے، جسے آگ چند لمحوں میں جلا کر راکھ بنا دے سکتی ہے۔

(۶) زمانے نے صرف عقل کو چراغ راہ سمجھ رکھا ہے یعنی عام تصور یہ ہے کہ عقل کے بغیر راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ کسی کو کیا خبر کہ جنون بھی عقل و فہم کا مالک ہے؟

مراد یہ ہے کہ دنیا کے تمام کاروبار صرف عقل ہی کے بل پر انجام نہیں پاتے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بلند عزم انسان اٹھے اور عقلی تقاضوں کو پس پشت ڈالتا ہوا جرأت و مردانگی سے کام لے کر بڑے بڑے کارنامے انجام دے۔ اہل دانش کو یقیناً اس جوانمرد کی سرگرمیاں دیوانگی معلوم ہوں گی، لیکن ایسے ہی دیوانوں نے وہ کام کئے ہیں جو تاریخ کے اوراق پر سنہری حرفوں میں ثبت ہیں۔

(۷) یہ ساری دنیا مرد مومن کا ورثہ ہے اور میری اس بات پر لولاک کا نکتہ روشن دلیل ہے، یعنی یہ کائنات حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لئے پیدا کی گئی۔ مومن حضور انور ہی کا غلام ہے، لہٰذا یہ ساری دنیا اس کا ورثہ ہوئی۔

(۴۷)

(۱) وہ یکتا موتی یونہی حاصل نہیں ہو جاتا۔ اے ہمت مردانہ! تجھے یک رنگی اور آزادی سے کام لینا چاہیئے۔

اس پوری غزل میں اقبال نے یک رنگی اور آزادی کی مختلف شکلیں پیش کی ہیں۔

(۲) یا سنجر اور طغرل جیسے شہنشاہوں کا طریق جہاں گیری اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ مردانگی میں یک رنگی کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے یا کسی خدامست درویش کے شاہانہ انداز اختیار کر لینے چاہئیں۔ یہ مردانگی اور آزادی کی عمدہ مثال ہے۔

(۳) ابونصر فارابی جیسے حکیم کی حیرت حاصل کر چاہیئے، جو فلسفیانہ فکر و نظر کی نظیر ہے یا مولانا روم جیسا عشق اور سوز و گداز پیدا کرنا چاہیئے، جو حضرت موسیٰؑ جیسے جذب و عشق کا کرشمہ پیش کرتا ہے۔

(۴) یا تو عقل کی عیاری اور مکاری سیکھ لینی چاہیئے، جس کا نمونہ اہل یورپ حیلہ بازی اور حیلہ گری نے پیش کیا یا حضرت علی مرتضیٰؓ جیسا عشق اختیار کر لینا چاہیئے، جو اپنے زور اور بے پناہی کی بنا پر ترکانہ یورش سے مشابہت رکھتا ہے۔

(۵) یا اسلامی شریعت کا پابند ہو جانا چاہیئے یا بت کے دروازے پر چوکیدار بن کر بیٹھ جانا چاہیئے۔ غرض کعبہ ہو یا بت خانہ، جوانمردوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ مستانہ نعرے لگائیں۔

(۶) امیری کی حالت ہو یا فقیری کی، بادشاہی کا نقشہ ہو یا غلامی کا، رندوں جیسی دلیری سے کام لئے بغیر کچھ نہیں بن سکتا۔

مراد یہ ہے کہ انسان جو بھی کام کرے، اس میں لازم ہے کہ وہ یک رنگی آزادی اور مردانگی سے کام لے۔ اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے، ورنہ ہر مرحلے میں ناکام و نامراد ہوگا۔ یک رنگی سے مراد ہے، جو کچھ طے کر لیا، اسی کے پیچھے لگ جانا۔ آزادی سے مراد ہے، اصل مقصد کے حصول کے لئے بے پناہ جدوجہد جاری رکھنا اور کسی بھی مشکل کی پرواہ نہ کرنا۔

(۴۸)

(۱) حذا مست درویش کے حضور میں قلب و روح کو جو سرور حاصل ہوتا ہے، وہ تخت پر بیٹھ کر، سر پر تاج پہن کر اور بڑے بڑے لشکروں کا مالک بن کر بھی حاصل نہیں ہوتا۔

(۲) لا اِلٰہ الا اللہ میں یہ نکتہ چھپا ہوا ہے کہ یہ دنیا بت خانہ ہے اور مردِ حق کو اس میں حضرت خلیل اللہ کی سنّت پر عمل کرنا چاہیئے یعنی اس کا کام یہ ہے کہ بتوں کو توڑے اور بت خانے کو صاف کر دے۔

(۳) تیری دنیا وہی ہے جسے تو خود پیدا کرے، یہ اینٹ پتھر کی دنیا نہیں جو تیری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ہمّت اور قوت عمل سے ایک نیا حلقہ تیّار کر دے اور ظاہر ہے کہ مومن جہاں کہیں بھی ہوگا، ایک ہی قسم کا حلقہ پیدا کرے گا، اس لئے کہ مومن کے عقائد و اعمال ایک نظام

کے ماتحت ہوتے ہیں۔

(۴) خاک کی جس مٹھی کا مقام چاند اور ستاروں سے بھی آگے ہے۔ وہ ابھی راستے ہی میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

یہ اشارہ مسلمان کی طرف ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان کی منزلِ مقصود تو چاند اور تاروں سے بھی آگے ہے، لیکن وہ اپنی کم نظری، بے ہمتی اور بے عملی کے باعث راستے ہی میں چکر لگا رہا ہے، منزل مقصود کی طرف روانہ نہیں ہوا۔

(۵) خشکی اور تری کے کارفرماؤں نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ یورپ بے پناہ سیلاب کے راستہ میں بیٹھا ہے۔

اقبال کا یہ مضمون بھی عام ہے، جس کی زیادہ تشریح غیر ضروری ہے۔ ۱۹۰۷ء سے ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ یورپ کی موجودہ تہذیب اسے لازماً فنا کے گھاٹ اتار کر رہے گی۔ آج ہر شخص ان کے اس عقیدے کی درستی کا بے تکلف اعتراف کر رہا ہے۔

(۶) میری صبح کی فریاد میں ایک نیا جہان موجود ہے۔ اے مسلمان! تو اس کی فضاؤں میں اپنا نصیب تلاش کر لے۔

مراد یہ ہے کہ میں نے شعروں کے ذریعے سے جو پیغام دیا ہے، اس پر کاربند ہو جائے تو تو نئی دنیا پیدا کرے گا۔

(۷) درویش اور فقیر جو ظرف اپنے ساتھ رکھتے ہیں، وہ کدو یا تونبا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے اس درویشانہ کاسے میں خالص شراب بھری ہوئی

ہے۔ تو کاسے کی ظاہری حالت پر نہ جا۔ اس شراب کو غنیمت سمجھ، اس لئے کہ یہ نہ آج کل کے مکتبوں اور درس گاہوں میں ملتی ہے، نہ خانقاہوں میں۔ اس خالص شراب سے مقصود وہ پیغام ہے جو افراد و ملت کے لئے زندگی کا سروسامان ہے۔

(۴۹)

(۱) اگرچہ فطرت نے مجھے تیز و طرار عقل نہ بخشی، لیکن میری خاک میں اڑنے کی قوت موجود ہے۔

(۲) یہ وہ خاک ہے جس کی دیوانگی عقل کے لئے صیقل کا کام دیتی ہے اور اسے جلا دے کر چمکاتی ہے۔ یہی وہ خاک ہے۔ جس پر حضرت جبریل بھی رشک کرتے ہوئے اپنی قبا چاک کر ڈالتے ہیں۔

(۳) اس خاک کو آشیانے کی کوئی پرواہ نہیں، اس پہ باغ کے صحن سے گھاس پھوس اور تنکے نہیں چنتی۔ ظاہر ہے کہ تنکے آشیانہ بنانے کے لئے چنے جاتے ہیں، جسے آشیانے کی ضرورت نہ ہو، وہ کیوں تنکے چنے گا؟ اس شعر میں دنیا کے اسباب سے کامل بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۴) اس خاک کو اللہ نے وہ آنسو بخشے ہیں، جن کی چمک دیکھ کر ستارے بھی شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

(۵۰)

رشی: لفظی معنی خدا پرست، عابد، زاہد، گیانی۔ یہ لفظ ہندو بھگتوں اور عابدوں کے لئے مخصوص ہے۔ اقبال نے یہاں اسے

گاندھی جی کے لئے استعمال کیا ہے۔

(۱) جن لوگوں کی نظریں دور ہیں اور دماغ روشن ہیں، وہ نئی بستیاں آباد کرلیں گے۔ میری نگاہیں ...... کوفہ اور بغداد کی طرف نہیں اٹھتیں۔

(۲) یہ ہماری درس گاہیں، یہ نوجواں طالب علم، ان کا کھانا پینا عیش ومستی، بناؤ سنگار، آرائش وزیبائش، یہ تمام چیزیں کس درجہ عبرت ناک ہیں! یہی درس گاہیں اور یہی نوجوان ہیں، جن کی وجہ سے یورپ کے شراب خانوں میں رونق اور چہل پہل ہے۔ یعنی انہیں کے باعث یورپی تہذیب ہم میں پھیل رہی ہے۔

(۳) مجھے نہ آج کل کے فلسفیوں سے غرض ہے، نہ آج کل کے ملاؤں سے۔ فلسفی جو کچھ سکھاتے ہیں وہ دل کے لئے موت کا سامان ہے یعنی اس میں یقین وایمان باقی نہیں رہتا اور زندگی کی حقیقی روح ختم ہو جاتی ہے۔ ملاؤں کی وجہ سے فکر ونظر میں خرابی وانتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس سبب سے فتنوں اور جھگڑوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

(۴) میری کیا مجال ہے کہ شہر کے مفتی کے خلاف کوئی بات کہوں، اور اس کی ہتک کا باعث بنوں۔ البتہ عرض کرنے سے رک نہیں سکتا کہ میں دل کی کشادگی چاہتا ہوں۔

مراد یہ ہے کہ فقیہ شہر میں یہ خصلت موجود نہیں۔ اس کا دل بھی تنگ ہے اور نظر بھی تنگ۔

(۵) ایران کا شہنشاہ خسرو پرویز عیش و عشرت کے لئے شہرہ آفاق ہے۔ میں کہتا ہوں، دنیا میں یہ عیش و عشرت خریدی جا سکتی ہے اور اس کا حاصل کرنا مشکل نہیں۔ لیکن فرہاد کو غم کی جو دولت ملی تھی، وہ کسی بازار سے خریدی نہیں جا سکتی۔ صرف خدا کی دین ہے۔ وہ کریم جسے چاہے، دے دے۔

(۶) میں نے درویشی اور خدا مستی کے تمام راز اس غرض سے کھول کر رکھ دیئے کہ درس گاہیں اور خانقاہیں ان بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہوں جو انہیں حقیقی مقصد و مدعا کی طرف گام زن نہیں ہونے دیتیں۔

(۷) گاندھی جی نے اس غرض سے کئی برت رکھے کہ برہمن کا طلسم ٹوٹ جائے۔ ہندو قوم چھوت چھات سے آزاد ہو جائے۔ اونچ نیچ اور پاک ناپاک کی تمیز اٹھ جائے اور اس میں مساوات پیدا ہو جائے۔ لیکن افسوس کہ برتوں سے یہ مقصد پورا نہ ہوا۔ سچ ہے، کوئی شخص حضرت موسیٰؑ کا سا بلند مقصد لے کر اٹھے تو جب تک اس کے پاس عصائے موسوی نہ ہو، وہ مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوشش بے نتیجہ رہتی ہے یعنی اس مقصد کے لئے جس زور و قوت کی ضرورت ہے اسے استعمال کئے بغیر یہ پورا نہیں ہو سکتا۔

(۵۱)

حنا بندی: لفظی معنی مہندی لگانا۔ محاورے میں بناؤ سنگار۔

کاشی: منسوب بہ کاشان جو ایران کا مشہور مقام ہے۔

(۱) فرشتوں نے خدا کی بارگاہ میں اقبال کے خلاف یہ شکایت پیش کی کہ یہ

بڑا گستاخ ہے، فطرت کے بناؤ سنگار میں لگا رہتا ہے۔

(۲) اگرچہ وہ خاکی ہے، یعنی دنیا کا رہنے والا ہے، مگر اس کے طور طریقے ایسے ہیں، گویا وہ آسمان کا رہنے والا ہے۔ نہ اسے روم سے علاقہ ہے، نہ شام سے، نہ کاشان کی نسبت پسند کرتا ہے، نہ سمرقند کی، گویا دنیا کی تمام نسبتوں سے آزاد ہے۔

(۳) اس نے فرشتوں کو انسان کی تڑپ سکھائی اور وہ انسان کو خداوندی کے طور طریقے سکھاتا ہے۔

مطلب یہ کہ فرشتوں کے دل انسان کا سا عشق پیدا کیا اور انسان کے دل میں ساری مخلوق سے اعلیٰ اور اشرف ہونے کا جذبہ بھر دیا۔

(۵۲)

(۱) رازی کی نردوں میں سے کوئی باقی نہ رہی۔ اس کا کھیل بھی ختم ہو گیا۔ رومی جیت گیا اور رازی ہار گیا۔

مراد یہ ہے کہ زندگی میں کامیابی اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کا سینہ عشقِ حق سے معمور ہو۔ اس راستے میں فلسفہ اور حکمت کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ اس کی دو واضح مثالیں موجود ہیں۔ امام رازی جو فلسفہ و حکمت کے امام تھے، ان کی دلیلوں کا کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا۔ مولانا روم نے انہیں کے لئے کہا تھا:۔

گر بہ استدلال کارِ دیں بدے
فخرِ رازی رازدارِ دیں بدے

لیکن فلسفہ اور حکمت امام موصوف کو کسی منزل پر نہ پہنچا سکے، اور

مولانا روم عشق حق کی بدولت کامیابی کی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

واضح رہے کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں رازی کا مہرہ اور اس کی مہرہ بازی مقصود ہے۔

(۲) جمشید نے جو پیالہ بنایا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ بادشاہی نری شیشہ بازی اور عیّاری ہے۔ یہ عیاری اب تک بدستور چلی جا رہی ہے۔

جمشید کے پیالے کو شیشہ بازی اس لئے کہا کہ وہ بلور کا تھا مناسبت کسی شرح کی محتاج نہیں۔

(۳) نہ تیرا دل مسلمان ہے، نہ میرا۔ تو بھی ظاہرداری کی نماز پڑھ رہا ہے، میں بھی ظاہرداری کی نماز پڑھ رہا ہوں۔

مطلب یہ کہ اسلام ہمارے دلوں میں نہیں اترا۔ اس کی حقیقت سے ہم ٹھیک ٹھیک آشنا نہیں ہوئے۔ ہم عبادت بھی کرتے ہیں تو اس کی حیثیت محض رسمی ہے۔

(۴) جس معرکے میں ملّا غازی بن جائیں، اس کا انجام مجھے خوب معلوم ہے۔

اس شعر میں معرکے سے مراد جنگ یا جہاد نہیں۔ صرف یہ ہے کہ جب ملّا آپس میں کسی مسئلے میں ٹکرا جائیں اور ایک دوسرے کے خلاف لفظی جنگ شروع کر دیں تو اس کا انجام بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۵) محبّت کی باتیں کسی ایک زبان سے مخصوص نہیں۔ وہ ترکی میں ہوں یا عربی میں، بہرحال میٹھی معلوم ہوتی ہیں یعنی محبّت ملک، زبان، نسل اور قوم کی نسبت سے بہت بالا ہے۔

(۶) بت سازوں کا کام یہ ہے کہ پتھر تراش کر بت بنائیں اور حضرت ابراہیمؑ کی پاک سنت پر عمل کرنے والوں کا وظیفہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پتھروں کو پگھلا کر پانی کر دیں، یعنی پتھر کی طرح سخت دلوں کو سوز و گداز سے بھر دیں اور ہر ایسی چیز کا وجود ختم کر دیں جو بت بنانے کے کام آسکتی ہو۔

(۷) اے میرے محبوب! تو ہی زندگی ہے۔ تجھی سے سب کو بقا اور پائداری حاصل ہوتی ہے۔ تیرے سوا جو کچھ ہے، اسے خاک چھاننے کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۵۳)

(۱) اے مسافر! اٹھ کہ جرس فریاد کر رہا ہے یعنی قافلے کے روانہ ہونے کا گھنٹہ بج رہا ہے اور قافلہ چل پڑا ہے۔ افسوس اس مسافر پر جو کوچ کے لئے سواری کا انتظار کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ ضروری نہیں، سواری اسے میسر آجائے۔ جو منزل مقصود کے والہ و شیفتہ ہوتے ہیں، وہ بہر حال چل پڑتے ہیں۔ سواری با زاد راہ ہاتھ آئے یا نہ آئے۔

مقصود اس شعر سے یہ ہے کہ ہر انسان کو نصب العین کے لئے برابر جد و جہد جاری رکھنی چاہیئے، خواہ اندازہ کے مطابق سامان پورا میسر ہو یا نہ ہو۔

(۲) اے موجودہ دور کے مسلمان! تیری طبیعت کا رنگ بھی اور ہے، اور تیرا زمانہ بھی بدلا ہوا ہے۔ خانقاہی سلسلہ تیرے لئے موزوں معلوم نہیں ہوتا۔

مطلب یہ کہ ممکن ہے۔ اس سلسلے نے کسی زمانے میں خلق خدا کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہوں، مگر موجودہ زمانے کے تقاضے دوسرے ہیں۔ اس سلسلہ سے کام لے کر کچھ خدمت انجام دینا ممکن نہیں۔

(۳) اے سلوک کی منزلیں طے کرنے والے! سوچ سمجھ سے کام لے۔ تیرے سامنے دو سوال پیش ہیں۔ آیا دل کو عقل کا غلام بن کر رہنا چاہیئے، یا اس کی پیشوائی کا درجہ حاصل کرنا چاہیئے؟ فیصلے کی یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اقبال کے لئے عقل کی غلامی کے روادار کبھی نہیں ہو سکتے۔ ان کی دعوت یہی ہے کہ دل کو عقل کا امام بننا چاہیئے۔

(۴) جس فرد کی زبان پر زمانے کی گردش کا گلہ ہو، سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی خودی صبح و شام کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ جو شخص اپنی خودی کو اس درجہ پختہ کر لے کہ وہ شام و سحر کی قید سے بالا ہو جائے اس کی زبان پر زمانے کی گردش کا گلہ کیوں کر آ سکتا ہے؟ زمانے گردش تو شام سحر کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

(۵) اے چمن میں نغمے گانے والے پرندے! تیرے گیتوں کا حقیقی صلہ اور انعام یہی ہے کہ تیری وجہ سے پھولوں کی آگ تیز ہو گئی یعنی ان کی رونق، تازگی اور شادابی بڑھ گئی۔

اس شعر میں اشارہ اپنی طرف ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں میں زندگی کی جو نئی روح پھونکی، اس کے لئے کسی انعام کا طلب گار نہیں میرے لیے یہی انعام بس کرتا ہے کہ میری قوم میں زندگی اور بیداری پیدا ہو گئی۔ اس کے

دل میں عشق حق کی آگ بھڑک اٹھی۔

(۵۷)

آتش آشامی: لفظی معنی آگ پینا۔ محاورے میں تیز شراب پینا۔

اعجمی: نادان اور عامی۔ احرام: وہ خاص لباس جو حج کے موقع پر پہنا جاتا ہے۔ چونکہ یہ لباس پہن لینے کے بعد مقرّر وقت کے لئے حاجی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لیتا ہے، اس لئے لباس کا نام احرام (اپنے اوپر کچھ چیزیں حرام کر لینا) اسے جامہ احرام یا جامۂ احرامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ اقبالؔ نے استعمال کیا۔ مقامر: قمار باز، جواری۔ بسطامی: اشارہ ہے حضرت بایزید بسطامیؒ کی طرف۔ ناخوش اندامی: جسم کا غیر موزوں ہونا جس پر کوئی لباس زیبا معلوم نہ ہو۔

(۱) میرے نغموں سے اہل معرفت اور عامی دونوں زندہ ہو گئے۔ میں نے ان سب کے دل میں محبّت کی تیز شراب پینے کا ذوق پیدا کر دیا۔

(۲) کعبہ کے پاس کوئی نادان اور عامی آدمی یہ ترانہ گا رہا تھا کہ احرام کے لباس تار تار ہو گئے یعنی مسلمانوں میں ادائے فرائض کا پہلا سا ذوق ہی باقی نہ رہا اور حالت بہت بگڑ گئی۔

(۳) حضرت امام حسینؓ کا مقام اور مرتبہ ایک ہمیشہ قائم رہنے والی حقیقت ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ البتہ کوفیوں اور شامیوں کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔

کوفیو اور شامیوں سے مراد یہاں وہ گروہ ہیں جو امام حسینؓ کے خلاف

جنگ آزما ہوئے تھے، لیکن حقیقت میں اس سے مراد دشمنان حق ہیں، خواہ وہ کہیں ہوں۔ مقام شبیری یہاں حق کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ حق ہمیشہ ایک حال پر قائم رہتا ہے۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ کیسے ہی حالات پیش آجائیں، اس کے طور طریقے اور انداز یکساں رہیں گے۔ وہ ہر باطل کے مقابلے پر ڈٹ جائے گا اور مشکلات سے بالکل بے پروا رہے گا اگرچہ انجام کتنا ہی دردناک ہو۔ یہی حضرت امام حسینؓ کا نمونہ تھا۔ دشمنان حق کبھی فوجی قوت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور حق کے لئے میدان جنگ کا معاملہ پیش آجاتا ہے۔ کبھی وہ سامراج کے لئے مختلف بھیس بدل لیتے ہیں اور قوموں کی آزادی پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ کبھی مختلف مضامین کی کتابوں اور مقالوں کے ذریعے سے حق دشمنی کی حرص پوری کرتے ہیں۔ غرض ان کے بہت سے ڈھنگ ہیں۔ حق کا شیوہ ایک ہے۔ باطل کے مقابلہ میں ہر جگہ ڈٹ جانا اور اسے مٹائے بغیر دم نہ لینا، خواہ کوئی صورت پیش آجائے۔

(۴) اے مسلمان! جن قماربازوں اور جواریوں سے تجھے سابقہ پڑا ہے، وہ بڑے ہی چالاک، ہوشیار اور تجربہ کار ہیں۔ تیرے ہاتھ ابھی مشاق نہیں ہوئے لہٰذا مجھے ڈر ہے کہ تیری ناتجربہ کاری تجھے ہرا نہ دے۔

(۵) یہ تعجب کی بات نہیں کہ ملت اسلامیہ کو پھر سلطان سنجر جیسا جاہ و جلال اور حضرت جنیدؒ و حضرت بایزیدؒ کا سا فقر عطا ہو جائے۔

(۶) میرا جسم اگرچہ کسی زیبا لباس کے لائق نہ تھا، لیکن اے میرے مولا! اے کریم مطلق! تو نے اپنی خاص مہربانی سے مجھے علم و ہنر کی قبا عنایت فرما دی۔

(۵۵)

(۱) ہلال تمام مقامات سے گزرتا ہوا بدر بن گیا، اس لئے کہ اس نے دوڑ دھوپ نہ چھوڑی، کسی جگہ ٹھہرنا گوارا نہ کیا۔ سچ ہے، دوڑ دھوپ کے بغیر کب کسی کو کمال حاصل ہوا ہے؟

(۲) جس کلی کو سورج کی جھلک نصیب نہ ہو، اسے اگر پھونکیں مار مار کر شگفتہ بھی کر لیا گیا تو کیا ہوا؟

پھول دو چیزوں کے ذریعے سے طبعی رنگ میں کھلتا ہے، اول صبح کی نسیم، دوم سورج کی جلوہ افشانی۔ اسی طرح اس کی شادابی اور نکہت پاشی اصل رنگ میں نمایاں ہوتی ہے۔ جس غنچہ کو پھونکیں مار مار کر شگفتہ کیا جائے، اس میں نہ طبعی شادابی ہوگی اور نہ طبعی خوشبو۔

اقبال کی مراد غالباً یہ ہے کہ مسلمان کو الٰہی فیض کے حقیقی سرچشمے سے فائدہ اٹھانا چاہئے یعنی قرآنی تعلیم کا پابند ہو کر عزت و عظمت حاصل کرنا اس کے لئے زیبا ہے۔ اہل یورپ کی نقالی کر کے سر بلند ہونے کی آرزو رکھنا ایسا ہی ہے، جیسے کلی کو پھونکیں مار مار کر شگفتہ کیا جائے۔

(۳) تیری نظر پاک ہے تو سمجھنا چاہئے کہ تیرا دل بھی پاک ہے، اس لئے کہ خدا نے دل کو نظر کے تابع کر دیا ہے۔

(۴) دل جلا لالہ باغ کی کیاریوں میں شادابی و تازگی کا طبعی مقام حاصل نہ کر سکا کیونکہ گیہوں اور جو کی دنیا اس کے لئے راس نہیں۔

لالہ صحرا اور کہسار میں کھلتا ہے اور وہیں اس کی بہار قابل دید ہوتی

ہے۔ یہاں لالے سے مراد مسلمان قوم ہے جس کا اصل وطن صحرائی و کہستانی تھا۔ جب جو اور گندم بکثرت پیدا کرنے والی سرزمینوں میں پہنچی تو وہاں فروغ نہ پا سکی۔ یہ مضمون اقبال نے بیسیوں شعروں میں مختلف طریقوں پر باندھا ہے۔

(۵) سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان شہاب الدین غوری کے معرکے باقی نہ رہے، لیکن امیر خسرو کے گائے ہوئے نغمے برابر تر و تازہ اور میٹھے معلوم ہو رہے ہیں۔

(۵۶)

(۱) اے عقل مند! تو اس دنیا کی صبح و شام میں کھو نہ جا۔ ایک اور بھی دنیا ہے جس میں نہ گزری ہوئی کل ہے نہ آنے والی کل۔

(۲) کسے معلوم کہ جو حالات کل پیش آنے والے ہیں، ان کی حقیقت و حیثیت کیا ہے۔ مسجد، مدرسہ اور شراب خانہ تو مدّت سے چپ بیٹھے ہیں؛ وہ اس ہنگامے میں کیا حصّہ لیں گے؟

مسجد سے مراد علما ہیں، مکتب سے درس گاہیں اور مے خانے سے وہ خانقاہیں جو عشق حق کی دعوی دار ہیں۔

(۳) جو خالص موتی سیپی کی گود میں نہیں ملتا، میں نے اسے ان آنسوؤں میں پایا ہے، جو صبح کے وقت آنکھ سے بہتے ہیں۔

آہ سحر گاہی بھی اقبال کے خاص مضامین سے ہے۔ اس سے مراد صبح کی عبادت اور خدا کی بارگاہ میں آہ و فریاد ہے۔

(۴) یورپ کی تہذیب میں تکلف اور بناوٹ کے سوا رکھا ہی کیا ہے؟

چہرہ حسن سے منور ہو تو اپٹنا بیچنے والے کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت رہتی ہے؟ حسین شخص کو سرخی پوڈر وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ یورپی تہذیب حقیقی حسن سے عاری ہے، لہٰذا وہ بناؤ سنگار سے کام لے کر اپنے آپ کو حسین ظاہر کرنا چاہتی ہے۔

حقیقی حسن تکلفات کا روادار نہیں۔

(۵) ساز بجانے والے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اوپر غفلت طاری نہ ہونے دے۔ یہ نہ سمجھ لے کہ جو نغمے طبیعت سے اٹھتے ہیں، وہ سب کے سب درست ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے سر تال غلط بھی ہو جاتے ہیں، یعنی انسان جن چیزوں کو ندائے غیب سمجھتا ہے، ان کا مطلب سمجھنے یا پیش کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔

(۵۷)

شبانی: گلہ بانی، گڈریاپن۔

(۱) جن خانقاہوں میں کبھی شیری اور شہنشاہی پرورش پاتی تھی، آج وہاں لومڑی کی عیاری و مکاری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

(۲) قوم کے لیڈروں اور سرداروں میں مجھے ایسی گلہ بانی نظر نہیں آتی جو حضرت موسیٰؑ کی طرح کلیم اللّٰہی کی تمہید بن سکے۔

حضرت موسیٰؑ نے ایک مدت تک حضرت شعیبؑ کے پاس رہ کر بھیڑ بکریاں چرائی تھیں۔ اس کے بعد حضرت شعیبؑ کی صاحب زادی سے شادی کی۔ پھر مصر کے قصد سے نکلے تو راستے میں طور کا واقعہ پیش آیا۔ گویا ان کی

گلّہ بانی کلیم اللّٰہی کی پہلی منزل تھی۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہمارے سالاروں اور لیڈروں میں نہ تو گلّہ بانی کی صفت ہے، جس میں تربیت پاکر حضرت موسیٰؑ کی لیڈری کے جوہر پختہ و استوار ہوئے۔ نہ یہ امّید رکھّی جاسکتی ہے کہ وہ خدائے پاک سے رشتہ جوڑ کر قوم کو اس طرح منزلِ مقصود پر پہنچا دیں گے، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو پہنچایا تھا۔

(۳) خوش آواز پرندے کو اس باغ میں گیت گانے سے کیا لذّت حاصل ہوسکتی ہے، جہاں اس کا سانس ساتھ دینے سے عاجز ہوجاتا ہے؟

(۴) ایک سرمستی و حیرت ایسی ہوتی ہے، جس میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے۔ ایک سرمستی و حیرت ایسی بھی ہوتی ہے، جو سراسر علم و آگاہی ہو۔

اس میں فلسفیوں اور عارفوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ فلسفی کی حیرت اور اس کا انہماک اسے کسی منزل پر نہیں پہنچاتا، عارف کی حیرت اور اس کا انہماک سراسر آگاہی ہوتا ہے۔

(۵) میرا اعلیٰ درجہ کا کلام بجلی کی طرح چمک رہا ہے تاکہ رات کے اندھیرے میں چلنے والے مسافر اس کی روشنی سے راستہ پاتے جائیں اور ادھر ادھر نہ بھٹکیں۔

(۵۸)

سلمان: اشارہ ہے غزنوی دور کے مشہور فارسی شاعر مسعود سعد سلمان کی طرف، جو لاہور میں مدّت تک حاکم بھی رہا اور قید بھی۔

(١) مجھے خوش گو فارسی شاعر مسعود سعد سلمان کا یہ نکتہ خوب یاد ہے کہ دنیا سختیاں سہنے والے جوانمردوں کے لئے تنگ نہیں ہو سکتی۔ وہ جہاں جائیں گے اپنی ہمّت و مشقّت کی بدولت اطمینان کی زندگی بسر کریں گے۔

(٢) علم و دانش کی روشنی نصیب نہ بھی ہو تو اس کے بغیر زندگی گزاری جا سکتی ہے، لیکن جینے کے حوصلے اور شاہین کی سعی و تلاش ہر حال میں ضروری ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہمّت و حوصلہ اور تگ و دو لازم ہے۔ علم میں بلند رتبہ حاصل نہیں تو نہ سہی۔

(٣) بلبل اور مور کی پیروی سے توبہ کر اور بیچارہ بلبل کیا ہے؟ فقط ایک آواز اور مور کیا ہے؟ محض رنگ۔ آواز اور رنگ کی پیروی سے کیا حاصل ہوگا۔

(٥٩)

(١) تاج، تخت اور سپاہ فقر کے گوشے ہیں، فقر سرداروں کا سردار اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

(٢) علم کا مقصود یہ ہے کہ عقل و خرد میں پاکیزگی اور جلا پیدا ہو جائے۔ فقر دل اور نگاہ کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

(٣) علم عالم اور فلسفی کی متاع ہے، فقر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کی متاع ہے۔ علم راستہ ڈھونڈتا رہتا ہے، فقر راستہ جانتا ہے۔

(٤) فقر انسان کو اس مقام پر پہنچاتا ہے، جہاں وہ سب کو اپنی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ علم کچھ دکھا نہیں سکتا صرف بتا سکتا ہے۔ فقر میں مست و بےخود ہونا ثواب کا باعث ہے، علم میں مست و بےخود ہونا گناہ ہے۔

(۵) علم کے نزدیک 'موجود' کا تصوّر اور ہے، فقر کے نزدیک اور۔ اگرچہ دونوں اشہد لا الٰہ پڑھتے ہیں، یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود، لیکن دونوں کا مطلب و مفہوم الگ ہوتا ہے۔

(۶) جب خودی کی تلوار فقر کی سان پہ چڑھ کر تیز ہو جاتی ہے تو ایک سپاہی کی ضرب پورے لشکر کا کام دیتی ہے۔

(۷) تیرے خاکی جسم میں اگر زندہ و بیدار دل موجود ہو تو تیری نظر سورج اور چاند کے آئینے توڑ کر رکھ دے۔

(۶۰)

اعراف: اس کا اطلاق ہر ایسی چیز پہ ہوتا ہے جو زمین سے بلند ہو۔ قرآن مجید میں جنّت و دوزخ کے درمیان کی بلندی کو اعراف کہا گیا جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ صاحب کشاف ابوالقاسم محمود زمخشری جس کی تفسیر کا نام کشاف ہے اور عربیت کے لحاظ سے وہ مستند تفسیر مانی جاتی ہے۔

(۱) میں انتہائی جوشِ جنوں میں تھا لیکن کعبہ کے گرد طواف میں مصروف رہا۔ کسی دوسری طرف میری توجہ منعطف نہ ہوئی اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ کعبہ کا غلاف صحیح سلامت رہا ورنہ کیا تعجب تھا کہ میں حالتِ جنون میں اسے چاک کر ڈالتا؟

(۲) شہر کے تمام عالم پہلے تو کسی بات پہ ... ہم داستاں نہ ہوتے تھے لیکن میری مخالفت میں انہوں نے اتفاق کر لیا۔ ایمان والے لوگوں کو

مبارک باد دیتا ہوں کہ بارے وہ کسی بات پر متفق تو ہوئے۔

(۳) یونان کا مشہور فلسفی افلاطون ایک ایسے مقام پر پڑا تڑپ رہا ہے، جس کے متعلق نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے حضوری حاصل ہو گئی، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تجلی ذات اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ دونوں کے بیچ میں ہے۔ عقل والوں کا مقام روز ازل سے اعراف ہی رہا ہے، یعنی وہ بلندی جو جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے۔

(۴) جب تک قرآن مجید خود تیرے ضمیر پر نازل نہ ہو، یعنی تو اپنے دل میں ایسی کیفیت پیدا نہ کرے، گویا کتاب کے اصل حقائق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ رہا ہے۔ اس وقت تک رازی زمخشری تیرے عقدے کھولنے میں مدد نہیں دے سکتے۔ غرض قرآن مجید کو سمجھنے کی صحیح صورت یہی ہے کہ انسان اپنے قلب اور روح کو اس میں گم کر دے۔ مفسروں کی تفسیریں پڑھ کر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۵) عام شرابوں کی تلچھٹ اگرچہ صاف نہیں ہوتی تاہم یورپی شراب کی تلچھٹ بھی صفائی سے خالی نہیں، مصیبت یہ ہے کہ اس کا نشہ اور اس کا سوز پائدار نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ یورپی علوم، خواہ معمولی بھی ہوں، تو وہ فائدے سے خالی نہیں۔ البتہ ان سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اس میں پائداری نہیں پائی جاتی۔

---

(٦١)

(١) شعور، ہوش اور عقل کا معاملہ عجب ہے۔ عشق کے مقام میں یہ سب چیزیں دل اور نظر کی دشمن ہیں۔

مطلب یہ کہ جب تک شعور، ہوش اور عقل سلامت رہیں، عشق کی منزلیں خطرے سے خالی نہیں سمجھی جا سکتیں۔ عشق اور عقل و ہوش میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عقل و ہوش نفع و نقصان کا اندازہ کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے اور عشق وہی کرتا ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ نفع نقصان کو کبھی نہیں دیکھتا۔ لہٰذا دونوں میں رقابت اور دشمنی ناگزیر ہو گئی۔

(٢) مجھے خوب معلوم ہے کہ قوم کا انجام کیا ہو گا؟ اس لئے کہ جو لوگ اس کی رہنمائی کے ذمہ دار ہیں، وہ نظری مسئلوں میں الجھے ہوئے ہیں یعنی انہیں ایسے مسائل سے دلچسپی ہے جن کی حیثیت نظری ہے، مثلاً فلسفہ حکمت وغیرہ۔ ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں جو قوم میں عملی روح پیدا کرتے ہیں اور ایک خاص پروگرام کے مطابق اسے آگے بڑھاتے ہیں۔ لطف یہ کہ نظری مسائل کو بھی ان لوگوں نے حل نہیں کیا، بلکہ ان میں الجھے ہوئے ہیں۔

(٣) باغ کا پرندہ اگرچہ میرے نشیمن کے گرد چکر لگا رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے نغموں میں اس غریب کا کوئی حصہ نہیں۔

میرے نشیمن کے گرد چکر لگانے کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس سے بھی فائدہ اٹھا لیا گیا گویا میرے کلام کو بار بار پڑھنے یا مجلسوں میں گائے ہوئے سننے سے کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔ ضروری ہے کہ اس کے معانی پر غور کرکے

جو کچھ میں نے کہا ہے، اس پر پختگی سے عمل کیا جائے۔

(۴۴-۵) میں نے سنا ہے کہ عثمانی ترکوں کو بات کی تہ تک پہنچنے میں خاص شہرت حاصل ہے۔ کاش کوئی انہیں اقبال کا یہ نادر شعر سنا دے۔ افسوس کہ وہ لوگ جن کے نشیمن سے ستارے بہت قریب ہیں، یورپ کو اپنا ہمسایہ سمجھنے پر نازاں ہیں۔ آخری شعر میں ترکوں کی اس پالیسی پر ایک لطیف طنز کی گئی ہے کہ وہ غازی کمال اتاترک کی قیادت میں ایشیائی اور اسلامی قوموں کے بجائے یورپ سے زیادہ قریب ہو گئے تھے اور اسی پر فخر کرتے تھے۔ انہوں نے طور طریقے بھی یورپ ہی کے اختیار کر لئے تھے۔ اقبال کہتے ہیں ترکوں کے لئے کیا زیبا ہے کہ وہ یورپ کے ہمسایہ ہونے پر فخر کریں؟ وہ اپنے حقیقی رتبے پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو کہ یورپ یا کسی دوسری قوم کی ہمسائگی پر فخر تو رہا ایک طرف، وہ تو بلحاظ رفعت و عظمت ستاروں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

رباعیات

(۱)

کعبہ کے طور طریقوں میں اجنبیت اور بیگانگی پائی جاتی ہے کلیسا کا انداز سراسر تاجرانہ و سوداگرانہ ہے۔ بے ذوقی کے اس زمانے میں میرے پھٹے ہوئے پیراہن کو تبرک سمجھ اس لئے کہ اہل جنوں کا نام نہ رہا اور تنہا مجھ میں جنوں کی یہ علامت باقی رہ گئی۔

مراد یہ ہے کہ مسلمان اور عیسائی سب دین کے حقیقی طور طریقے چھوڑ بیٹھے۔ صرف میں زندگی کی منزلوں کا پتا دے رہا ہوں۔ اس درس و تعلیم کو اپنے لئے غنیمت سمجھ۔

(۲)

ظلام: ظلمت کی جمع، اندھیرے۔

اے موج! تو سمندر کے اندھیروں میں کھو کر سنبھل، تڑپ، بل پیچ کھا، اپنی حالت و کیفیت بدلتی رہ۔ ساحل سے بغل گیر ہونا تیری قسمت میں نہیں لکھا۔ تو ابھر اور سمندر کی بے کراں پہنائی میں جس طرف چاہے نکل جا۔

مطلب یہ کہ زندگی میں کتنی ہی مشکلات پیش آجائیں، جوانمردوں کا کام یہ ہے کہ ان مشکلات میں بھی اپنا راستہ خود پیدا کریں، اگرچہ انہیں کتنی ہی جدوجہد کرنی پڑے۔

(۳)

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کسی خاص جگہ رہتا ہوں یا جگہ اور مکان کی قید سے آزاد ہوں۔ میں دنیا کو دیکھ رہا ہوں، یعنی وہ مجھ سے الگ ہے یا خود ہی ساری دنیا ہوں۔ محبوب حقیقی اپنے لامکان ہونے کے نشہ میں شوق سے چور رہے، لیکن مجھے یہ تو بتا دے کہ میں کہاں ہوں؟

(۴)

عشق کا کاروبار ہمیشہ پریشان سے رہتا ہے۔ اس میں ترتیب و تنظیم نہیں ہوتی۔ میرے رنگین نغمے اس سے زیادہ پریشان ہیں۔ پریشانی کا اندازہ اس بات سے کر لینا چاہیئے کہ کبھی تو میں محبوب کے وصل کی لذت حاصل کرنے میں لگ جاتا ہوں اور کبھی مجھے جدائی کی جلن ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

(۵)

میں خودی کی تنہائیوں میں گم رہا اور حالت یہ ہوئی کہ قیامت کے دن جب ساری دنیا بارگاہ باری تعالیٰ میں حاضر تھی۔ میرے متعلق کہا جا سکتا

ہے، گویا میں وہاں موجود نہ تھا اس لئے کہ اپنی خودی میں مگن تھا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر محبوب حقیقی کا جلوہ بھی نہ دیکھا۔ اس طرح اہل محشر کے لئے خود ایک تماشا بن گیا۔

(۶)

خود گزینی: اپنے آپ کو چننا، اختیار کرنا۔ اپنی ذات کی حقیقت سمجھ کر اس پر پختہ ہو جانا، خودی۔

یقین کیا ہے؟ حضرت ابراہیم کی طرح بے تکلف آگ میں بیٹھ جانا، اور انجام سے بالکل بے پرواہ رہنا۔ یقین کیا ہے؟ خدا کی محبت کے نشہ میں چور رہنا اور اپنی خودی کو پختہ کرنا۔ اے موجودہ زمانے کی تہذیب کے قیدی! اُسن، بے یقین ہونا غلامی سے بھی برا ہے۔

(۷)

عرب کے سوز عشق ہی میں دنیا بھر کی بہتری اور بہبود ہے۔ کعبے کا بھید یہی ہے کہ قوموں میں وحدت پیدا ہو جائے۔ اہل یورپ کے افکار وحدت سے بالکل خالی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپی تہذیب کا کعبہ کوئی نہیں۔

مطلب یہ کہ اسلام نے عالم انسانیت کو پہلی مرتبہ وحدت کا پیغام دیا اور حرم پاک کو اس وحدت کا مرکز بنایا۔ یورپ کی تہذیب کا دامن اس برکت سے خالی ہے۔

(۸)

شاید ہر ذرے کے پہلو میں دل موجود ہے۔ جلوت ہی میں وہ تنہائی کے مزے لے رہا ہے بے شک وہ گزری ہوئی اور آنے والی کل کی قید سے آزاد

نہیں، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دل زمانے کی گردش کا غلام بن گیا۔

(۹)

زرا میری نغمہ پیرائی کی کیفیت تو دیکھو۔ میرا سانس ہندی ہے اور نغمہ کا مقام عربی۔ میری نظر اہل فرنگ کے انداز سے آلودہ ہے۔ مجھے طبیعت سلطان محمود جیسے بادشاہ کی عطا ہوئی ہے اور قسمت یہ کہ ایاز بن کر دوسروں کی غلامی کروں۔

اس رباعی میں اقبال نے انتہائی اختصار سے اپنی پوری زندگی بیان کر دی۔ یعنی میں ہندوستان میں پیدا ہوا۔ جو پیغام دیتا رہا، وہ عربی تھا۔ یورپی علوم حاصل کرنے کے باعث میری نظر میں یورپ کا اثر کم و بیش باقی رہا۔ طبیعت تو اور بے اعتنائی کے اعتبار سے شاہانہ تھی، لیکن قسمت ایسی پائی کہ کسب معاش کے لئے جو کچھ کرتا رہا، وہ اگرچہ کتنا ہی خود دارانہ تھا تاہم اس میں دوسروں سے کامل بے نیازی میسر نہ آسکی۔ لہٰذا اسے ایازی ہی سمجھنا چاہیے۔

(۱۰)

افسوس کہ تیرے خیالات آسمانی نہیں۔ یعنی ان میں بلندی اور پاکیزگی نظر نہیں آتی۔ تیری اڑان کی وہ شان نہیں کہ سمجھا جائے، تو صاحب لولاک صلعم کا غلام ہے۔ میں نے مانا کہ اصل کے اعتبار سے تو شاہین ہے، لیکن تیری آنکھوں میں بے باکی اور بے خوفی نظر نہیں آتی۔

---

(۱۱)

نہ مومن نظر آتا ہے، نہ اس کی امیری کہیں دکھائی دیتی ہے۔ باقی رہا صوفی، تو اس کی روشن ضمیری رخصت ہو چکی۔ تو خدا سے پھر پہلا ساحل اور پہلی سی نظر مانگ، جو تجھ میں فقیری کی شان پیدا کر دے۔ یاد رکھ، فقیری کے بغیر امیری حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۱۲)

نظر رنگ و بو میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ عقل اس دنیا میں ہر طرف کھوئی گئی ہے۔ اے دل، صبح کے وقت کی آہ و فریاد نہ چھوڑ اور اللہ ھو اللہ ھو کرتا رہ۔ شاید اسی اللہ ھو میں تجھے امن و امان نصیب ہو۔

(۱۳)

خودی آشکارا ہو جائے تو اس میں حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اوصاف حسنہ نظر آتے ہیں۔ خودی پردے میں بیٹھ جائے تو اس میں کبریائی کے جلوے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ زمین، آسمان کرسی اور عرش سب خودی کی زد میں ہیں۔ خدائی کی کوئی بھی شے اس سے باہر نہیں۔

(۱۴)

بانسری بجانا، نغمے گانا اور اس ذریعہ سے پیغام پہنچانا عشق و مستی کی جمالی شان ہے۔ عشق و مستی کا جلال یہ ہے کہ انسان ساری دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔ عشق و مستی کا کمال حضرت علیؓ کی بلند حوصلگی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا زوال دیکھنا مطلوب ہو تو امام فخر الدین رازی کی فلسفیانہ

موشگافیوں میں دیکھ لو۔

(۱۵)

میرا وہ محبوب کہاں ہے جس کے دم سے محفل کی رونق وابستہ ہے؟ وہی میرے لئے تجلی ہے، اسی کو میں اپنا حاصل سمجھتا ہوں، لیکن وہ ہے کہاں؟ کہتے ہیں کہ وہ دل کی تنہائیوں میں رہتا ہے، مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دل کا مقام کونسا ہے؟

(۱۶)

تیرے سینہ میں سانس تو موجود ہے لیکن دل موجود نہیں اور سانس بھی ایسا نہیں کہ اس سے محفل میں گرمی اور ہنگامہ پیدا ہو جائے۔ اے عاقل! عقل کی حد سے آگے بڑھ جا عقل چراغِ راہ ہے منزلِ مقصود نہیں کہ تو سفر چھوڑ کر یہاں بیٹھ جائے۔

(۱۷)

نہ میں سانڈنی پر سوار ہوں، نہ کجاوہ میں بیٹھا ہوں۔ راستہ کا نشان ہوں، منزلِ مقصود نہیں۔ میرا وظیفہ یہ ہے کہ گھاس پھوس کو جلا دوں میں فقط تجلی ہوں۔ حاصل نہیں۔

(۱۸)

تیرا جوہر نوری ہے اور تو ہر لحاظ سے پاک ہے، تو آسمانوں کی آنکھ کا تارا ہے۔ فرشتے اور حوریں تیرے معمولی شکار ہیں اس لئے کہ تو شاہ لولاک صلعم کا پالا ہوا شاہین ہے۔

(۱۹)

افسوس کہ جنون باقی نہ رہا مسلمان کی رگوں میں دوڑنے والا خون نظر نہیں آتا۔ وہ نمازِ با جماعت کے لئے مسجدوں میں کھڑے ہوتے ہیں تو دیکھو، ان کی صفیں ٹیڑھی ہوں گی۔ دل پریشان اور سجدوں میں کوئی ذوق اور لذت نہ ہوگی۔ اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کہ ان کے دلوں میں عشق کا جذبہ باقی نہ رہا۔

(۲۰)

باغ میں پھول کا لباس شبنم سے بھیگا ہوا ہے، یعنی پھول بھی ہیں، شبنم بھی ہے، چنبیلی بھی ہے، سبزہ بھی ہے اور نسیم سحر بھی ہے، لیکن یہاں مجلس کا ہنگامہ گرم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ باغ کا لالا سوز جگر سے خالی ہے۔

مطلب یہ کہ دنیا میں ہر قسم کا سازوسامان موجود ہے۔ لیکن اس سے کام لینے کے لئے جس سوزِ جگر کی ضرورت ہے، وہ جب تک پیدا نہ ہو، کوئی ہنگامہ بپا نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان خصوصاً ہندوستان کا مسلمان اس سوز جگر سے محروم ہو گیا۔

(۲۱)

خودی کے زور سے ساری دنیا پر چھا جا۔ رنگ و بو کے مقام کا بھید پالے۔ سمندر کی طرح کنارے سے تعلق قائم رکھ، لیکن کنارے کے جھاگ سے دامن بچائے رکھ۔

مراد یہ ہے کہ دنیا سے تعلق توڑا نہیں جا سکتا، لیکن ان چیزوں سے بہرحال دور رہنا چاہیئے، جو آنی و فانی ہیں اور ان میں کسی کے لئے نفع و بہبود کا کوئی سامان نہیں۔

(۲۲)

عقل کی برکت سے راستہ چلنے والے کی آنکھ روشن ہو جاتی ہے عقل کیا ہے؟ راستہ پر چلنے والا چراغ ہے، لیکن راستہ کے چراغ کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ گھر کے اندر کیسے کیسے ہنگامے بپا ہیں یعنی عقل ایک حد تک

رہنمائی تو کرسکتی، لیکن حقیقت تک نہیں پہنچا سکتی۔

دعا

جیسا کہ اقبال نے خود بتایا ہے، یہ نظم مسجدِ قرطبہ میں لکھی گئی۔ قرطبہ جس کا یورپی نام کارڈووا (Cardova) ہے، وسطی ہسپانیہ کا ایک شہر ہے۔ ایک زمانے میں یہاں بہت بڑا قلعہ تھا اور مسلمانوں کے دور سے پیشتر ہسپانیہ کے بادشاہ کچھ وقت اس قلعہ میں بھی گزارتے تھے۔ گویا یہ ان کا دوسرا دارالحکومت تھا۔ مسلمانوں نے ہسپانیہ کو فتح کیا تو قرطبہ ہی کو دارالحکومت بنایا۔ جب ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن نے بادشاہی قائم کی تو اس وقت سے قرطبہ کی عظمت کا نیا دور شروع ہوا۔ یہ بہت تھوڑی مدت میں نہ صرف ہسپانیہ کے بلکہ یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے خوبصورت شہر بن گیا۔ دریا کے دونوں کناروں پر اس کی آبادی چوبیس میل کی لمبائی اور چھ میل کی چوڑائی میں پھیلی گئی تھی۔ شہر کے علاوہ اس کے حوالی میں باغوں، محلوں اور کوشکوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ خاص شہر کے مکانات ایک لاکھ تیرہ ہزار تھے۔ دکانیں اسی ہزار چار سو، مسجدیں سات سو، حمام نو سو، کارخانے پانچ ہزار، تاجروں کے گودام چار ہزار تین سو۔ دس میل تک ایک سیدھی سڑک جاتی تھی جس کے دونوں کناروں پر رات کے وقت اتنی روشنی ہوتی تھی کہ دن کا گمان گزرتا تھا۔ آبادی دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ شہر میں بے شمار درس گاہیں تھیں۔ پانی کے لیے نل

لگے ہوئے تھے۔ جا بجا خوبصورت فوارے بنے ہوئے تھے۔ گندے پانی کے نکاس کے لئے نالیاں تعمیر کردی گئی تھیں۔ اس شہر میں عبدالرحمٰن ثالث نے الزہرا نام کا ایک محل بنوایا تھا، جیسا اب تک کہیں نہیں بنا۔ اس کا اگر کوئی نمونہ تھا تو المنصور کا محل الزہرہ تھا، جو قرطبہ کے دوسرے حصّے میں تعمیر ہوا تھا۔

اسلامی حکومت پر زوال آیا تو دنیا کے یہ عجائبات بھی مٹ گئے۔ صرف ایک مسجد جامع باقی رہ گئی، جسے عیسائیوں نے گرجے کی شکل میں تبدیل کرلیا۔ اقبال ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس کے لئے ولایت گئے تو یہ فیصلہ کرکے گئے تھے کہ ہسپانیہ ضرور جائیں گے اور مسلمانوں کے بچے کھچے آثار دیکھیں گے۔ بالِ جبریل کی متعدد نظمیں اسی سفر کی یادگار ہیں۔ قرطبہ کے علاوہ غرناطہ بھی دیکھا تھا جو آخری دور میں ہسپانوی مسلمانوں کا مرکز رہا۔ مورخوں اور سیاحوں نے غرناطہ کے قصر الحمرا کی بڑی تعریفیں لکھی ہیں۔ لیکن اقبال کے تاثرات قرطبہ ہی تک محدود رہے۔ کم از کم ان کی نظموں میں الحمرا کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔

یہ نظم اسی مسجد جامع میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی، جو اب گرجے کی شکل میں موجود ہے۔ اس کی تفصیل اگلی نظم میں بیان کی جائے گی جو اس مسجد کے متعلق ہے۔

صبح نشور: قیامت کی صبح۔ کاخ و کو: محل اور کوچے۔ جلوتی اور خلوتی: جلوتی کے لفظی معنی ہیں وہ لوگ جو جلوت میں رہتے ہیں، اور

خلوتیوں سے مراد ہے گوشہ نشین لوگ۔ ان دونوں اصطلاحوں سے مختلف مفہوم لئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً امیر اور فقیر، اہل سیاست اور اہل تصوف، علماء اور اولیاء، دنیا دار اور دین دار۔ حال ہی کی مناسبت سے دونوں کے لئے الگ الگ لفظ استعمال کئے۔ جلوتیوں کے لئے سبو جس سے محفل آرائی کا سروسامان اور اہتمام ظاہر ہوتا ہے۔ خلوتیوں کے لئے کدو جو درویشی اور قلت سامان کی دلیل ہے۔ لامکاں: وہ مکان جس کی حدود نہایت کوئی نہ ہو۔ چارسو: وہ مقام جو چار طرفوں سے گھرا ہوا ہو۔

(۱) اے خدا! میرے وجود کے سانسے جو نغمے اٹھ رہے ہیں، میرے دل سے جو فریادیں بلند ہو رہی ہیں، ان میں میرے جگر کا لہو شامل ہے۔ یہی میرا وضو ہے، یہی میری نماز ہے۔

عشق کمال کو پہنچتا ہے تو انسان کا جگر لہو بن جاتا ہے۔ اقبال اسی خون جگر سے وضو کرتے ہیں اور اپنی فریادوں میں لگے رہتے ہیں۔ اسی کو وہ اپنی نماز قرار دیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے، وہ سوز قلب کا کرشمہ ہے، فلسفیانہ دقیقہ سنجی یا شاعرانہ خیال آرائی نہیں۔ اسی کو وہ بارگاہِ باری تعالیٰ میں سجدۂ نیاز سمجھتے ہیں اور حق عبادت ادا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کا وجود سرتاپا عشق بن جائے۔

(۲) صاف دلوں کی صحبت میں بیٹھنے سے دل روشن ہوتا ہے، اسے محبوب کی حضوری میسر آتی ہے۔ اس پر کیف و سرور کی وہ حالت وارد ہوتی ہے جس کے بغیر زندگی میں کوئی لذت نہیں۔ اس کی مثال اس لالے کی سی ہے جو ندی

کے کنارے ہو۔ پانی کی لہریں اسے ہر وقت تر و تازہ اور شاداب رکھیں اور اس کے اندر سرخی اس طرح جھلک رہی ہو جیسے چراغ جلتا ہے۔

(۳) محبت کی راہ بڑی ہی کٹھن ہوتی ہے۔ اس میں کون کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ میرے بھی تمام ساتھی بچھڑ گئے۔ صرف میری ایک آرزو ہم سفری کے لئے باقی رہ گئی۔ اس نے رفاقت کا رشتہ نہ توڑا۔

اقبالؔ کی مراد یہ ہے کہ محبّت کی منزل میں سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، صرف انسان کا عشق ہی چراغ راہ بن کر اسے مقصود پر پہنچاتا ہے۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے آرزو کو اپنا مستقل ساتھی قرار دیا۔ یعنی محبّت میں جو خوفناک سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں، ان میں بھی جذبۂ عشق بدستور قائم و استوار رہا۔ یہ کمال محبّت کی دلیل ہے۔

(۴) اے خدا! میں امیروں اور وزیروں کی بارگاہ میں نہیں جاتا، دنیا پرستوں کی طرح ان کے دروازوں کو اپنا بسیرا نہیں بناتا۔ میرا بسیرا بھی تو ہے اور بسیرے کا ذریعہ بھی تو ہے، یعنی تو ہی میرے لئے آرام گاہ بنا اور تو نے ہی مجھے یہ توفیق عطا کی کہ میں تجھے آرام گاہ بناؤں۔

(۵) تو نے ہی وہ جنون عشق عطا کیا جس کی بدولت میرے گریبان نے صبح قیامت کے طلوع کا نقشہ پیدا کر لیا، یعنی اس سے ویسے ہی ہنگامے اٹھ رہے ہیں، جیسے قیامت کی صبح کو اٹھیں گے اور تیری ہی برکت سے میرے سینے میں اللہ ہو کی آگ بھڑک رہی ہے۔

مراد یہ ہے کہ مجھے جو کچھ عطا ہوا، وہ سب تیری محبّت اور تیرے عشق کا

کرشمہ ہے۔ قیامت کے دن مردے جی اٹھیں گے۔ میرے گریبان سے وہی ہنگامے پیدا ہو رہے ہیں جو مردہ دلوں میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں گے۔ وہ ہنگامے کس امر کا نتیجہ ہیں؟ اس امر کا کہ میرے سینے میں اللہ ہو کی حرارت بھری ہوئی ہے۔

(۶) تیرے عشق کی بدولت میری زندگی سراپا سوز و تپش، درد اور داغ بنی ہوئی ہے۔ تو ہی میری آرزو ہے اور تجھی کو میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔

زندگی سوز و تپش، درد اور داغ اس لئے بنی ہوئی ہے کہ ابھی مقصد حاصل نہیں ہوا۔ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ تلاش جاری ہے۔

(۷) اگر تو پاس نہ ہو تو آبادیاں مجھے سراسر ویرانے نظر آئیں۔ تو پاس ہو تو اجڑے ہوئے محل اور کوچے بھی آبادی سے بھرپور دکھا دیں۔

(۸) مجھے پھر وہ پرانی شراب عطا کر جسے جام و سبو توڑنے کے بعد ڈھونڈ رہا ہوں۔

یہ دراصل ملت کی طرف سے دعا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تو نے اپنی رحمت سے مسلمانوں کو سچا عشق عطا کیا۔ اس کی برکت سے وہ ساری دنیا پر چھا گئے۔ ان کے جاہ و جلال کے سامنے تمام قومیں بے حقیقت رہ گئیں۔ وہ عشق ان سے چھن گیا تو جاہ و جلال بھی باقی نہ رہا۔ سلطنتیں ہاتھوں سے نکل گئیں۔ گویا جام و سبو ٹوٹ گئے۔ اب پھر مسلمان اسی پرانے عشق کے آرزو مند ہیں جس کے پر پرواز سے وہ اوج ثریا پر پہنچے تھے۔

(۹) اے رحمت کے ساقی! ہم پر پھر لطف و کرم کی نظر فرما۔ ہمارے امیر اور

غریب، شاہ وگدا، دنیادار اور دین دار، علماء اور صوفی سب اپنے اپنے ظرف لیئے انتظار کر رہے ہیں۔ تیری عنایت سے انہیں وہی پرانی شراب مل جائے۔

(۱۰) اے خدا! تو قادر مطلق ہے۔ جسے جو چاہے عطا کرسکتا ہے۔ گستاخی معاف ہو، میرے جوش جنوں اور جذبۂ محبت کو تجھ سے ایک شکایت ہے۔ تو نے اپنے لیئے تو لامکاں رہنا پسند کر لیا ہے اور میرے لیئے چار طرفوں والی دنیا تجویز کی جس کی حدیں مقرر ہیں اور میں ان سے باہر نہیں جاسکتا۔

محلِّ شکایت یہ ہے کہ میں مکانی ہوں تو لامکاں ہے۔ میں محدود ہوں، تو لامحدود ہے۔ میرے جوش جنوں اور میرے جذبۂ عشق کا تقاضا یہی ہے کہ مجھے بھی مکانی حدود سے آزاد کر کے اپنی طرح لامکاں بنا دے۔ اس کے سوا مقصد و مطلوب تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔

(۱۱) فلسفے اور شعر کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ اس آرزو کو بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہیں جسے محبوب کے روبرو صاف صاف ظاہر نہ کیا جاسکے۔

مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اور شعر میں دل کی باتیں رمز و کنایہ ہی کی شکل میں کہی جاسکتی ہیں اور طریقۂ بیان فلسفہ اور شعر میں حسن اور کشش پیدا کرتا ہے۔

رباعی

شعیب: شعیب سے یہاں مراد مرشد، ہادی، مربی اور رہنما ہے۔

حضرت شعیبؑ خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ وہ قبیلۂ مدین کی ہدایت کے لئے

آئے تھے، جو حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی قطورا کی اولاد تھے۔ بحیرہ قلزم کی جو شاخ عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے درمیان واقع ہے، اسی کے کنارے یہ قبیلہ آباد تھا۔ چونکہ عرب اور افریقہ کے درمیان مال لانے لے جانے والے قافلے اسی قبیلے میں سے گزرتے تھے، اس لئے قبیلہ مدین میں وہ تجارتی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جو دولت کے لالچ میں عموماً پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ لوگ ناپ تول میں بد دیانتی کرتے تھے۔ حضرت شعیبؑ کی دعوت کا ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ان میں کاروباری دیانت پیدا ہو جائے۔

حضرت موسیٰؑ ایک مصری کے مر جانے کے باعث وہاں سے نکلے تو حضرت شعیبؑ ہی کے پاس پہنچے تھے کئی سال بکریاں چراتے رہے، پھر حضرت شعیبؑ کی صاحب زادی سے شادی ہو گئی۔ یہ دور حضرت موسیٰؑ کے لئے نبوت کی تربیت کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شعیب زیر غور شعر میں مربی کے لئے استعمال ہوا۔ شبانی سے مراد گلہ بانی ہے اور کلیمی سے حضرت موسیٰؑ کی شان نبوت۔

صاحب عرفاں کا سانس صبح کے وقت کی نسیم ہے۔ اسی سے حقیقت کے پیشے میں نمی پیدا ہوتی ہے۔ اگر حضرت شعیبؑ جیسا مربی، مرشد اور رہنما مل جائے تو گلہ بانی کرتے ہوئے حضرت کلیم اللہؑ کی طرح نبوت کے درجے پر پہنچ جانا صرف دو قدم کا معاملہ ہے۔ یعنی انسان معمولی محنت مزدوری کرتا ہوا بہت جلد قوموں کا رہنما اور نجات دہندہ بن سکتا ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی صحبت میں تربیت پا کر اس درجے پر پہنچ گئے کہ خدا نے انہیں پیغمبری عطا کی اور انہوں نے بنی اسرائیل کو فرعون جیسے جابر بادشاہ

کی غلامی سے نجات دلائی۔

مسجد قرطبہ

یہ نظم بھی ہسپانیہ کی سرزمین، بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ جامع قرطبہ کے متعلق ہے، جس کا پرانا جاہ و جلال گو باقی نہیں رہا لیکن وہ اب تک صفحۂ ہستی پر موجود ہے۔ اس کی بنیاد عبدالرحمن اوّل نے رکھی تھی، جو ہسپانیہ میں اموی سلطنت کا بانی تھا۔ پھر اس میں مختلف بادشاہ اضافے کرتے رہے۔ آخری اضافہ ابی عامر المنصور نے کیا تھا، جو اگرچہ وزیر اعظم تھا، لیکن اس نے مختار کل کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

مسجد کا طول چھ سو بیس فٹ اور عرض چار سو چالیس فٹ تھا۔ دنیا کی کسی مسجد کا مسقّف حصہ اتنا بڑا نہیں، جتنا کہ اس کا تھا۔ اس میں ایک ہزار چار سو سترہ ستون تھے، جن کی جلا کا یہ عالم تھا کہ انسان ان میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ مسجد کی مختلف دیواروں میں اکیس دروازے تھے، جن پہ پیتل کا بے حد خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ اس کا مادنہ ایک سو آٹھ فٹ بلند تھا۔ چوٹی پر چاندی اور سونے کے سیب نما گولے نصب کر دیئے گئے تھے۔ سورج کی شعاعیں ان پہ پڑتی تو میلوں سے چمکتے ہوئے نظر آتے۔ روشنی کے لئے مسجد میں دو سو اسّی بلوری جھاڑ آویزاں تھے۔ سب سے بڑے جھاڑ میں موم کی چودہ سو بتیاں جلتی تھیں۔ ان کے علاوہ پیتل کے سات ہزار چار سو چھبیس

پیالے دیواروں میں لگے ہوئے تھے، جن میں تیل بتی سے روشنی ہوتی تھی۔
شاہی مقصورہ کے تمام ستون لاجورد کے، دروازے چاندی اور سونے کے تھے۔ مسجد کا منبر آبنوس، صندل اور ہاتھی دانت کے چھتیس ہزار ٹکڑوں کو سنہری کیلوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا اور اس کی تیاری میں سات سال لگے تھے۔ غرض یہ مسجد اعجوبۂ روزگار تھی۔ اندلس کے بڑے بڑے علماء نے اسی میں تعلیم پائی تھی اور اسی میں وہ درس دیتے رہے تھے۔ اقبال نے اس کی عظمت زائل ہو جانے سے کم و بیش پانچ سو سال بعد اسے دیکھا اور جو اثرات قبول کیے، ان کا نقشہ نظم میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حادثات: حادثہ کی جمع یعنی پیدا ہونے اور مرنے والی چیزیں۔

صیرفی: صرّافہ پرکھنے والا۔

پہلا بند (۱) رات اور دن کا سلسلہ یعنی زمانہ پیدا ہونے اور مرنے والی چیزوں کے نقش تیار کرتا ہے۔ رات اور دن کا سلسلہ ہی زندگی اور موت کی اصل ہے۔

مراد یہ ہے کہ زمان و مکان کے بغیر تغیرات کا تصور نہیں ہو سکتا اور تغیر کا مطلب ہے چیزوں کا پیدا ہونا اور ختم ہونا۔ بلکہ فلسفیوں کے نزدیک اس دنیا کے خاتمے کی دلیل ہے کہ اس میں ہر چیز بدلتی رہتی ہے کوئی پیدا ہوتی ہے اور کوئی مرتی ہے۔ جو آج پیدا ہوتی ہے اور کل مرتی ہے بہرحال حادث ہے۔ اس کا تصور نہیں . . . زمانے ہی میں ملتا ہے۔ لہٰذا زمانہ چیزوں کا پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے اور ہمارے تصورات کے مطابق یہی زندگی اور موت

کا سرچشمہ ہے۔ اگر ہم زمانہ کی حد سے باہر نکل جائیں تو موت وحیات کا یہ تصوّر بھی ختم ہو جائے۔

(۲) رات اور دن کا سلسلہ دو رنگے ریشم کا تار ہے، جس سے ذات باری تعالیٰ اپنے لئے صفات کا لباس تیار کرتی ہے۔

اس شعر میں شاعر نے رات اور دن کو ریشم کے دو تار قرار دیا۔ ایک سیاہ، دوسرا سفید یعنی رات اور دن۔ وہ کہتا ہے کہ ذات کو اس کی اصل صورت میں تو دیکھا نہیں جا سکتا جب وہ صفات کا لباس پہن لیتی ہے تو اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ خالق ہے، قادر ہے، پروردگار ہے، مالک ہے، حافظ ہے، ہادی ہے وغیرہ۔ یہ تصوّرات زمانے ہی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) رات اور دن کا سلسلہ وہ فریاد ہے جو ازل کے ساز سے پیدا ہوئی۔ اس سے ذات باری تعالیٰ کا مدعا یہ تھا کہ کائنات میں جو صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، وہ زیر و بم کی شکل میں ظاہر ہو جائیں، یعنی روز و شب کا سلسلہ تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گیا اور اسی میں انسان نے ممکنات کائنات کو روشنی میں لانا شروع کیا۔

مراد یہ ہے کہ کائنات کی صلاحیتیں زمانے ہی کے سلسلے میں ظاہر ہو سکتی تھیں۔ چونکہ اس شعر کے پہلے مصرع میں زمانے کو ساز ازل کی فغاں کہا گیا تھا اور ساز میں زیر و بم یعنی اونچے نیچے مدھم، پنچم دونوں قسم کے سُر ہوتے ہیں۔ اس لئے ممکنات کے ساتھ زیر و بم استعمال کیا اور کائنات کی صلاحیتوں

ہیں بعض چیزیں بہت نمایاں ہوتی ہیں، بعض غیر نمایاں، لہٰذا زیر و بم کا استعمال بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ سازِ ازل کی نوا کے بجائے فغاں کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک سازِ ازل کی جو آواز تخلیق کا باعث ہوئی، وہ روحوں کے لئے اصل سے مفارقت کا پیغام تھی۔

(۴) رات اور دن کا سلسلہ کائنات کا صرّاف ہے یعنی یہ ہر چیز کو پرکھتا ہے کھوٹا کھرا الگ کر دیتا ہے، نہ میں اس امتحان سے آزاد ہوں، نہ تو اس امتحان سے آزاد ہے۔ زمانے کی کسوٹی سب کے لئے یکساں ہے۔

(۵) تو ہو یا میں جو وجود بھی وزن اور خاصیت میں کم حیثیت ثابت ہو زمانہ اسے مٹا دیتا ہے اور اس کی قسمت میں موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(۶) تیرے رات اور دن کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ یہ زمانے کی ایک رو ہے اور زمانہ دن اور رات کی تمیز سے بے نیاز ہے۔ شاعر یہاں یہ حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ زمانہ یا بہ الفاظ دیگر زندگی ایک مسلسل رو کا نام ہے جو کبھی بدلتی نہیں اور جس کا تسلسل کہیں ٹوٹتا نہیں۔ لہٰذا اس کے باب میں دن اور رات کی تمیز دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتی، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:-

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہے جواں، ہردم رواں پیہم دواں ہے زندگی

(۷) انسانی ہنرمندی نے جتنی حیرت انگیز چیزیں اب تک بنائی ہیں، وہ سب تھوڑی دیر کے لئے ہیں اور جلد فنا ہو جانے والی ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس دنیا کا

سارا سلسلہ ناپائدار ہے اور اس کی کسی شے کے لئے قیام اور قرار نہیں۔

(۸) اول و آخر بھی فنا ہے۔ ظاہر و باطن بھی فنا ہے۔ کوئی نقش نیا ہو یا پرانا، اس کی منزل فنا کے سوا کوئی نہیں۔

دوسرا بند | تقویم: جنتری، کلنڈر، وہ کتاب جس میں سال بھر کی تاریخوں وغیرہ کا نقشہ درج ہو۔ عصرِ رواں: وہ زمانہ جو جاری ہے۔ پیکرِ گل: مٹی کا جسم یعنی انسان۔ صہبائے خام: وہ شراب جس میں کوئی چیز نہ ملائی گئی ہو اور بالکل خالص ہو۔ بادہ نوشوں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ شراب پیتے ہیں تو اس میں کوئی نہ کوئی چیز ملا لیتے ہیں، مثلاً گلاب کا عرق، سوڈا وغیرہ جس سے شراب کی تلخی اور تیزی کم ہو جاتی ہے، اگر اس میں کوئی چیز ملائی نہ جائے تو تلخی بھی زیادہ ہوتی ہے اور نشہ بھی زیادہ لاتی ہے۔ اسی کو صہبائے خام کہتے ہیں۔ کاس الکرام: کاس بمعنی پیالہ، کرام بمعنی سخی۔ کاس الکرام سے وہ پیالہ مراد ہے جس سے دوسروں کو بھی حصہ ملے ممکن ہے کاس الکرام کی ترکیب استعمال کرتے وقت شاعر کے ذہن میں یہ شعر ہو:

(ہم شراب پی اور ایک جرعہ زمین پر بہا دیا۔ یقیناً سخی کے پیالے میں سے زمین کا حصہ ہے)

شراب نوشوں کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ پیتے ہیں تو تھوڑی سی بچی ہوئی شراب زمین پر گرا دیتے ہیں۔ جنود: جند کی جمع لشکر۔ ابن السبیل: مسافر۔

(۱) بے شک دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ مگر اس نقش میں ہمیشہ کی پائداری کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی مردِ حق کے ہاتھ سے مکمل ہو۔

مردِ حق یا مردِ خدا سے وہ انسان مراد ہے، جس کے تمام کام خدا کی رضا کے تابع ہوں۔

(۲) سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسے نقش کو کیوں دائمی پائداری حاصل ہوتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ مردِ حق کا ہر کام عشقِ حق کی بدولت فروغ پاتا ہے۔ عشقِ حق زندگی کا جوہر اور روح ہے۔ اس پر موت وارد نہیں ہو سکتی اسے مٹا دینا موت کی دسترس سے باہر ہے۔

(۳) بلاشبہ زمانے کی رو بڑی ہی تیز و تند ہے اور اس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی۔ وہ نئی نئی صورتیں پیدا کرتی اور مٹاتی رہتی ہے۔ اسے روکنا ممکن نہیں، لیکن عشقِ حق خود ایک تند سیل ہے۔ وہ زمانے کے سیل کو روک لیتا ہے یعنی عشق پر زمانے کا عمل جاری نہیں ہو سکتا۔

(۴) جس طرح ہمارے ہاں جنتریاں اور کلنڈر ہوتے ہیں اور ان میں دنوں اور مہینوں کے حساب درج کئے جاتے ہیں، اسی طرح عشقِ حق کی بھی ایک جنتری ہے، جس میں زمانوں کے حساب لکھے جاتے ہیں۔ اس جنتری پر نظر رکھیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس میں اسی زمانے کا حساب درج نہیں جو جاری ہے اور جسے دنیا زمانہ کہتی ہے بلکہ اس میں اور زمانے بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں بتایا جا سکتا۔

مراد یہ ہے کہ جو زمانہ رات اور دن کے سلسلے سے بنتا ہے، اس کی خاصیت تو بے شک یہی ہے کہ وہ چیزوں کو بناتا اور مٹاتا رہتا ہے۔ اگر عشقِ حق کا معاملہ اسی زمانے تک محدود ہوتا تو وہ فنا کی دسترس سے باہر

نہ رہ سکتا۔ چونکہ اس کے ہاں اور زمانے بھی ہیں، لہٰذا وہ رات اور دن والے زمانے کے اثرات سے بالکل محفوظ ہے۔

(۵) دنیا میں پاکیزگی، طہارت، روحانیت اور برتری کے جتنے پاکیزہ اور نورانی نمونے نظر آتے ہیں، وہ سب عشق حق ہی کے مختلف جلوے ہیں۔ گویا عشق حق مختلف لباسوں، مختلف شکلوں اور مختلف پیکروں میں تجلّی ریز ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت جبریل امینؑ کا سانس اور ان کی آواز بھی عشق ہی کا ایک جلوہ تھا۔ حضرت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قلبِ طاہر واطہر کا نور بھی عشق حق کا ایک کرشمہ تھا۔ عشق ہی خدائے پاک کا ایلچی بن کر اس دنیا میں آیا اور انسانوں کو راہِ حق پر لگایا۔ عشق ہی خدا کا کلام ہے، جس کی بدولت دلوں اور روحوں کے اندھیرے میں اجالا ہوتا ہے اور اخلاق کا بگڑا ہوا نقشہ اصلاح پاتا ہے۔

(۶) عشق حق ہی کی بدولت مٹی کے اس پتلے میں، جسے انسان کہتے ہیں، آب وتاب پیدا ہوئی اور اس نے علم وعرفان اور ہدایت وسعادت کے وہ نمونے پیش کئے، جن کی روشنی کبھی ماند نہ پڑے گی۔ عشق خالص شراب ہے، جس کی تیزی اور تندی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ عشق ان کریموں کا پیالہ ہے، جن کے فیض سے ہر شخص بہرہ یاب ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ ان کے فیض کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے۔ وہ ہر ایک کو صحیح راستہ بتاتے ہیں، ہر ایک کی دستگیری کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اگر کوئی محروم رہ جائے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے۔

(۷) عشقِ حق کبھی کبھی کے اس پاک باطن عالم کی شکل اختیار کرتا ہے، جو شریعت کے نکتے سب کو سکھاتا ہے کبھی ان لشکروں کی سالاری کا فرض انجام دیتا ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کے لئے تیار ہوئے ہوں۔ غرض عشقِ حق کے ظہور کی بے شمار شکلیں ہیں یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک مسافر ہے جس کے ہزاروں مقام ہیں اور ان کا حساب مشکل ہے۔

(۸) محض عشقِ حق ہی کی مضراب ہے جو سازِ زندگی کے تاروں سے نغمے پیدا کرتی ہے اسی کی بدولت زندگی نورانی بنتی ہے اور اسی کی بدولت زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے مراد یہ ہے کہ عشق حق نہ ہوتا تو زندگی کے ساز سے کوئی نغمہ نہ نکل سکتا یہ ساز بالکل بے نوا رہتا اور عشق ہی کے باعث زندگی میں جمالی اور جلالی شان پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا بند | رفت و بود: لفظی معنی گیا اور تھا، یعنی فنا۔ چنگ: ایک قسم کا باجا جو منہ سے بجایا جاتا ہے۔ کشود: کھلنا۔ کفِ خاک: خاک کی مٹھی، یعنی انسان۔ سپہر کبود: نیلا آسمان۔ پیکرِ نوری: نورانی وجود، یعنی فرشتے اور قدوسی۔

(۱) اے قرطبہ کی مسجد! تو بھی عشقِ حق کی بدولت وجود میں آئی عشق سر سے پاؤں تک ہمیشگی ہے۔ اس کے لئے فنا نہیں۔

(۲) رنگ ہو یا اینٹ پتھر۔ ساز ہو یا لفظ و آواز، غرض کوئی فن ہو، اس کا کمال جگر کے خوں سے نمایاں ہوتا ہے۔

پہلے مصرع میں رنگ سے بظاہر مراد مصوری ہے، خشت و سنگ سے فنِ تعمیر، چنگ سے موسیقی، حرف و صوت سے شاعری، انشا اور خطابت۔ فرماتے ہیں کہ ان فنون میں اگر اخلاص و عشقِ حق کی نمائش ہو تو یقیناً یہ بڑے بلند پایہ فنون

بن جاتے ہیں اور قوموں کی تربیت میں بہت مؤثّر ثابت ہوتے ہیں، لیکن اگر اخلاص و عشق حق موجود نہ ہوں تو یہ بے روح جسم ہوں گے اور چشم و گوش کی عارضی تواضع کے سوا کوئی وظیفہ انجام نہ دے سکیں گے مسجد قرطبہ کو وہ خون جگر ہی کی بدولت معجزۂ فن قرار دیتے ہیں۔

(۳) خون جگر کا قطرہ پتھّر کی سِل کو دل کی طرح احساس اور تڑپ کا پیکر بنا دیتا ہے۔ جگر کے خون ہی سے آواز میں سوز، کیف اور نغمہ پیدا ہوتا ہے یعنی آواز خواہ شاعر کی ہو، خواہ داعی کی، خواہ کسی اور کی، وہ اسی وقت دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہے اور روحوں کو عمل کے لئے بے خود بنا دیتی ہے، جب اس میں عشق کا جذبہ موجود ہو۔

(۴) مسجد سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیری فضا دلوں کے لئے روشنی کا سامان ہے، میری نوا سے سینوں میں حرارت اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ تو دلوں کو حضورِ حق میں پہنچاتی ہے۔ میں دلوں کی پیچیدہ گتھیاں سلجھاتا ہوں اور ان میں انشراح پیدا کرتا ہوں۔

مراد یہ ہے کہ تیری فضا دلوں کو ہستی باری تعالیٰ کا یقین دلاتی ہے اور ان میں عبادت کا صحیح ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے، میرے نغموں سے دلوں میں عشق باری تعالیٰ کی آگ بھڑکتی ہے۔

(۵) انسان اگرچہ بظاہر بہت بے حقیقت معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا سینہ ایمان کے نور سے منوّر ہو جائے تو وہ عرش معلّی سے کم نہیں رہتا۔ عرشِ معلّی کی خصوصیت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ذات حق کی تجلّیات کا خاص مرکز ہے

اگر انہیں تجلیات کا نزول نورِ ایمان کی وجہ سے انسان کے سینہ پہ ہو تو اسے کیوں عرشِ معلّیٰ سے کم سمجھا جائے! مانا کہ انسان اپنے جسمِ خاکی کے باعث نیلے آسمان سے آگے نہیں جا سکتا، لیکن اس سے اس کی معنوی برتری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

(۶) عشقِ حق اور نورِ ایمان ہی کی بدولت انسان کا درجہ فرشتوں اور قدوسیوں سے بھی بلند ہو گیا۔ وہ اگرچہ ذاتِ حق کو سجدے کرتے ہیں۔ اس کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں جیسا کہ خود قرآن مجید سے ظاہر ہے: نحن نسبح بحمدک ونقدس لک۔ لیکن انہیں سوز و گداز کا وہ مقام کہاں حاصل ہے؟ عشقِ حق میں تکلیفیں اٹھانے، مصیبتیں برداشت کرنے اور جلتے رہنے کی وہ سعادت کب نصیب ہوئی جو انسان کو حاصل ہے۔

(۷) میں ہندی کافر ہوں، یعنی مجھے ایمان کا وہ مقام حاصل نہیں جو اہلِ حق کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اے مسجد! میرے ذوق و شوق کی کیفیت دیکھ کہ یہاں پہنچتے ہی میرا دل بھی صلوٰۃ و درود میں مگن ہے اور میرے لب پر بھی صلوٰۃ و درود ہی کے ترانے جاری ہیں۔

(۸) میرا لب و لہجہ بھی شوق سے لبریز ہے۔ میری بانسری میں بھی شوق کے سوا کچھ نہیں اور میرے جسم کا ریشہ ریشہ اللہ ہو کا نغمہ گا رہا ہے۔

چوتھا بند | نخیل: کھجور کا درخت۔ ثغور: ثغر کی جمع، سرحدیں۔ دجلہ: عراق کا مشہور دریا جس کے کنارے بغداد واقع ہے۔ ڈینوب: وسطی یورپ کا مشہور دریا ڈینوب جو جرمنی سے نکلتا ہے آسٹریا، ہنگری اور رومانیہ میں سے

گزرتا ہوا بحیرۂ اسود میں گرتا ہے۔ یورپ کے بعض مشہور شہر مثلاً ویانا، بوڈا پسٹ اسی کے کنارے واقع ہیں۔ رحیل: کوچ۔ فارس: شہسوار۔ رحیق: خالص اور صاف شراب۔

(۱) اے مسجد قرطبہ! تیری شان وشوکت اور حسن وجمال کو دیکھ کر مرد خدا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے اوصاف میں صاحب شان وشوکت اور صاحب حسن وجمال ہوتا ہے، جس طرح تو ہے۔

(۲) تیری عمارت نہایت پختہ اور مضبوط ہے، جس پر کم وبیش بارہ سو سال گزر چکے ہیں اور ابھی تک اپنی اصلی حالت پر قائم ہے۔ تیرے ستون گنے نہیں جا سکتے، انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ملک شام کے جنگل میں کھجوروں کے درختوں کا جھنڈ ہو۔

1417

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مسجد کے تمام ستون ایک ہزار چار سو سترہ تھے انسان اتنے ستونوں کے درمیان کھڑا ہو جائے تو حیران رہ جاتا ہے اور ان کی گنتی نہیں کر سکتا۔ پھر ان ستونوں کے لئے تشبیہ نہایت پاکیزہ پیدا کی۔ شام کا ذکر اس لئے بھی کیا کہ وہاں کھجوروں کے درخت بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی وضع اور ہیئت راستی میں ستونوں سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے بھی کہا کہ مسجد کا بانی اور اس کے اخلاف شام سے نکل کر اندلس پہنچے تھے اور وہاں انہوں نے عالی شان سلطنت قائم کی تھی۔ گویا اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر کے دوران میں اپنے اصلی وطن کا سب سے دل کش نظارہ ان کے سامنے رہا اور وہی نظارہ انہوں نے مسجد کی تعمیر میں پیدا کر دیا۔

(۳) تیرے دروازوں اور چھت پر وادیٔ سینا کا نور جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ تیرا وہ مینار جس پر اذان کہی جاتی تھی ایک سو اکھّتر (۱۷۱) فٹ بلند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر حضرت جبریل امینؑ اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔

(۴) مسجد کی پائداری کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؔ کے دل میں ملّت اسلامیہ کی پائداری تازہ ہوگئی۔ فرماتے ہیں کہ مسلمان کبھی نہیں مٹ سکتے اور کیوں مٹیں؟ ان کی اذانیں تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبروں کے راز بے نقاب کر رہی ہیں۔ یعنی اسی دین حق کو دنیا میں پھیلانا مسلمان کا وظیفہ ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیم یا دوسرے پیغمبر اس دنیا میں لائے اور حضرت ابراہیم سے دین اسلام کو جو خاص نسبت ہے وہ کسی شرح کی محتاج نہیں۔

(۵) اسلامی وطن کی کوئی حد نہیں۔ روئے زمین کا ہر ٹکڑا اور ہر گوشہ مسلمان کا وطن ہے۔ اس کا افق حد بندی سے بے نیاز ہے۔ دریائے دجلہ، دریائے ڈینیوب اور دریائے نیل اس کے سمندر کی لہریں ہیں۔

مراد یہ ہے کہ مسلمان عرب سے نکلے تو ساری دنیا پر چھا گئے۔ کوئی گوشہ ایسا نہ رہا، جہاں ان کی تعلیمات حقّہ کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں نہ پہنچے ہوں۔ دجلہ، ڈینیوب اور نیل کا ذکر تو سرسری طور پر کر دیا۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ کا کون سا قابل ذکر دریا ہے جس نے اسلامی سمندر میں لہر کی حیثیت اختیار نہ کی ہو۔ بے شک آج ان کی وہ شان جلال باقی نہیں، لیکن کیوں سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے دین حقّہ کی تعلیم کا سہارا لے کر پھر اپنے پہلے درجے پر نہیں پہنچ سکتے؟

(۶) مسلمان قوم اس دنیا میں نہایت حیرت انگیز کارنامے انجام دے چکی ہے اور اس کی سرگزشت کے دور سب کے لئے تعجب خیز ہیں۔ اس کے جوش ہمت اور عزم و جواں مردی کی داستانیں اپنی مثال آپ ہیں۔ کوئی دوسری قوم ان داستانوں کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے پرانے زمانے کو کوچ کا پیغام دیا اور اس عہد کی بنیاد رکھی، جسے تہذیب، شائستگی علم تحقیق اور کمال فنون کا خاص عہد کہا جاتا ہے۔

(۷) جن اصحاب میں روحانی ذوق تھا، ان کے لئے دل پسند شراب مسلمان ہی نے مہیا کی۔ وہی تھا جس نے عشق حق کے میدان میں شہسواری کے جوہر دکھائے۔ اس کی شراب خالص اور مصفا ہے۔ اس کی تیغ اصیل ہے جس کی کاٹ کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

انسان فطرت و طبیعت کے اعتبار سے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض میں روحانی ذوق بڑھا ہوا ہوتا ہے، بعض جہاد بالسیف کے شیدا ہوتے ہیں، بعض اپنی زندگیاں علم و فن کی خدمت میں گزار دیتے ہیں۔ ان سب کے لئے بہترین سامان اسلامی تعلیمات نے مہیا کئے۔

(۸) مسلم قوم سپاہی ہے۔ اس کی زرہ کلمۂ توحید کے سوا کچھ نہیں، یعنی وہ اس کلمہ کو لے کر اٹھتا ہے اور یہی اس کے جہاد کا پورا سر و سامان ہے۔ تلوار کے سایہ میں بھی اس کی پناہ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کوئی نہیں، یعنی وہ توحید ہی کی دعوت دیتا ہے اور توحید ہی کو اپنی زندگی کا مقصد و نصب العین سمجھتا ہے۔ اسی کے لئے جیتا ہے اور اسی کی خاطر جان دیتا ہے۔ ایسی قوم کیوں کر

Shiabooks Memorial Library Librarian

مٹ سکتی ہے۔

اقبال نے جو کچھ کہا ہے اسے شاعرانہ خیال نہ سمجھنا چاہیئے۔ ایک حدیث قدسی میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ مسلمانوں پر ایسا دور بھی آسکتا ہے، جب دشمنوں کا غلبہ بہت بڑھ جائے، لیکن یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوگی کہ ان کی ہستی ہی باقی نہ رہے یا نشوونما کا وہ جوہر ختم ہو جائے جو قوموں کی زندگی کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ مسلمانوں پر مصیبتیں اس وقت آتی ہیں، جب وہ خدا کے احکام کی پیروی چھوڑ دیتے ہیں۔ پیروی کے ساتھ ہی ان میں عزت و سربلندی کی نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے مغلوب ہوئے، پھر جوش عمل اور ہمت و عزیمت کی بدولت زندگی کے نئے سروسامان سے آراستہ ہو گئے۔

پانچواں بند | نوری نہاد جس کی فطرت نوری ہو۔

(۱-۲)، اے مسجد قرطبہ! تجھے دیکھ کر بندۂ مومن کی حقیقی شان آشکارا ہوتی ہے۔ اس شان کی خصوصیتیں کیا ہیں؟ یہ کہ مومن دن کے اوقات میں عشقِ حق کے جذبے سے سرشار ہو کر انتہائی سرگرمی اور جاں فشانی سے مصروفِ کار رہتا ہے۔ خدا کے حکموں کی تعمیل کرتا اور کراتا ہے۔ اس کے بندوں کے لئے راحت و آسائش کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ انہیں باطل قوتوں کی ضرر رسانی سے محفوظ رکھتا ہے۔ غرض اس کا سارا وقت ایسے ہی کاموں میں گزر جاتا ہے۔ رات آتی ہے تو وہ خدا سے لو لگاتا ہے۔ اس کے سامنے روتا ہے۔ دعائیں کرتا ہے۔ ہر کام میں اسی سے مدد اور نصرت کے لئے التجا کرتا ہے۔

یوں اس کے دن اور رات گزرتے ہیں۔ تو اس کی محنت، مشقت، سرگرمی اور جاں فشانی کا ایک زندہ کارنامہ ہے۔ تو اس لیے تعمیر ہوئی کہ مومن رات کے اوقات میں تیرے اندر بیٹھ کر خدا کی بارگاہ میں دعائیں کرے۔ تیری عمارت کی رفعت اس کے مقام بلند کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ تیری وسعت سے اس کے بڑے بڑے ارادوں کا پتا چلتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیالات کتنے وسیع ہیں۔ پھر اس نے تجھے انتہائی ذوق شوق سے بنایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذوق و شوق کتنا پاکیزہ تھا۔ تو اس غرض سے بنی کہ مومن تجھ میں خدا کے سامنے سجدۂ نیاز کرتا رہے۔ اس نیاز مندی میں بھی ناز کی ایک عجیب شان آشکارا ہے۔ یہ تیرے چپّے چپّے کے حسن تعمیر سے ٹپک رہی ہے۔

(۳) بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، خدا کے لئے کرتا ہے۔ اس کا کوئی عمل ذاتی غرض سے آلودہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ اپنی رحمت سے اس کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً مومن کا ہاتھ خدا کے ہاتھ کی طرح سب پر غالب رہتا ہے۔ وہ سب کو صحیح کاموں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کسی کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اسے دور کر دیتا ہے۔ اور کسی کا سلسلۂ کار بگڑ جائے تو اسے سنوار دیتا ہے۔ یعنی مومن کی برکت سے لوگوں کی سرگرمیاں صحیح مسلک پر رہتی ہیں۔ ان کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ ان کی بگڑی بنتی ہے۔ باطل قوتوں کے لئے ابھرنے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔

یہ شعر اس حدیث قدسی کا مفہوم پیش کرتا ہے، جو صحیح بخاری کی

کتاب الرقاق میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ اس کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

مایزال عبدی یتقرب الیّ بالنّوافل حتّٰی احبّهٗ۔ فاذا احببتہ کنت سمعہ الّذی یسمع بہ وبصرہ الّذی یبصر بہ ویدہ الّتی یبطش بھا ورجلہ الّتی یمشی بھا۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلوں کے ذریعہ سے میرے قریب ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبّت کرنے لگتا ہوں، تو اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

جب انسان اپنا وجود رضائے الٰہی کے لئے وقف کردے اور سچّا مومن بن جائے تو یقیناً اس کا ہر کام خدائی کام بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس سے خدا کی رضا کے سوا کچھ مقصود نہیں ہوتا اور وہ عین خدا ہی کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔

(۴) بندۂ مومن اگرچہ جسم کے اعتبار سے خاکی ہوتا ہے، لیکن فطرت و طبیعت کے لحاظ سے اس کے نوری ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے اندر اپنے آقا و مولا کی صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا بے نیاز دل دنیا اور عقبیٰ کی کسی چیز پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کا مقصود ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(۵) اس کی امیدیں بہت تھوڑی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کسی کام کے لئے دنیا والوں سے اجر اور معاوضے کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ اس دنیا میں خدا کی رضا پوری ہو جائے۔ کہنے کو یہ معمولی مقصد ہے لیکن حقیقت پر نظر رکھی جائے تو یہ مقصد نہایت عظیم الشان ہے۔ اس میں وہ تمام مقاصد آجاتے ہیں جنہیں اس دنیا کے بڑے بڑے انسانوں نے اپنا نصب العین بنایا۔ مثلاً خلق خدا کی بہتری اور بہبود، جہان کا امن، عالم گیر اخوت و مساوات، تمام انسانوں کو خدا کے سچے بندے بنانا اور سب کو اسی کی چوکھٹ پر جھکانا۔ دنیا میں اس سے بڑے مقصد کیا ہو سکتے ہیں جو مومن کا نصب العین بنیں؟ اس کی پوری زندگی دیکھ کر انسانوں کے دلوں میں محبت اور احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر عتاب کی نگاہ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک کی دل نوازی کرتا ہے۔

(۶) وہ بات چیت کرتا ہے تو بہت نرمی سے تلاش حق میں بہت سر گرمی دکھاتا ہے۔ میدان جنگ کا معاملہ ہو یا دوستوں کی محفل جم جائے، مومن دونوں جگہ پاک طینتی اور پاک بازی کا پیکر ہوتا ہے۔ یعنی وہ میدان جنگ یا مجلس شوریٰ میں کبھی خدا کی مقرر کی حدوں سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہی پاک دلی اور پاک بازی کا پہلا اور آخری معیار ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے اور ہر حصے میں خدا کے حکموں کے مطابق چلے اور ان سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہو۔ نیز وہ اپنی ہر حرکت میں صرف خدا کی رضا پیش نظر رکھے۔"

(۷) دنیا میں مرد مومن ہی کا ایمان و یقین پرکارِ حق کا نقطہ ہے۔ اسی کی

وجہ سے یہاں خدائی احکام جاری ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے خدا کی رضا لوگوں کا نصب العین بنتی ہے۔ لہٰذا وہی اس دنیا میں حقیقی چیز ہے۔ باقی جو کچھ ہے، وہ سراسر وہم، دھوکا اور مجاز ہے۔ یعنی مردِ مومن کے ایمان و یقین کے سوا اس دنیا کی کسی شے کو پائداری اور استواری نصیب نہیں۔

(۸) مردِ مومن ہی عقلِ سلیم کا سرچشمہ ہے۔ اسی کو عشقِ حق کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔ کائنات کی محفل میں جو رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے، وہ اسی کے دم سے ہے۔

چھٹا بند دینِ مبین: روشن دین یعنی اسلام۔ حرم مرتبت: لفظی معنی کعبہ کے ہم رتبہ۔ مراد ہے انتہائی عزت و حرمت والی۔ اندلسی: وندالوشیا کا عربی تلفظ ہے۔ یہ ہسپانیہ کے ایک صوبہ کا نام تھا۔ مسلمانوں کے زمانے میں یہ لفظ پورے اسلامی ہسپانیہ کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ خُلقِ عظیم: اقبالؔ نے ان دو لفظوں کو واوین میں لکھا ہے۔ گویا اس آیت کی طرف اشارہ مقصود ہے: اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ یعنی اے رسولؐ! آپ پیدا ہوئے ہیں بڑے خلق پر۔ اس آیت میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کا ذکر ہے جو اس کائنات میں اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ اقبالؔ کی مراد یہ ہے کہ اندلس کے مسلمان انہیں پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے جو حضرت رسول اکرم صلعم اس دنیا میں لے کر آئے تھے۔ رمزِ غریب: نادر بھید، عجیب نکتہ۔ شرق و غرب: مشرق اور مغرب یعنی ساری دنیا۔ گرمِ اختلاط: میل جول میں پرتپاک۔

(۱) اے مسجد! جن لوگوں نے فنِ تعمیر میں درجۂ کمال حاصل کیا، تیری عمارت ان کے لیے کعبہ کا حکم رکھتی ہے، یعنی انتہائی عزّت کی مستحق ہے اور وہ لوگ اس سے تعمیر کے نئے نئے نکتے سیکھتے ہیں۔ تیری ہی وجہ سے دینِ اسلام کی شوکت وعظمت نمایاں ہے۔ تیری برکت سے اندلسیوں کی سرزمین، یعنی خود اندلس، انتہائی عزّت واحترام کی مستحق بن گئی۔

(۲) اس آسمان کے نیچے تیرے حسن وخوبی کی اگر کوئی مثال ہے، تو وہ روئے زمین پر تو موجود نہیں، البتہ مسلمانوں کے قلب میں مل سکتی ہے، یعنی مسلمان ہی پھر ایسی خوب صورت اور عالی شان عبادت گاہ بنا سکتے ہیں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔

(۳) مندرجۂ بالا شعر کہتے ہی اقبال کے دل میں مسجد کے بانیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ فرماتے ہیں: آہ خدا کے وہ پاک بندے! وہ عرب کے شہسوار جو حضرت رسولِ اکرم صلعم کے اخلاقِ عالیہ کا نمونہ تھے۔ وہ جنہیں سچائی، ایمان داری، راست بازی اور یقین میں نہایت اونچا مرتبہ حاصل تھا۔

(۴) وہ جن کی حکومت نے یہ عجیب وغریب نکتہ دنیا پر واضح کیا کہ دل والوں کی سلطنت فقیری ہوتی ہے بادشاہی نہیں، یعنی وہ اس لئے نہیں آتے کہ بڑے بڑے محل بنائیں اور اپنے گرد عظمت وبرتری کے حیرت انگیز سامان جمع کر لیں۔ وہ فقر ودرویشی کا تحفہ لے کر آتے ہیں، جو کم سے کم میں گزارہ کرتے ہیں اور ہر چیز خلقِ خدا کی بہتری، بہبود اور راحت وآسائش کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہی وہ سلطنت ہے، جس کا پیغام اسلام دنیا میں لایا۔ یہی وہ حکمرانی ہے، جس کا

بہترین نمونہ خلافت راشدہ نے پیش کیا۔ جو عرب اندلس پہنچے تھے، وہ بھی یہی نمونہ لے کر گئے تھے اور اسی کی وجہ سے خود اندلسی مسیحیوں نے اپنے بادشاہ کو چھوڑ کر مسلمان عربوں کا ساتھ دیا تھا۔

(۷) وہی مردانِ حق تھے، جنہوں نے مشرق و مغرب کو صحیح تربیت دی اور یورپ کے اندھیرے میں صرف وہ تھے، جن کی عقلیں صحیح راستہ دیکھنے والی تھیں۔ انہیں کی بدولت یورپ میں علم و دانش کے چراغ روشن ہوئے اور اہل یورپ کے لئے وحشت و جہالت کے دور سے نکل کر علم و تہذیب کے دور میں آنے کا سر و سامان فراہم ہوا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے اور خود یورپی مورخ کھلے بندوں اس کی شہادت دے رہے ہیں۔

(۸) خلق عظیم کے وہی پیکر تھے جن کا لہو آج تک اندلسیوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور یورپ کی دوسری قوموں کے مقابلے میں اندلس کے باشندے خوش دل، مہمان نواز، میل جول میں بے تپاک، سادہ مزاج اور روشن پیشانیوں والے یعنی خوب صورت ہیں۔

(۹) اندلس میں آج بھی ہرن جیسی آنکھیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں اور حسینوں کی نگاہوں کے تیر آج بھی دل میں ترازو ہوتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ حسن کی یہ علامتیں عربی خون کی آمیزش کا نتیجہ ہیں۔

(۱۰) اندلس کی فضاؤں میں آج بھی یمن کی خوشبو موجود ہے اور اس کے نغموں میں آج بھی حجازی رنگ نمایاں ہے۔

بوئے یمن سے اشارہ اس مشہور مگر غیر مستند حدیث کی طرف بھی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت رسول اکرم صلعم کو یمن کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آئی۔ بظاہر اس سے یہ مراد ہے کہ جو عرب ابتدا میں اندلس جا کر آباد ہوئے ان میں بڑا حصہ یمن کے عربوں کا تھا اور ان کی نسل اب بھی وہاں موجود ہے۔ نیز اندلس کی موسیقی دوسرے یورپی ملکوں کی موسیقی کے مقابلہ میں حجازی موسیقی سے مشابہ ہے۔

ساتواں بند

المنی: جرمن۔ اصلاح دین: مراد ہے ریفرمیشن (Reformation) سے یعنی مذہبی اصلاح کی وہ تحریک جو مارٹن لوتھر باشندۂ جرمنی نے پوپ کے خلاف اٹھائی تھی اور جس کی بنا پر عیسائیت دو بڑے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ پوپ کے ماننے والے کیتھولک کہلاتے رہے۔ لوتھر کو ماننے والوں کا نام پراٹسٹنٹ پڑ گیا۔ لوتھر کا عقیدہ یہ تھا کہ نہ پوپ معصوم ہے، نہ وہ کسی کے گناہ معاف کر سکتا ہے۔ پیر کنشت: لفظی معنی کلیسا کا سب سے بڑا بزرگ یعنی پوپ۔ انقلاب فرانس: یہ انقلاب فرانس کی شہنشاہی کے خلاف تھا۔ چنانچہ بادشاہ، ملکہ اور بڑے بڑے امیر قتل کر دیئے گئے اور جمہوریت قائم ہو گئی۔ پھر نپولین برسر کار آ گیا اور فرانس میں ازسر نو شہنشاہی کا تخت بچھ گیا، لیکن انقلاب فرانس کی بدولت یورپ میں شہنشاہی کی جڑ پر کلہاڑے چلنے لگے۔ ملت رومی نژاد: مراد ہے اہل اٹلی سے۔ لذت تجدید: لفظی معنی تازہ کرنے کی لذت اس مصرع میں اشارہ اٹلی کی اس عظمت و برتری کی طرف ہے، جو اسے مسولینی کی ماتحتی میں حاصل ہوئی،

لیکن دوسری جنگ یورپ میں یہ عظمت بھی یورپ کی بعض دوسری عظمتوں کی طرح حرف غلط کی مانند مٹ گئی۔ گنبد نیلوفری، آسمان۔

(۱) اے مسجد! ستاروں کی نظروں میں تیری زمین کو آسمان کا رتبہ حاصل ہے یعنی وہ بہت بلند رتبہ ہے۔ آہ! کہ صدیاں گزر گئیں اور تیری فضا میں اذان کی آواز نہیں سنی گئی یعنی کسی نے تیرے صحن یا مأذنے سے اذان نہیں کہی۔

(۲) کچھ معلوم نہیں کہ ہنگامے پیدا کرنے اور ہلچل ڈالنے والے عشق حق کا سخت جان قافلہ کون سی وادی اور کون سی منزل میں مقیم ہے؟ وہ کب یہاں پہنچے گا؟ اور کب تیری فضا میں اللہ اکبر کی صدائیں پھر اسی طرح گونجنے لگیں گی، جس طرح اسلامی دور میں ساڑھے سات سو سال تک گونجتی رہیں۔

(۳) ملک ملک میں انقلاب پیدا ہوئے۔ جرمنی سے اصلاح دین کی تحریک اٹھی، جس نے پرانے زمانے کے تمام نقش مٹا کر رکھ دیئے۔

(۴) پوپ کی جس معصومی پر عیسائیت نے ایک وسیع مذہبی نظام تیار کیا تھا، وہ معصومی حرف غلط کی طرح محو ہو کر رہ گئی۔ اس عہد میں کسی کو سوچنے اور غور کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کوئی شخص بائیبل کا ترجمہ نہ کر سکتا تھا اور مذہب کے متعلق کوئی رائے نہ دے سکتا تھا۔ سب کی گردنیں پوپ اور اس کے مقرر کئے ہوئے کارکنوں کے سامنے جھکی رہتی تھیں۔ وہ جو کچھ کہہ دیتے تھے، اسی کو نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب لوتھر کی تحریک نے پوپ کی معصومیت ختم کی تو لوگ دین پر غور و فکر کرنے لگے۔ حقیقت حال ان پر آشکارا ہوئی۔ اسی وقت سے پرانا مذہبی ڈھانچا بالکل برباد ہو گیا۔ اسی وقت

سے آزادی فکر کا وہ دور شروع ہوا جس نے آگے چل کر یورپ کو لادینی کی راہ پر ڈال دیا۔

اقبال کا کمال یہ ہے کہ فکر کی کشتی کو نازک بتایا۔ یقیناً وہ اتنی نازک ہوتی ہے کہ موج کا ہلکا سا تھپیڑا بھی اسے تختہ تختہ کر دے سکتا ہے۔

(۵) فرانسیس کی آنکھ نے انقلاب کا نقشہ دیکھ لیا جس میں نہ محض فرانس کی پرانی شہنشاہی ہی ختم ہوئی، بلکہ یورپ کے پورے پرانے نظام سلطنت میں الٹ پلٹ شروع ہو گئی یعنی دوسرے ملکوں میں بھی بادشاہی کو ختم کر کے جمہوریتیں قائم ہونے لگیں اور وہاں نئی تہذیب نے فروغ حاصل کیا۔

(۶) رومی نسل کی ملت، یعنی اہل اٹلی جو پرانی چیزوں کی پرستش کرتے تھے، بوڑھے ہو گئے تھے، وہ مسولینی کی رہنمائی میں تجدید کی لذت سے جوان بن گئے، یعنی ان میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا ہو گئی اور وہ عظمت و برتری کے دعوے کرنے لگے۔

(۷) مسلمان کی روح میں بھی آج وہی بے قراری، وہی تڑپ ابھر رہی ہے، اس کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے؟ یہ خدائی بھید ہے زبان میں یہ طاقت نہیں کہ اسے کھول کر بیان کر سکے

(۸) سمندر میں طوفان کے آثار نمودار ہیں۔ دیکھیں اس کی تہ سے اچھل کر کیا نکلے گا؟ اور یہ نیلا آسمان جو ہمارے سر پر چھایا ہوا ہے، کیا رنگ بدلے گا؟

آٹھواں بند | آب روان کبیر: وادی الکبیر اندلس کا مشہور دریا، جس کے دونوں کناروں پر قرطبہ آباد ہے۔ مسجد قرطبہ بھی اس دریا کے قریب ہی واقع

ہے۔ امم : امت کی جمع یعنی قومیں۔

آخری بند میں اقبال اس وقت کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ جب یہ نظم لکھی گئی تھی اور یہ منظر کشی حد درجہ موزوں اور دل کشا ہے۔

(۱) پہاڑ کی وادی میں بادل شفق کی سرخی کے اندر ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورج غروب ہوتے ہوتے بدخشانی لعل کے ڈھیر چھوڑ گیا۔

یہ غروب آفتاب کا نظارہ ہے۔ غروب کے ساتھ ہی جو شفق نمایاں ہوتی ہے، اس کی شوخی ہر شے پر تھوڑا بہت رنگ چڑھا دیتی ہے اور بادل کا کوئی ٹکڑا افق پر موجود ہو تو وہ سراسر سرخ ہو جاتا ہے۔ اسی کو شاعر نے سرخی کی بنا پر لعل بدخشاں کے ڈھیر سمجھا۔ چونکہ یہ ڈھیر غروب آفتاب سے پیدا ہوئے اس لئے کہا کہ یہ آفتاب چھوڑ گیا۔

(۲) عین اسی حالت میں کسی دیہاتی لڑکی کا نغمہ فضا میں گونجا۔ اس کی لے بہت سادہ تھی۔ اس لئے کہ دیہاتی لڑکیاں موسیقی کا فن سیکھ کر نہیں گاتیں۔ محض خوش گلوئی کی بدولت شوق پورا کر لیتی ہیں۔ سادگی کے باوجود اس نے میں درد اور سوز بھرا ہوا تھا۔ سچ ہے جوانی کا زمانہ دل کی کشتی کے لئے سیل کا حکم رکھتا ہے یعنی اسے جدھر چاہتا ہے بہائے جاتا ہے۔

اقبال نے اس مصرع میں عالم انسانیت کی ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جوانی کی حیثیت ایک تیز و تند سیل کی سی ہے۔ اس میں نہ کہیں اٹکاؤ ہے، نہ ٹھہراؤ۔ جدھر رخ ہو گیا، نکل گیا۔ اس میں نفع نقصان کا موازنہ بھی عموماً نہیں ہوتا۔ یہ کیفیت اسی شخص پر واضح ہو سکتی ہے جس نے

تیز و تند سیل میں کشتی کو بہتے دیکھا ہو۔ جوانی گزر جائے تو انسان ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ قدم قدم پر رکتا ہے۔ گرد و پیش کو دیکھتا ہے۔ جب آگے بڑھتا ہے۔ اس مصرع میں ایک خوبی یہ ہے کہ جوان لڑکی کا گیت سننے والے ہر شخص کے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جب تک یہ کیفیت رہتی ہے، وقت اس طرح گزر جاتا ہے جیسے زندگی کی کشتی ایک سیل میں بہ رہی ہو۔ ابھی یہاں تھی، تھوڑی ہی دیر میں یہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

(۳) اے وادی کبیر! تیرے کنارے کوئی شخص بیٹھا ہوا کسی اور ہی زمانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

'کوئی' سے مراد یہاں خود اقبال ہے۔

(۴) وہ آنے والا زمانہ اگرچہ ابھی تک تقدیر کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور ظاہر نہیں ہوا لیکن میری نگاہیں اس کے طلوع کو بے نقاب دیکھ رہی ہیں۔

(۵) میں اگر اپنے تصورات کے چہرے سے پردہ اٹھا دوں اور بتا دوں کیا کچھ ہونے لگا ہے تو یورپ میری ان انقلابی باتوں کی تاب نہ لا سکے گا۔

(۶) پھر زندگی کا ایک زرّیں اصول پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جس زندگی میں انقلاب رونما نہ ہو، وہ زندگی نہیں ہوتی ہے۔ قوموں کی روحیں انقلابی کشمکش ہی کی بدولت زندہ رہتی ہیں۔

(۷) جو قوم ہر وقت اپنے اعمال کی جانچ پڑتال کرتی رہتی ہے، اسے اندازہ رہتا ہے کہ کہاں لغزش ہوئی، کہاں ٹھوکر کھائی، وہ اپنی ہر لغزش اور ہر ٹھوکر کی تلافی کر لیتی ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کے میدان میں ہمیشہ کامیاب

رہتی ہے اور قدرت کے ہاتھ میں تلوار کا کام دیتی ہے یعنی اسی سے قدرت اپنے تمام کام لیتی ہے۔

(۸) جن نقوش میں جگر کا خون شامل نہ ہو، وہ نامکمل رہتے ہیں۔ خون جگر کے بغیر شاعری بھی سودائے خام کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

خلاصہ مطالب | یہ لمبی نظم ہے، لہٰذا اس کے مطالب کا خلاصہ بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ خوانندگان کرام کو نظم کا سلسلۂ فکر ذہن نشین کرنے میں سہولت رہے۔

(۱) پہلے بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے زمانے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس دنیا کے لئے ثبات کی کوئی صورت نہیں۔

(۲) دوسرے بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو نقش کسی مرد خدا کے ہاتھوں ثبت ہو، اس میں ہمیشگی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مرد خدا کے تمام کام عشق حق کی بدولت انجام پاتے ہیں اور عشق حق زمانے کی رو کو بھی روک لیتا ہے۔ ساتھ ہی عشق کے مختلف مظاہر، اوصاف کا ذکر کیا ہے۔

(۳) تیسرے بند میں مسجد قرطبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تجھے بھی عشق حق ہی کی بدولت پائداری نصیب ہوئی۔

(۴) چوتھے بند میں مسجد کے حسن و شکوہ کا ذکر کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کی پائداری کا پیغام دیا ہے۔

(۵) پانچویں بند میں مسجد ہی سے خطاب کرتے ہوئے مرد مومن کے اوصاف بتاتے ہیں۔

(۶) چھٹے بند میں ان عربوں کے اوصاف و خصائص پیش کئے ہیں، جن کے ہاتھوں اندلس فتح ہوا اور مسجد تعمیر ہوئی۔

(۷) ساتویں بند میں یہ بتایا ہے کہ یورپ کی مختلف قوموں میں انقلابات آچکے، ملت اسلامیہ کی روح میں بھی انقلاب کی لہریں اٹھ رہی ہیں، دیکھیں، نتیجہ کیا نکلے۔

(۸) آٹھویں اور آخری بند میں قرطبہ کے بعض دل کش مقامی مناظر کا نقشہ پیش کرتے ہوئے یہ پیغام دیا ہے کہ نیا دور آنے والا ہے، اور جس زندگی میں انقلاب نہ ہو، وہ موت کے برابر ہے۔ قوموں کی روح کشمکش انقلاب ہی کی بدولت زندہ رہتی ہے۔

قید خانے میں معتمد کی فریاد

اندلس میں بنی امیہ کی سلطنت مٹ گئی تو مختلف حصوں میں متعدد سلطنتیں بن گئیں۔ اندلس کی تاریخ میں اس دور کو طوائف الملوکی کا دور کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک سلطنت بنو عباد کی تھی، جس کا مرکز اشبیلیہ (Seville) تھا اور قرطبہ بھی اس میں شامل ہو گیا تھا۔

بنو عباد کا سب سے بڑا اور مشہور بادشاہ المعتمد علی اللہ تھا جو عام طور پر معتمد کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ ۴۶۸ھ سے سنہ ۴۹۱ھ تک بادشاہ رہا۔ خود نہایت خوش ذوق شاعر تھا اور اہل علم خصوصاً شعرا کا بڑا مربی سمجھا جاتا

تھا۔ اس زمانے میں ہسپانیہ کے عیسائیوں نے اسلامی حکومتوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ بعض حکومتیں باہمی رقابتوں میں عیسائیوں سے امداد بھی لیتی تھیں اور بعض ان کے زیر اثر بھی چلی گئی تھیں۔ معتمد نے بھی عیسائی بادشاہ الفانسو کو خراج دینا منظور کر لیا تھا۔ الفانسو نے ایک مرتبہ اپنے یہودی ذریعہ کو خراج وصول کرنے کے لئے بھیجا تو یہودی نے مطالبہ کیا کہ معتمد پورا خراج سونے کی شکل میں ادا کرے۔ بات چیت میں یہودی کی زبان سے کوئی نامناسب کلمہ نکلا معتمد نے دوات اٹھا کر اس کے منہ پر ماری۔ پھر پکڑوا کر قتل کرا دیا۔ اس پر الفانسو سے جنگ ناگزیر ہو گئی۔ معتمد نے مختلف اسلامی حکومتوں کو اکٹھا کر کے دفاع کے لئے تیار کیا اور یہ تجویز بھی پیش کی کہ مراکش کے مشہور حکمراں یوسف بن تاشفین کو امداد کے لئے بلایا جائے۔ بعض حکمرانوں نے شبہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے، یوسف خود ہماری سلطنتیں سنبھال لے۔ معتمد نے توقف کہا کہ میں سوروں کے ریوڑ چرانے کے بجائے اونٹوں کا چرواہا بننا پسند کروں گا یعنی عیسائی حکمراں کی محکومی کے مقابلے میں مسلمان حکمراں کی محکومی بصد شوق منظور ہے۔

بہر حال یوسف نے امداد منظور کر لی۔ الفانسو نے یہ سنا تو اسے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں بہت سے طعنے دیئے گئے تھے۔ یوسف نے اپنے سر کاتب (سکریٹری) کو جواب لکھنے کا حکم دیا۔ وہ بھی عربی میں ایک لمبا چوڑا خط لکھ کر لایا۔ یوسف چند ہی سطریں سن کر جھنجھلایا اور بولا: خط کی پشت پر صرف اس قدر لکھ دو کہ جو کچھ ہونے والا ہے، اسے تو عنقریب دیکھ لے گا۔ ساتھ ہی

بے تابانہ وہ اندلس پہنچا۔ زلاقہ کے میدان (۱۲ رجب ۴۷۹ھ - ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء) الفانسو کو ایسی شکست فاش دی کہ پھر اسے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

عیسائیوں کے حملے کا خطرہ ٹل گیا تو مسلمان حکمراں پھر آپس میں لڑنے لگے۔ یوسف بن تاشفین نے تمام حالات پر غور کر کے اسلامی حکومت کی حفاظت کے لئے اندلس کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ ۱۰۹۱ء میں معتمد کو اشبیلیہ سے مراکش لایا گیا۔ زندگی کے باقی دن اس نے اغمات میں بحالت قید گزارے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس کی آخری زندگی بڑی ہی تلخ گزاری۔ اس کی لڑکیاں سوت کات کر جو پیسے کماتی تھیں، ان سے کنبے کا گزارہ چلتا تھا۔ ۱۰۹۵ء میں معتمد نے وفات پائی۔

عربی مورخوں نے معتمد کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں۔ جس نظم کا ترجمہ اقبال نے کیا ہے، وہ خود ان کے بیان کے مطابق انگریزی میں ترجمہ ہو کر Wisdom of The East Series چھپ چکی ہے۔

(۱) میں قید میں ہوں میرے سینے میں ایک ایسی فریاد باقی رہ گئی ہے جس میں کوئی چنگاری نظر نہیں آتی۔ گویا میری فریاد سوز سے بھی خالی ہو گئی اور اس میں اثر بھی نہیں رہا۔

(۲) مجھ ایسا آزاد مرد قید میں پڑا ہوا ہے۔ نہ نیزہ پاس ہے نہ تلوار میں بھی اپنی اس حالت پر پشیمان ہوں اور میری تدبیر بھی پشیمان ہے۔

تدبیر کی پشیمانی سے غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ میں نے عیسائیوں کے مقابلے میں اسلامی حکومتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یوسف کو بلایا تھا لیکن وہ خود ان

سلطنتوں کا مالک بن بیٹھا اور مجھے قید کر لیا۔ مضمون کی مناسبت کے لحاظ سے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ معتمد کا بیٹا قید سے نکل بھاگا تھا اور اس نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کے لئے سعی شروع کر دی تھی۔ اس وجہ سے معتمد پر سختیاں بڑھ گئیں، حالانکہ بیٹے کے معاملے میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔

(۳) میرا دل خود بخود زنجیر کی طرف کھچا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زنجیر میں بھی وہی فولاد استعمال ہوا ہے، جس سے میری تلوار بنی تھی۔

مراد یہ ہے کہ تلوار سے مجھے خاص دل بستگی تھی۔ چونکہ زنجیر میں بھی ویسی ہی کشش محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ میری تلوار اور یہ زنجیر ایک فولاد سے بنی تھیں۔

(۴) میری دو دھاری تلوار ہی اب میری زنجیر ہے۔ یعنی ایک زمانے میں میں صاحب شمشیر تھا اور اس وجہ سے تخت حکومت میرے قبضے میں تھا۔ میرے اسی بلند منصب کا انجام یہ ہوا کہ مجھے قید میں ڈالا گیا۔ اللہ اکبر! انسان کی تقدیر کا خالق کس قدر شوخ اور بے پروا ہے!

عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت

(سرزمین اندلس میں)

عبدالرحمٰن اوّل جو الداخل کے لقب سے مشہور ہے، اندلس میں

اموی سلطنت کا بانی تھا۔ یہ مروانی خاندان میں سے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کا پوتا اور اس کے فرزند معاویہ کا بیٹا تھا۔ ناز و نعمت میں پرورش پائی۔ بیس سال کا تھا کہ عباسیوں نے اموی سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور اس خاندان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کیا۔ عبد الرحمٰن جان بچا کر بھاگا۔ شام سے مصر وہاں سے مراکش ہوتا ہوا اندلس پہنچ گیا۔ اس سفر میں جو تکلیفیں اٹھائیں، وہ بڑی ہی خوفناک تھیں۔ تھوڑی سی فوج کے ساتھ اندلس کے اموی گورنر پر فتح پائی۔ پھر سالہا سال کی محنت سے سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ بڑا مجاہد، جانباز، مدبر اور خوش اخلاق حکمران تھا۔ اسی سے اندلس کی اسلامی سلطنت کا عروج شروع ہوا۔

اس نے قرطبہ کے پاس اپنے لئے ایک خاص باغ بنوایا تھا، جس کا نام رصافہ رکھا۔ اسی میں اپنے لئے محل بنایا۔ اس باغ میں کھجور کا بھی ایک درخت لگوایا تھا۔ ایک روز کھجور کے درخت کو دیکھ کر اپنی پہلی حالت یاد آگئی۔ اس نے چند شعر عربی میں لکھے جو تاریخ المقری میں درج ہیں۔ اقبال نے پہلے بند میں اس کے شعروں کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ دوسرا بند اقبال کے اپنے تاثرات کا مرقع ہے۔

پہلا بند | (۱) اے کھجور کے درخت! تو میری آنکھوں کا نور ہے۔ تو میرے دل کے لئے سرور و شادمانی کا پیغام ہے۔

(۲) میں اپنے وطن سے دور بیٹھا ہوں۔ تو میرے وطن کا خاص درخت ہے اور میرے لئے تجھے وہی حیثیت حاصل ہے، جو نخلی نخل کی وجہ سے

نخل طور کو حاصل ہوئی۔

(۳) تجھے یورپ کی آب و ہوا نے پالا، حالانکہ تو عرب کے جنگل کی حور ہے۔ یعنی میری طرح تو بھی پردیس میں پلا اور سرسبز و شاداب ہوا، جس طرح میں نے پردیس میں آکر سلطنت پائی۔

(۴) لیکن میرے دل میں وطن کی محبت اسی طرح موجود ہے، جس طرح پہلے تھی، اس وجہ سے بے صبر اور بے قرار رہتا ہوں۔ پردیس میں ہونے کے سبب سے تیری بھی یہی کیفیت ہے۔

(۵) میری دعا ہے کہ اس اجنبی سرزمین کی آب و ہوا میں تو پھولے پھلے اور صبح کی شبنم تیرے لئے سقائی گری کا کام کرے، یعنی تجھے اپنی نمی سے ہرا بھرا رکھے۔

دوسرا بند | شناوری: تیرنا۔ شام: مراد ہے ملک شام سے۔

عبدالرحمٰن کو شام کا ٹوٹا ہوا ستارہ اس لئے کہا کہ اس کا اصل وطن شام ہی تھا۔ وہاں اموی سلطنت باقی نہ رہی تو یہ ستارہ غروب ہو گیا اور اجنبی سرزمین میں دوبارہ سلطنت حاصل کر کے چمک اٹھا۔

(۱) دنیا کا سماں نہایت عجیب و غریب اور نرالا ہے۔ اسے دیکھتے دیکھتے نگاہ کا دامن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔

مراد یہ ہے کہ یہاں کسی حالت کو قرار نہیں۔ آج ایک انسان عروج کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہوا ہے، کل اس طرح گر جاتا ہے کہ کہیں ٹھکانا نہیں ملتا۔ یہ حالت نگاہ کا دامن ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے، یعنی

عروج و زوال کے یہ نظّارے دیکھے نہیں جا سکتے۔

(۲) اس جہان کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے، جس کا کوئی کنارہ نظر نہ آتا ہو۔ یہاں عزم و ہمّت کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو عزم و ہمت سے کام لے کر اس سمندر میں تیرتے رہتے ہیں۔

(۳) انسان مٹی کا پتلا ہے۔ مٹی سے کبھی چنگاریاں پیدا نہیں ہوئیں۔ یہاں وہی انسان حقیقی معنوں میں زندہ ہے، جو اندرونی سوز یعنی دل کی جلن سے شرف پا چکا ہو۔

سوزِ دل سے مراد ہے کہ اس کے سامنے کوئی بڑا نصب العین ہو، اسے پورا کرنے کی دل میں سچی لگن اور تڑپ موجود ہو اور وہ اپنی زندگی اسی جدوجہد میں تمام کر دے۔

(۴) دیکھو یہ ہمت اور دلی تڑپ ہی کی برکت تھی، جس کی بدولت ملک شام کے آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ پردیس کی صبح میں اور زیادہ روشن ہو گیا، یعنی عبد الرحمٰن شام میں تھا تو اموی خاندان کا ایک شہزادہ تھا، وہاں سے نکل کر اندلس پہنچا تو ایک بہت بڑی سلطنت کا مالک اور بانی بن گیا اور تاریخ کے صفحات پر اس کا نام ہمیشہ کے لئے سنہری حرفوں میں ثبت ہو گیا۔ اس شعر میں صبح و شام کا تقابل قابلِ غور ہے۔

(۵) انسان ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہو تو اس کی دنیا کسی ایک ملک میں محدود نہیں رہتی، وہ جہاں جاتا ہے، اپنے لئے مقام اور وطن پیدا کر لیتا ہے۔

اقبال نے عبدالرحمٰن کی مثال سامنے رکھ کر اپنا اصلی پیغام نظم کے آخری شعر میں دیا اور وہ یہ کہ مسلمان اس دنیا میں صرف عروج اور سربلندی کے لیے آیا ہے اور اس کی سربلندی کسی ایک ملک سے مخصوص نہیں۔ وہ ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف جاتا ہے تو وہاں بھی اپنی قوتِ ایمان، اپنے سوزِ دروں اور اپنے عزم و ہمت سے سربلندی کے سامان فراہم کر لیتا ہے۔

رباعی

اے مسلمان! تیری رگوں میں وہ لہو باقی نہیں، جو تیرے بزرگوں کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ان کا سا دل اور ان کی سی آرزو بھی نظر نہیں آتی۔ تو نماز بھی ادا کرتا ہے۔ روزے بھی رکھتا ہے۔ عید کے موقع پر قربانی بھی کرتا ہے اور حج کے لیے حرم میں بھی جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں بے شک موجود ہیں۔ لیکن تیری حالت بدل گئی۔ تیری پہلی شان باقی نہ رہی۔

مراد یہ ہے کہ اسلام نے جن ارکان و احکام کو ضروری قرار دیا، انھیں رسماً پورا کر لینا کافی نہیں، ان ارکان و احکام کی جو روح ہے، وہ اپنے اندر جذب کرنی چاہیے۔ اس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ بچہ تعلیم کی غرض سے ہر روز باقاعدہ مدرسے جائے، لیکن کتابوں پر توجہ نہ کرے۔ سبق باقاعدہ نہ پڑھے یا اسے یاد نہ کرے۔ اس صورت میں اس کا مدرسے جاتے رہنا

ہرگز فائدہ مند نہ ہوگا، اس لئے کہ اس نے جانے کی رسم تو پوری کر دی، لیکن تعلیم حاصل کرنے کا حق ادا نہ کیا۔ اسلامی ارکان و احکام کی پابندی ایسی صورت میں اسلامی شان پیدا کر سکتی ہے کہ ان کی معنوی حیثیت کے فیض سے مسلمان محروم نہ رہے۔

ہسپانیہ

اقبال نے یہ خود لکھا ہے کہ یہ شعر واپسی کے وقت ہسپانیہ ہی کی سرزمین میں لکھے گئے۔

کوہ وکر: پہاڑ اور اس کا دامن۔ غرناطہ: اندلس کا مشہور شہر جو قرطبہ کی عظمت مٹ جانے کے بعد ہسپانیہ کے آخری اسلامی حکمران خاندان کا دار الحکومت تھا۔ یہ شہر ۱۴۹۲ء میں ہسپانیہ کے عیسائی تاجدار فرڈی نینڈ اور اس کی ملکہ ازابلا کے حوالے ہوا۔ غرناطہ ہی میں وہ مشہور شاہی محل تھا جس نے الحمرا کا نام پایا اور آج بھی وہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔

(۱) اے ہسپانیہ! تو مسلمانوں کے خون کا امانت دار ہے۔ اس وجہ سے تیری زمین میری نگاہوں میں کعبہ کی طرح پاک ہے۔

جس سرزمین کی فتح و تسخیر میں مسلمانوں کا خون بہا، جس کی حفاظت کے لئے وہ صدیوں تک اجنبیوں کی یورشوں کا مقابلہ کرتے رہے جس

کے چپّے چپّے میں اسلام کے جلیل القدر مجاہد، سالار، تاجداران مدبّر، ادیب محدث، قاضی، فلسفی اور مورخ محو خواب ہیں۔ وہ ایک دردمند مسلمان کی کی نظروں میں کیوں زیادہ سے زیادہ احترام کی مستحق نہ ہو۔ یہ تعریف اس سرزمین کی نہیں بلکہ مسلمان کے خون کی ہے۔

(۲) اے ہسپانیہ! تو میری نگاہوں میں کیوں پاک نہ ہو؟ تیری خاک کے چپّے چپّے پر مسلمانوں کے سجدوں کے نشان ہیں، اس لئے کہ وہ ساڑھے سات سو سال تک اس سرزمین پر نمازیں ادا کرتے رہے تھے۔ صبح کے وقت تیرے طول و عرض میں جو ہوا چلتی ہے، اس میں مجھے خاموش اذانیں سنائی دیتی ہیں، یعنی میرے دل کے کان اس دور کی یاد تازہ کر لیتے ہیں جب تیری فضا میں مردان حق کی اذانیں گونجتی تھیں۔ وہ اگرچہ اب سنائی نہیں دیتیں لیکن تیری فضا کی لہروں میں ان کی پہلی گونج اب تک محفوظ ہے۔

(۳) سجدے کرنے اور اذانیں دینے والے کون تھے؟ وہ بہادر اور جواں مرد عرب جن کے نیزوں کی نوکیں ستاروں کی طرح درخشاں تھیں۔ میرے دل میں وہ زمانہ اب تک تازہ ہے، جب ان کے خیمے تیرے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور ان کے دامنوں میں نصب تھے۔

(۴) اے ہسپانیہ! کیا تیرے حسینوں کو مہندی کی ضرورت ہے؟ میرے جگر کا خون یہ ضرورت پوری کر سکتا ہے اس لئے کہ اس میں ابھی تک سرخی باقی ہے۔

(۵) میں نے مانا کہ مسلمان کی چنگاری میں پہلے کی سی تپش اور حرارت باقی

نہیں، لیکن وہ چنگاری گھاس پھوس سے کیوں کر دب سکتی ہے؟

(۶) میری آنکھوں نے غرناطہ بھی دیکھ لیا، لیکن مسافر کے لئے سفر یا اقامت میں کہیں آرام اور چین نہیں۔

مراد یہ ہے کہ ہسپانیہ کے بہترین مناظر دیکھ کر بھی دل کو تسکین نہ ہوئی۔

(۷) میں نے ہسپانیہ میں اسلامی آثار خود بھی دیکھے۔ ان کے نقشے دوسروں کے سامنے بھی پیش کئے۔ مسلمانوں کی داستانیں سنیں بھی اور سنائیں بھی، لیکن نہ دیکھنے سے دل نے چین پایا نہ سننے سے۔

رباعی

مہدی: لفظی معنی ہدایت کرنے والا۔ آخر زمانی: لفظی معنی آخری زمانے میں آنے والا۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب دنیا فسق و فجور سے بھر جائے گی تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایک ایسا مہدی بھیجے گا جو باطل کی قوتوں کو مٹا کر رکھ دے گا اور اسلام کا ڈنکا نئے سرے سے بج جائے گا۔ اس آنے والے کو وہ آخری زمانے کا مجدد سمجھتے ہیں۔ اسی کو اقبال نے مہدی اور آخر زمانی کے لقبوں سے یاد کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ چھپے ہوئے بھید ظاہر ہوئے جاتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ تجلی ذات کی آرزو کے جواب میں لن ترانی کہا جائے۔ وہ زمانہ گزر گیا۔

واضح رہے کہ اس سے حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ مقصود نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے جلوے ایک پیغمبر دیکھ سکتا ہے۔ وہ غیر پیغمبر کو نظر نہیں آسکتے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اب جلووں سے محرومی کا زمانہ گزر گیا۔ حقیقت یہ ظاہر ہوئی کہ جس عظیم القدر شخصیت کی خودی سب سے پہلے نمودار ہوئی اس کو مہدیٔ آخرالزماں سمجھنا چاہیے۔

مدعا یہ ہے کہ اسی شخص کو مہدیٔ آخرالزماں کا منصب ملے گا یا اسی کو اس منصب کا حامل سمجھنا چاہیئے جس کی خودی سب سے پہلے نمایاں ہو۔

طارق کی دعا

(اندلس کے میدان جنگ میں)

طارق ابن زیاد اصل و نسل کے اعتبار سے بربر تھے۔ جب بربر قوم اسلام لائی تو طارق کے والد مسلمان ہوئے اور انھوں نے غالباً دمشق میں سکونت اختیار کرلی۔ سلطنت امیہ کے مشہور سپہ سالار موسیٰ بن نصیر نے طارق کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ نوجوان سولہ برس کا تھا جب فوج میں بھرتی ہوا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر بہت جلد ایک جیش کا سالار بن گیا۔ موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید کے عہد میں افریقیہ (شمالی و مغربی افریقہ جسے مغرب اقصیٰ کہتے ہیں) کا گورنر بنا اور اندلس سے ایک جماعت اس کے پاس راڈرک شاہ ہسپانیہ کے ظلم و ستم کی فریاد لے کر آئی تو موسیٰ نے

ایک چھوٹی سی جماعت ہسپانیہ بھیج دی جو ساحلی جزیروں پر یورش کے بعد لوٹ آئی۔ پھر مستقل حملے کا فیصلہ کیا گیا اور طارق ابن زیاد حملہ آور فوج کا سالارِ اعظم مقرر ہوا۔ وہ صرف پانچ ہزار مجاہد ساتھ لے گیا تھا۔ اور اسی مقام پر اترا تھا جو آج تک جبل طارق کی شکل میں اس کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اس کے پاس چار جہاز تھے، جنہوں نے کئی چکروں میں اسلامی فوج کو افریقہ سے ہسپانیہ پہنچایا۔ آخری چکر میں طارق خود گیا اور مشہور ہے کہ ہسپانیہ کے ساحل پر اترتے ہی طارق نے جہاز جلانے کا حکم دے دیا تاکہ کسی مجاہد کو واپسی کا خیال تک نہ رہے اور عزیمت کے پیکر بن کر ہسپانیہ میں اپنے لئے جگہ پیدا کریں۔

ابتدا میں معمولی چھیڑیں ہوئیں۔ طارق آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ اسے تھوڑی سی کمک اور مل گئی۔ پھر جھیل لاجنڈا کے کنارے راڈرک شاہ ہسپانیہ سے فیصلہ کن جنگ ہوئی جو تین روز جاری رہی۔ طارق کے پاس کل گیارہ ہزار جاں باز تھے۔ راڈرک کی فوج کا اندازہ کم از کم نوے ہزار کیا گیا ہے۔ طارق کے جاں باز غریب الوطن تھے اور اجنبی ملک میں لڑ رہے تھے۔ راڈرک اپنے ملک میں تھا اور تمام ملکی وسائل اس کے قبضے میں تھے، بایں ہمہ اس نے شکست فاش کھائی۔ میدان جنگ سے بھاگ نکلا، لیکن دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس ایک جنگ نے ہسپانیہ کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا۔

اقبال نے دعا کے نام سے جو شعر کہے ہیں، ان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ

واقعی طارق کی زبان سے اسی مضمون کی دعا نہیں لفظوں میں نکلی تھی۔ مراد یہ ہے کہ اگر طارق کے دلی جذبات کا اندازہ کیا جا سکتا تو اقبال کے تاثر کے مطابق وہ جذبات ایسی ہی دعا کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔

پہلا بند	خیابان: پھولوں کی کیاری۔ عرفاً مراد باغ۔

(۱) اے باری تعالیٰ! یہ غازی تیرے وہ بندے ہیں، جن کے بھید ہر شخص پر روشن نہیں ہو سکتے۔ ان کے مقاصد اور ان کے عزائم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو نے اپنی رحمت سے اس دنیا میں اپنی نیابت اور خلافت کا منصب عطا کیا۔ یہ وہی کام انجام دینا چاہتے ہیں، جو تیری رضا کے عین مطابق ہے۔

ذوق خدائی سے غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات پیدا کرے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ۔ جو لوگ اس دنیا میں خدا کی رضا پوری کرتے ہیں اور اس کے احکام کو رواج دیتے ہیں، وہ حقیقت میں خدا کے کارندے ہوتے ہیں اور ان کے اس جذبے کو ذوقِ خدائی سے تعبیر کرنا ہر لحاظ سے مناسب ہے۔ پھر اقبال کی احتیاط ملاحظہ ہو کہ فرمایا: یہ ذوق انہیں خدا ہی نے بخشا ہے۔

"پراسرار" بندوں کی ایک شرح یہ کی گئی ہے کہ اندلس کو عربوں کے حملے کی پہلی خبر ان لفظوں میں ملی تھی کہ خدا جانے یہ حملہ آور زمین سے ابل پڑے یا آسمان سے ٹپکے۔ گویا اس حملے نے اہل ہسپانیہ کو سراسر حیرت میں ڈال دیا تھا، لہٰذا ہسپانوی نقطۂ نگاہ سے وہ پراسرار ہوئے۔

یہی غازی ہیں، جن کی ٹھوکر سے جنگلوں اور دریاؤں کے دل دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہی غازی ہیں، جن کی ہیبت سے پہاڑ سمٹ کر رائی بن گئے۔
مراد یہ ہے کہ ان کی یورشیں اور ترک تازیاں نہ جنگل روک سکتے ہیں نہ دریا اور نہ پہاڑ۔ جو بھی چیز ان کی راہ میں حائل ہوتی ہے، انہیں روکنے میں ناکام رہتی ہے۔

(۳) سچ ہے، عشق و محبت میں ایسی لذت ہے کہ وہ انسان کے دل کو دونوں جہانوں سے بیگانہ بنا دیتی ہے یعنی اے باری تعالیٰ! یہ غازی تیرے عشق میں اس درجہ سرشار ہیں کہ دنیا اور آخرت میں تیرے سوا ان کا کوئی مقصود نہیں۔ یہ لڑتے ہیں تو تیرے لئے اور صلح کرتے ہیں تو تیرے لئے۔ جیتے ہیں تو تیری خاطر اور مرتے ہیں تو تیری خاطر۔

(۴) مومن کا مقصود و مطلوب شہادت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ مال غنیمت کا خواہاں نہیں ہو سکتا اور سلطنت و حکومت کا طلب گار نہیں بن سکتا۔
شہادت کے لفظی معنی ہیں گواہی۔ اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ انسان راہ حق میں اپنی جان بے دریغ قربان کر دے، لیکن یہاں مقصود صداقت اور حق پرستی کی گواہی ہے۔ ایمان دار لوگوں کی فوجیں جب اپنے وطن سے باہر نکلتی ہیں تو اس لئے نہیں نکلتیں کہ مال و دولت حاصل کریں۔ سونے اور چاندی کے انبار سمیٹ لیں یا بڑی بڑی سلطنتیں پیدا کر لیں۔ ان کا مقصود صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہر جگہ خدا کے نام کا ڈنکا بجائیں۔ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کو دنیا تک پہنچائیں۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں

شہادت کہتے ہیں۔ البتہ شہادت کی آخری منزل یہ ہے اگر خدا کی رضا کے کام انجام دیتے ہوئے جان دے دینے کا موقع بھی آجائے تو ایمان دار لوگ اپنا فرض ادا کرتے رہیں خواہ ان کے جسم کا عضو عضو کٹ جائے۔

(۵) ہسپانیہ کو سرسبزی، شادابی اور آبادی کے لحاظ سے پھولوں کی کیاری یا باغ کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے لالے مدّت سے منتظر کھڑے ہیں انھیں ایسی قبا کی ضرورت ہے، جو شہیدوں کے خون سے تیار ہو یعنی اس سرزمین میں بھی اے باری تعالیٰ تیرا نام بلند ہونا چاہیے۔ میں اور میرے غازی قربانی کا عزم لے کر آگئے ہیں کہ اسے بھی اسلامی رنگ میں رنگ دیں۔

دوسرا بند | خبر: اس کے لفظی معنی ہیں آگاہی کبھی کبھی یہ لفظ حدیث کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مراد ہے حقائق دین اور حقائق حیات سے آگاہی۔ نظر: لفظی معنی دیکھنا۔ اس سے نظری علوم بھی مراد ہو سکتے ہیں اور وہ نظر بھی جو چیزوں کی گہرائیوں تک جا پہنچتی ہے۔ اقبالؔ نے خود ہی ضربِ کلیم میں کہا ہے، اے اہل نظر! ذوقِ نظر خوب ہے۔ لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا۔ لاتذر: یہ سورہ نوح کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔	اور نوحؑ نے کہا، اے میرے رب! تو زمین پر کافروں میں سے ایک کو بھی باقی نہ رہنے دے۔

عزائم: عزم کی جمع، ارادے۔

(۱) اے باری تعالیٰ! تو نے بیابان میں رہنے والے لوگوں کو حقائق

حیات میں، حقیقتِ اشیا کی پہچان میں اور صبح کی اذان میں بیگانہ اور بے مثال بنا دیا۔

صبح کی اذان کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ صبح کے وقت اس کی آواز بے حد دلکش ہوتی ہے اور انسان کے دل میں خدا کی عبادت کا ذوق پیدا کرتی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ یہی زندگی بخش صدا سوتوں کو جگاتی ہے۔ اقبال کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشہ بہترین اور حد درجہ پر تاثیر چیزوں کو انتخاب کرتے ہیں۔ حالانکہ بظاہر خبر و نظر سے اذان کو کوئی مناسبت نہیں اور بے ذوق آدمی شاید یہی کہے کہ صرف قافیے کی مجبوری سے اذان سحر لائے

(۲) جس تڑپ اور تپش کے لئے زندگی صدیوں سے طلب گار بنی ہوئی تھی، وہ اسے انہیں صحرائیوں کے جگر میں ملی۔

مراد یہ ہے کہ انسانوں میں زندگی کی حقیقی لو لگانے اور انہیں صحیح طریق حیات سکھانے کا کام عربوں ہی نے انجام دیا اور کوئی قوم انجام نہ دے سکی۔

(۳) ان کی اور خصوصیت کیا ہے؟ یہ کہ وہ موت کو ہلاکت نہیں سمجھتے بلکہ دل کے بند دروازوں کا کھلنا سمجھتے ہیں۔

موت کو ہلاکت وہی سمجھ سکتے ہیں، جنہیں حیات بعد الموت کا یقین نہ ہو جس قوم کے لئے اس دنیا کی زندگی حیات آخرت کی کھیتی ہے، جو آخرت کی زندگی کو موجودہ زندگی سے ہزار درجہ بہتر اور افضل سمجھتے ہیں،

انہیں موت کیوں کر ڈرا سکتی ہے۔ وہ اسے فنا کا پیغام کیوں کر قرار دے سکتے ہیں؟ ان کے لئے تو موت دلی مراد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

(۴) اے باری تعالیٰ! تو اپنی رحمت سے مردِ مومن کے دل میں پھر اسی بجلی کو زندہ کر دے، جو حضرت نوحؑ کے نعرۂ لاتذر میں موجود تھی یعنی اس دنیا سے کفر کی ظلمت مٹا دے اور اسے ایمان کے نور سے بھر دے۔

(۵) اے باری تعالیٰ! عزم اور بلند حوصلگی کی جو بخششیں مومنوں کے سینوں میں محوِ خواب ہیں، انہیں جگا دے تاکہ وہ پھر عظیم الشان مقاصد کے لئے سرگرمِ عمل ہو جائیں اور مسلمان کی نگاہ میں تلوار کی تیزی پیدا کر دے تاکہ وہ جدھر پڑے، باطل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور حق کو انتہائی سربلندی پر پہنچا دے۔

رباعی

زمانہ ہمیشہ سے گردش کرتا آیا ہے اور کرتا رہے گا۔ بس تو ایک حقیقت ہے۔ باقی سب کہانیاں ہیں۔ نہ کسی نے گزری ہوئی کل دیکھی ہے، نہ آنے والی کل۔ تیرا زمانہ فقط آج ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو کل گزر چکی ہے یعنی زمانۂ ماضی، اس کے قصوں میں الجھے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گزرے ہوئے لوگوں میں سے جو اچھے تھے، وہ اپنے اعمال کی جزائیں پائیں گے جو برے تھے، انہیں سزا ملے گی۔

تجھے اس ماضی سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ باقی رہی آنے والی کل، یعنی مستقبل تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا رنگ ڈھنگ اور انداز کیا ہو گا؟ اس کے تصوّر میں بیٹھے رہنے بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ جو زمانہ اسے میسر ہے یعنی حال اس سے فائدہ اٹھائے اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہدایت خداوندی کے مطابق جد و جہد میں لگا گرم رہے۔

دوش، فردا اور امروز زمانے کی گردش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ گزرے ہوئے زمانے کا غم اور آئندہ زمانے کی امید کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وقت انسان کو میسّر ہے، اس سے کام لے۔

لینن

(خدا کے حضور میں)

لینن دورِ حاضر کا بہت بڑا انقلابی تھا۔ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا اور طالب علمی ہی کے زمانے میں انقلابی بن گیا۔ اس کے بڑے بھائی کو انقلابی سرگرمیوں ہی وجہ سے موت کی سزا دی گئی۔ لینن بدستور اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اسی نے بالشویک جماعت بنائی، جس نے ۱۹۱۷ء میں زارِ روس کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کی۔ لینن اس حکومت کا پہلا سربراہ تھا، ۱۹۲۴ء

میں اس نے وفات پائی۔ وہ کمیونزم کا سب بڑا داعی مانا جاتا ہے جس نے کارل مارکس کے فلسفے کو عملی جامہ پہنایا۔ روس میں موجودہ بالشویک حکومت کی بنیادیں لینن ہی نے استوار کی تھیں۔ یہ نظم اور بعد کی دو نظمیں مضمون کی مناسبت کے اعتبار سے ایک سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔

انفس: نفس کی جمع، مراد ہے عالم ارواح سے۔ **آفاق**: افق کی جمع مراد ہے عالم اجسام سے۔ **آیات**: آیت کی جمع، نشانیاں۔ **متغیّر**: بدلنے والے۔ **نظریات**: نظریہ کی جمع۔ **کواکب**: کوکب کی جمع، ستارے، بینائے کواکب سے مراد ہے ستاروں کے علم کا ماہر یعنی نجومی یا عالم ہیئت۔

دانائے نباتات: علم نباتات کا ماہر۔ **اعصار**: عصر کی جمع، زمانے۔ **نگارندہ**: لکھنے والا۔ **آنات**: آن کی جمع، اوقات۔ **متلاطم**: لہریں لینے والے۔ **سماوات**: سما کی جمع، آسمان۔ **فلزات**: دھاتیں۔ **ظلمات**: ظلمت کی جمع، اندھیرے۔ **مرگ مفاجات**: ناگہانی موت۔ **مدنیّت**: تمدن، بود و ماند۔ **شاطر**: لفظی معنی شطرنج کھیلنے والا، مراد ہے نہایت چالاک۔ **تزلزل**: زلزلہ **پیرانِ خرابات**: مے خانے کے منتظم۔ **مکافات**: بدلہ۔

(۱) اے خدا! تیری نشانیاں عالم ارواح اور عالم اجسام دونوں جگہ روشن ہیں۔ سچ یہ ہے کہ تیری ذات ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والی ہے۔

(۲) میں زندگی میں کیوں کر سمجھتا کہ تو موجود ہے یا نہیں؟ میری مصیبت یہ تھی کہ عقل نے جو نظریے قائم کیے تھے، وہ ہر لحظہ بدلتے رہتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی نظریہ اپنی جگہ قائم رہتا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ وہ سچا ہے گویا

اگر مجھے تیری ہستی کا یقین نہ آیا اور میں تجھ پر ایمان نہ لا سکا تو اس کی وجہ فلسفیوں کے وہ نظریے ہیں جن کے بدلتے رہنے سے میں بدظن ہو گیا۔

(۳) میں گواہی دیتا ہوں کہ دنیا میں کوئی شخص عالم ہیئت ہو یا عالم نباتات، اسے فطرت کے ازلی گیت سے کوئی واقفیت نہیں، یعنی یہ لوگ ستاروں کو دیکھ کر ان کے متعلق عجیب و غریب داستانیں بناتے ہیں اور دنیا کے معاملات پر حکم لگاتے ہیں۔ نباتات کے ماہر ہر روز نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں، لیکن فطرت کی صدا سے یہ واقف نہ ہو سکے۔ لہٰذا تیری ذات کے عرفان سے محروم رہے۔

(۴) میں جس عالم آخرت کو پادریوں کی افسانہ سازیاں سمجھتا تھا، آج آنکھ سے دیکھا تو ثابت ہو گیا کہ یہ تو ایک حقیقت تھی۔

(۵) ہم لوگ رات دن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بے بس بندے، تو اے باری تعالیٰ! زمانوں کا خالق اور ایک ایک لمحے کی باتیں محفوظ رکھنے والا ہے۔

(۶) اگر مجھے اجازت ہو تو ایک بات پوچھ لوں، جسے دنیا کے فلسفی حل نہ کر سکے، اگرچہ انہوں نے اس حل کے سلسلے میں کتابوں کے انبار لگا دیئے۔

(۷) میں جب تک آسمان کے خیمے کے نیچے یعنی روئے زمیں پر زندہ رہا، یہ بات میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔

(۸) جب روح میں خیالات لہریں لینے لگیں اور ایک طوفانی کیفیت پیدا ہو جائے تو انسان کو بات چیت کے سلیقے پر قابو نہیں رہتا۔

(۹) میں جو بات پوچھنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ وہ آدمی کون سا ہے جس کا تو معبود ہے؟ وہ خاکی جسم والا آدمی جو آسمانوں کے نیچے آباد ہے؟

(۱۰) اس آدمی کی کیا حالت ہے؟ جو لوگ مشرق میں بستے ہیں، ان کے خداوند یورپ کے سفید فام باشندے بنے ہوئے ہیں، اس لئے اہل یورپ نے پورے مشرق پر قبضہ جما رکھا ہے اور خود یورپ والوں نے چمکنے والی دھاتوں کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ وہ رات دن انہیں کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ پھر اے باری تعالیٰ تجھے پوچھنے والا کون ہوا؟

(۱۱) یورپ میں اگرچہ علم و ہنر کی روشنی بہت زیادہ ہے، لیکن حق یہ ہے کہ اس اندھیرے میں کوئی چشمۂ حیواں موجود نہیں، جس سے انسان حقیقی زندگی حاصل کر سکے۔

چشمۂ حیوان اور ظلمات کا تعلق اس عام ادبی روایات سے ظاہر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مفروضہ چشمہ ہے جس کا پانی پی لیا جائے تو انسان کو دائمی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے سخت اندھیرے میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مشہور ہے کہ سکندر حضرت خضرؑ کو رہنما بنا کر اس چشمہ کی تلاش میں نکلا تھا۔ حضرت خضرؑ نے اس کا پانی پی لیا، سکندر اس سے محروم رہا، حالانکہ یہ محض ادبی افسانہ ہے۔

(۱۲) عمارت کی شان و شوکت، رونق اور صفائی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یورپ کے گرجوں سے وہاں کے بنکوں کی عمارتیں بہت بڑھی چڑھی ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہل یورپ کو اپنی دولت

اور سودی اور تجارتی کاروبار سے جو دلچسپی ہے، وہ مذہب سے نہیں۔

(۱۳) بظاہر یہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کا نام تجارت رکھ چھوڑا ہے حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ جوا ہے، اس لئے کہ یورپ کی تجارت اکثر و بیشتر سٹے پر موقوف ہے۔ سٹے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی بے اندازہ فائدہ اٹھا لیتا ہے اور اس کے فائدے کے لئے لاکھوں کے گھربار تباہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی وہی کیفیت ہوتی ہے، جیسے کسی کو ناگہانی موت آجائے۔

(۱۴) یہ اہل یورپ دکھاوے کے لئے دنیا کو مساوات کی تعلیم دیتے ہیں، اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ سب کو برابر سمجھتے ہیں۔ ان میں ذات پات اور اونچ نیچ کی کوئی قید نہیں، لیکن ان کا عمل دیکھا جائے تو ظلم، حکمت، تدبر اور حکومت کے ذریعہ سے محکوموں کا خون چوستے ہیں۔

(۱۵) جہاں جہاں اہل یورپ کا تمدن پہنچا، وہاں کیا حالت پیدا ہوئی؟ بیکاری بڑھ گئی، لوگوں کے لئے تن پوشی کا سامان نہ رہا، شراب نوشی عام ہو گئی، مفلسی ترقی کر گئی۔ اس کے سوا اہل یورپ نے خلق خدا کی کیا خدمت انجام دی ہے؟

(۱۶) جو قوم آسمانی فیض سے محروم ہو جس کے پیش نظر کوئی الہامی کتاب نہ ہو اور وہ خدا کے بھیجے ہوئے کسی سچے پیغمبر کی تعلیم پر عمل پیرا نہ ہو، اس کے کمالات بجلی اور بھاپ سے اوپر کیوں کر جا سکتے ہیں؟

مراد یہ ہے کہ یورپ نے جو کمالات حاصل کئے، وہ صرف بجلی اور بھاپ تک محدود ہیں۔ اگر یہ قوم کسی الہامی تعلیم کی معتقد ہوتی تو آسمان

تک جا پہنچی۔

(۱۷) مشینیں ہر جگہ لگ گئی ہیں۔ انہیں کے ذریعہ سے صنعت و حرفت کا کام ہوتا ہے۔ یہی بے حس فولادی چیزیں اہل یورپ کی ترقی کا وسیلہ ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی ہمدردی کے لئے بڑھنے اور پھلنے کا کوئی موقع نہ رہا۔ مروت اور احسان کے احساسات کچلے گئے اور دل مردہ ہو گئے۔

سچ ہے کہ انسان جس ماحول میں رات دن رہے، اسی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ جب انسان کے بڑے بڑے گروہ مل جل کر کام کرتے تھے، تو ان میں ایک دوسرے سے ربط و تعلق کی بنا پر ہمدردی کے جذبات ابھرتے تھے، وہ ایک دوسرے کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جب مشینوں کا زمانہ آ گیا تو کارکنوں کے دل بھی لوہے کی طرح سخت ہو گئے۔ ان میں تو تھوڑی بہت ہمدردی ممکن ہے باقی ہو، لیکن کارخانہ دار اس سے بالکل عاری ہو گئے۔ ان کا نصب العین یہ بن گیا کہ جتنا روپیہ ہو سکے، کمائیں اور مزدوروں یا کارکنوں کی امداد یا ان کی محنت و مشقت کا کوئی خیال نہ کریں۔ اقبالؔ کے نزدیک یہ بے حسی نتیجہ ہے مشینوں اور فولادی اوزاروں سے کام لینے کا۔

(۱۸) اب آ کر ایسے آثار نمایاں ہوئے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقدیر نے تدبیر کو مات دے دی۔

مطلب یہ کہ سرمایہ داروں اور سرمایہ پرستوں نے اپنی تدبیروں سے دولت جمع کرنے کا عجیب نظام تیار کر لیا ہے۔ مزدور اور کارکن مصیبتوں میں

مبتلا تھے۔ سرمایہ دار بے فکر ہو کر مزے اڑاتے تھے۔ آہستہ آہستہ مزدوروں میں بھی اپنے حقوق کے لئے جد وجہد کا احساس پیدا ہوا۔ وہ بھی یونین بنا کر سرمایہ داروں کے خلاف ہنگامے بپا کرنے لگے۔ یہ حقیقت میں قدرت کی طرف سے تنبیہ کا تازیانہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خود غرض انسانوں کی تدبیریں خدائی قانون کی زد سے زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتیں اور صاف نظر آ رہا ہے کہ تقدیر کے سامنے تدبیر شکست کھا رہی ہے۔

(۱۹) مے خانے کی بنیاد ہل گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے منتظم رات دن فکر میں سرگرداں ہیں کہ اس مصیبت کو کیوں کر ٹالیں۔

مطلب یہ کہ یورپ میں سرمایہ داری کا جو نظام تیار ہوا تھا، وہ کچھ دیر تو بڑی کامیابی سے چلا، لیکن اب اس میں برہمی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور اس نظام کو چلانے والے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔

(۲۰) اہل یورپ شام کے وقت سیر و تفریح کے لئے نکلتے ہیں تو بلاشبہ ان کے چہروں پر سرخی نظر آتی ہے، لیکن یہ سرخی اس بات کی علامت نہیں کہ ان کے جسموں میں زندگی کا صالح خون دوڑ رہا ہے۔ یہ یا تو پوڈر کی سرخی ہوتی ہے یا اسے پیالے اور صراحی کی کرامات سمجھنا چاہیئے، یعنی یہ شراب نوشی کا اثر ہے۔ گویا یورپ کے عوام کی صحتیں تباہ ہو گئی ہیں۔ لیکن وہ پوڈر اور شراب کے استعمال سے سرخ رو نظر آتے ہیں۔

(۲۱) اے باری تعالیٰ! تو قادر مطلق ہے۔ عدل تیرا ازل سے دستور ہے، لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دے کہ دنیا میں مزدوروں کی

زندگی بڑی ہی تلخ ہے۔

(۲۲) مجھے بتا کہ سرمایہ پرستی کی کشتی کب ڈوبے گی؟ اے باری تعالیٰ! تیری دنیا بدلے کے دن کا انتظار کر رہی ہے یعنی جب تو نے قاعدہ مقرر کر رکھا ہے کہ برائی کا بدلہ برائی کے سوا کچھ نہ ہوگا: مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ۔ (جو برا کام کرے گا، اس کی سزا پائے) پھر کیا وجہ ہے کہ سرمایہ پرستی کی برائیوں کا بدلہ ابھی تک اسے نہیں ملا اور یہ کب ملے گا؟ دنیا اسی انتظار میں بیٹھی ہے۔

فرشتوں کا گیت

جیسا کہ گزشتہ نظم کی تمہید میں لکھا جا چکا ہے۔ فرشتوں کا گیت اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے اور تیسری کڑی آئندہ نظم ہے جس کا عنوان فرمان خدا ہے یعنی پہلے لینن نے دنیا کی حالت بارگاہ باری تعالیٰ میں پیش کی، پھر فرشتوں نے اپنی دیکھی ہوئی کیفیت گیت کی شکل میں واضح کی۔ اس پر خدا نے فرمان صادر کیا۔

زمام: لگام، باگ، عناں، نکیل۔ پردگی نیام: میان کے اندر چھپی ہوئی۔

(۱) اے خدا! تو نے انسان کو جو عقل عطا کی تھی، وہ ابھی تک بے لگام ہے یعنی ہر شخص تدبیر اور چالاکی سے کام لے کر اپنا مطلب نکالنے کے درپے ہے۔ خلق خدا کی عام بہبود کا خیال رکھنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

یہ عقل کی بے لگامی ہے۔ باقی رہا جذبہ عشق و محبت، اس نے بھی کوئی ٹھکانا پیدا نہیں کیا۔ یعنی وہ بھی۔۔ ایسی صورت اختیار نہیں کرسکا کہ عوام کو نفع حاصل ہو یا ان کی بہتری کے لئے عمل میں آئے۔ کہیں کہیں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے، لیکن یہ جذبہ عام نہیں۔ اے ازل کے نقاش! اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تو نے انسان کی شکل میں عقل و عشق کا جو نقش بنایا تھا، وہ ابھی تک ادھورا ہے، یعنی اپنے اصل مقصد تک نہیں پہنچ سکا۔

(۲) مے خوار اور اوباش ہوں یا عالم اور دین دار، امیر لوگ ہوں یا پیری کی گدیاں آراستہ کرنے والے، جسے دیکھو، خلق خدا کی گھات میں بیٹھا ہے اور انہیں اپنے اغراض کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ گویا تیری دنیا میں صبح و شام کی جو کیفیت پہلے تھی، وہی اب ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(۳) اے باری تعالیٰ! تیری دنیا کے دولت مندوں اور امیروں کو دیکھیں تو وہ عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دولت کے نشے نے انہیں ہر چیز سے بے پروا بنا رکھا ہے تیری دنیا کے مفلسوں پر نظر ڈالیں تو ان کی حالت حد درجہ بری ہے لیکن وہ اسی پر قناعت کئے بیٹھے ہیں۔ غلاموں اور نوکروں کی یہ حالت ہے کہ انہیں آرام کے لئے ٹھکانا نہیں ملتا اور گلی کوچوں میں پھر پھر کر وقت گزارتے ہیں۔ آقاؤں اور امیروں کو دیکھیں تو اپنے اونچے اونچے محلوں میں بے فکر عیش و عشرت کر رہے ہیں۔

(۴) عقل ہو یا دین، علم ہو یا فن، یہ سب ہوس کے پجاری بنے ہوئے ہیں، یعنی عالموں، دین داروں، عقل مندوں اور فن کاروں کے پاس جو

جوہر ہیں وہ سب ذاتی برتری کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ خلق خدا سے محبت اور اس کی بہتری کے لئے تڑپ تمام مشکلات کا حل تھی، بہت محدود ہے اور اس کا فیض ابھی عام نہیں ہوا۔

(۵) زندگی کا جوہر یہی محبت، یہی عشق اور یہی تڑپ ہے۔ خود اس محبت کا جوہر خودی ہے۔ افسوس کہ خودی کی تیز تلوار ابھی تک میان میں چھپی بیٹھی ہے، یعنی نہ خودی بروئے کار آئی، نہ عشق اور نہ زندگی کے جوہر آشکارا ہوئے۔

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

یاد ہوگا کہ لینن نے بارگاہ باری تعالیٰ میں دنیا کی حالت پیش کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ سرمایہ پرستی کی کشتی کب ڈوبے گی؟ فرشتوں نے بھی عرض کیا کہ دنیا کی حالت بڑی خراب ہے۔ اس پر خدا کی بارگاہ سے فرشتوں کو یہ حکم ہوا۔

کاخ: محل۔ کنجشک: چڑیا۔ فرومایہ: بے حقیقت، بے حیثیت، ناچیز۔

(۱) اے فرشتو! اے قدرت کے کارخانے کو چلانے والی قوتو! اٹھو اور میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو اور امیر لوگوں نے جو نیچے اونچے محل بنا رکھے ہیں، ان کے در و دیوار میں زلزلہ پیدا کر دو۔

(۲) یہ جو لوگ محکوم اور دست نگر بیٹھے ہیں، ان میں یقین کی ایسی حرارت پیدا کرو کہ ان کا خون جوش میں آجائے۔ یہ آج چڑیا کی طرح ناچیز اور بے حقیقت نظر آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں دولت مند اور سرمایہ دار اپنے وسیع سروسامان کی بدولت شاہین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا بندوبست کرو کہ چڑیا شاہین سے لڑ جائے۔ مفلس، غریب اور نادار امیروں، سرمایہ پرستوں اور دولت مندوں سے جا بھڑیں۔

(۳) زمانے کا رنگ بدل گیا۔ شہنشاہی اور سرمایہ پرستی کا دور گزر گیا۔ اب عوام کی بادشاہی کا زمانہ آرہا ہے۔ تمام معاملات کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں ہوگی۔ لہٰذا پرانے دور کے جو جو نقش تمہیں نظر آتے ہیں، ان سب کو مٹا ڈالو۔

(۴) جب معاملات کی باگ ڈور عوام کے ہاتھ میں آئے گی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہ کس انداز میں سوچیں گے؟ کس نقطۂ نگاہ ہر چیز کو دیکھیں گے؟ ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہوگا کہ جس کھیت سے کسان کو روزی نہیں ملتی، اس کی ہر بال یا سٹا جلا دینے کے قابل ہے۔

اس سے محض ایک بنیادی حقیقت واضح کرنا مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ لوگوں کو بے آئینی یا تباہ کاری کی تعلیم دی جائے۔ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ہر کاشت کار اور کسان اپنی محنت اور مشقت کے بدلے میں پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کا یقیناً حق دار ہے۔ اگر سرمایہ پرست اور زمیندار یہ بنیادی حق بھی تسلیم نہیں کرتے تو وہ یقیناً صریح ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ عوام کے

دل میں یہ جذبہ پیدا کرتے ہیں کہ ایسی کھتیاں جلا دینے کے قابل ہیں۔ روسی انقلاب جس کی وجہ سے بالشویک برسر حکومت آئی، ایسے ہی حالات کا نتیجہ تھا اور جہاں یہ حالات پیدا ہوں، یقیناً ایسا انقلاب آئے گا جس میں سرمایہ پرست اور زمیندار بری طرح مٹ جائیں گے۔ اقبال نے اس شعر میں یہی حقیقت واضح کی ہے۔

(۵) مذہبی پیشواؤں خصوصاً پادریوں نے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان پردے تان دیئے ہیں۔ وہ اپنے واسطے کے بغیر کسی کو خدا تک پہنچنے نہیں دیتے۔ ان مذہبی پیشواؤں کو کلیساؤں سے اٹھا دیا گیا تو بیچ کے پردے بھی اٹھ جائیں۔ خدا اور بندوں کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہو جائے۔

یہ شعر دراصل مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ اہل کلیسا تمام مذہبی معاملات کے مختار خود بن گئے تھے۔ صدیوں تک دنیا نجات کے لئے انہی کی طرف دیکھتی رہی۔ جب علم پھیلا، عوام کے دماغوں میں روشنی پیدا ہوئی تو نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ نہ کلیسا سے بدظن ہوئے بلکہ مذہب ہی سے بیزار ہو گئے۔ بالکل یہی کیفیت ہندو دھرم کے پنڈتوں اور پروہتوں نے پیدا کی اور ایسی ہی حالت ہماری قوم کے بعض نام نہاد عالموں اور پیروں کی بھی ہے۔

(۶) کعبہ اور بت خانے کی حالت کیا ہے؟ کعبہ میں مذہب کی حقیقت یہ سمجھ لی گئی ہے کہ وقتاً فوقتاً خدا کو سجدہ کر دیا۔ بت خانے والوں کے نزدیک مذہب کا حاصل یہ ہے کہ بتوں کے اردگرد چکر لیے، یعنی انہوں نے صرف

چند نمائشی باتوں کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ اس کی روح وحقیقت کا انہیں کوئی احساس نہیں۔ ایسا مذہب کس کام کا؟ بہتر یہی ہے کہ اس کا چراغ بجھا دیا جائے تاکہ لوگ مذہب کی روح وحقیقت پہچان سکیں۔

(۷) کعبہ میں سنگ مرمر کی سلیں لگا دینے سے کیا حاصل؟ عالی شان مسجدیں، گرجے اور مندر تعمیر کر دینے سے کیا فائدہ؟ اصل مقصود تو یہ ہے کہ مذہبی جذبے کے ماتحت خلق خدا کی خدمت بہتر سے بہتر طریق پر انجام پائے۔ مجھے یہ سنگ مرمر کی عالی شان عمارتیں درکار نہیں بلکہ میں ان سے ناراض اور بیزار ہو چکا ہوں۔ مجھے تو ایک ایسا کعبہ چاہیئے، جو عوام میں سچا دینی جذبہ پیدا کر دے، اگرچہ وہ کعبہ مٹی ہی کا بنا ہوا ہو۔

مراد یہ ہے کہ مذہب کی روح اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے۔ عبادت کے لئے عالی شان عمارتیں بنا لینا اس صورت میں بالکل بے سود ہے، جب دل صحیح مذہبی جذبے سے خالی ہوں۔ دیکھو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کعبہ کی عمارت بالکل معمولی حیثیت کی تھی اور مسجد نبوی کا یہ حال تھا کہ پتھروں اور مٹی کی معمولی دیواریں تھیں اور کھجور کے پتوں کی چھت۔ کھجور کے تنے جابجا ستونوں کا کام دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے تک مسجد اسی حالت میں رہی۔ بنو امیہ کے زمانے میں کعبہ اور مسجد نبویؐ کی عالی شان عمارتیں بنیں۔ پھر تکلفات بڑھتے گئے اور مذہبی روح گھٹتے گھٹتے آخری حد پر پہنچ گئی۔ مقصود حقیقی معنویت ہے نہ کہ ظاہر داری۔

(۸) یہ جو نئی تہذیب ہے، یہ شیشہ بنانے والوں کی کارگاہ ہے، یعنی ہلکی

سی ضرب بھی پڑے گی تو چور چور ہو جائے گی۔ اسے تباہ کر دینا ہی ضروری ہے۔ اور تباہ کر دینے کی کیا صورت ہے؟ یہ کہ مشرق کے شاعر کو دیوانگی کے طریقے سکھا دو۔ یعنی وہ ایسا پیغام دے جو لوگوں میں جنون کی ایک خاص کیفیت پیدا کر دے اور وہ اس کارگاہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالیں۔ اس لئے کہ جب تک یہ تہذیب نہ مٹے گی، اس وقت تک وہ مصیبتیں دور نہ ہوں گی، جو اس تہذیب کے باطل اقتصادی نظام نے عوام کے لئے پیدا کیں۔

رباعی

جو انسان حکمت اور فلسفہ کی باریکیوں میں الجھا رہتا ہے، سمجھنا چاہئے کہ اس کی خودی اسلام کی حلقہ بگوش نہیں بنی اور کافر کی کافر ہی رہی اس لئے کہ وہ کتنے ہی حقائق بیان کرے، لیکن اس کے اندر یقین و ایمان پیدا نہیں ہو سکتا اور یقین و ایمان کے بغیر خودی مسلمان نہیں ہوتی۔ کلیمی یعنی موسوی شان خودی کا ایک چھپا ہوا بھید ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ کی طرح جابروں کا مقابلہ کر کے مظلوموں کو نجات دلانا خودی ہی کی کارفرمائی کا ایک کرشمہ ہے۔

میں تجھے فقیری اور بادشاہی کا گر بتا دوں؟ گر یہ ہے کہ انسان غریبی کی حالت میں اپنی خودی کو ہرگز ہند سے بچائے رکھے۔ جو شخص یہ کارنامہ انجام دے گا، اس کا رتبہ فقیری میں بھی شہنشاہوں جیسا ہو گا۔

ذوق و شوق

جیسا کہ اقبال نے خود لکھا، اس نظم کے اکثر شعر فلسطین میں کہے گئے تھے۔ جہاں وہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں عالمی مسلم کانگریس کی شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ کم و بیش آٹھ دن بیت المقدس میں رہے۔ کانگریس کے جلسوں میں شرکت کی۔ فلسطین کے بعض مقدس اور مشہور مقامات بھی دیکھے، جیسے بیت اللحم، الخلیل (حبرون)، یافا اور سینا موسیٰؑ۔ خود بیت المقدس میں حرم کے علاوہ بعض دوسرے تاریخی مقامات بھی دیکھے۔ کانگریس میں شریک ہونے والے تمام اصحاب کے لئے امیر عبداللہ مرحوم والی شرق اردن نے اپنی سلطنت کے حدود میں دعوت کا انتظام کیا تھا، اس دعوت میں اقبال بھی شریک ہوئے تھے، لیکن یہ دعوت فلسطین اور شرق اردن کی سرحد پر ہوئی تھی، اس لئے شرق اردن کے مشہور مقامات نہ دیکھے جا سکے۔

نظم کے ابتدائی بند میں قصیدہ بُردہ کے پہلے دو شعروں کی تلمیحات بھی موجود ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ نظم دراصل حضرت رسول اکرم صلعم کے عشق میں لکھی گئی ہے۔ ابتدا میں سعدیؒ کا یہ مشہور شعر نقل کیا ہے۔

در نغ آمدم زاں ہمہ بوستاں | تہی دست رفتن سوئے دوستاں

ابتدائی بند کے بعض شعروں میں عربی شاعری کا رنگ پیدا کیا گیا ہے۔

پہلا بند | اِضَم: حجاز کا ایک پہاڑ جو مدینہ منورہ سے شمال کی جانب تقریباً ایک منزل پر واقع ہے۔ قصیدہ بردہ کے دوسرے شعر میں اس کا ذکر آیا ہے یعنی:

امِ ھبّتِ الرِّیحُ من تلقاءِ کاظمۃ
واومضَ البرقُ فی الظلماءِ من اِضَم

(یا کاظمہ کی جانب سے ہوا چلی اور کوہِ اِضم کی چوٹیوں سے رات کی تاریکی میں بجلی چمکی)

طیلسان: چادر۔ **کاظمہ**: یہ "کظم" سے ہے جس کے معنی ہیں غصّہ کا ٹھنڈا ہونا۔ کاظمہ کے معنی ہوئے غصّہ کو ٹھنڈا کرنے والی۔ یہ مدینہ منورہ کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ہے۔ **پرنیاں**: ریشم۔ **طناب**: رسی۔

(۱) بیابان میں صبح کا سماں دل اور نظر کو زندگی بخشتا ہے۔ سورج کے چشمے سے نور کی ندیاں نکل کر بہنے لگتی ہیں۔

(۲) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ ازل پھر ایک مرتبہ بے نقاب ہو گیا، گویا وہی کیفیت سامنے آگئی جو اس کائنات کی تخلیق کے وقت رونما ہوئی تھی اور وجود کا پردہ چاک ہو گیا۔ اس نظارے کے لئے ایک نگاہ کا نقصان ضرور برداشت کر لینا چاہیے۔ اس لئے کہ دل کو اس سے ہزاروں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ ایسا منظر ایک نظر دیکھ لینے ہی سے دل کو وہ دولت مل جاتی ہے جو اسے خوابِ غفلت سے جگا کر نئی زندگی سے روشناس کر دیتی ہے۔

(۳) رات کا بادل خود رخصت ہو گیا اور اپنے پیچھے لال اور نیلی بدلیاں چھوڑ گیا۔ ان بدلیوں نے اِضم پہاڑ کو رنگا رنگ چادر پہنا دی۔

اس شعر سے واضح ہے کہ شاعر مدینہ منورہ کے گرد و نواح کا منظر پیش کر رہا ہے۔

(۴) بارش ہو چکی تھی جس کی بدولت ہوا گرد و غبار سے پاک ہو گئی۔ کھجور کی شاخیں دُھل کر نکھر گئیں۔ مدینۂ منوّرہ کے آس پاس کی ریت ریشم کی طرح نرم ہو گئی۔

(۵) مسافر چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچا، جہاں ایک طرف راکھ تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ یہاں قافلے والوں نے کھانا پکانے کی آگ جلائی۔ وہ رخصت ہو گئے تو آگ بجھ گئی۔ دوسری طرف کچھ ٹوٹی ہوئی رسّیاں دکھائی دیں، یہ اس امر کی علامت تھی کہ یہاں اس سے پہلے بھی قافلے ٹھہر چکے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو محبت والوں کی عام گزرگاہ ہے۔ خدا جانے، اہلِ عشق کے کتنے قافلے یہاں سے گزر چکے!

(۶) عین اس موقع پر جبریلؑ کی آواز آئی کہ اے عاشق! تیرا اصل مقام یہی ہے اور اسی جگہ جدائی کے ستائے ہوؤں کو دائمی راحت حاصل ہوتی ہے۔

دوسرا بند | **غزنوی**: اشارہ ہے سلطان محمود غزنوی کی طرف۔ **سومنات**: کاٹھیاواڑ کا وہ مشہور بت خانہ جس کی تسخیر کے لئے غزنوی نے بہت بڑے صحرائی علاقہ کا سفر کیا اور جو اس کے تمام کارناموں میں سب سے زیادہ عظیم الشان مانا جاتا ہے۔ **دجلہ و فرات**: عراق کے مشہور دریا۔ کربلا کی جنگ دریائے فرات ہی کے کنارے ہوئی تھی۔

(۱) میں کس سے کہوں کہ زندگی کی شراب میرے لئے زہر کی حیثیت رکھتی ہے، یعنی میں زندگی سے بیزار ہوں، اس لئے کہ کائنات کی محفل پرانی ہو چکی اور یہ پرانے ہی طور طریقوں پر قائم ہے۔ میرے دل میں جو احساسات اور نظریات پیدا ہوتے ہیں، وہ بالکل نئے رنگ کے ہیں۔ بزمِ کائنات کو مجھ سے کوئی مناسبت

نہیں اور مجھے اس سے کوئی مناسبت نہیں۔ لہٰذا زندگی سے بیزاری کیوں پیدا نہ ہو؟

(۲) کعبے والے بھی اپنی اصلیت کو بھول گئے۔ انہوں نے بھی کعبہ کی جگہ سومنات بنا لئے۔ انہیں توڑنے کے لئے غزنوی جیسے شخص کی ضرورت ہے۔ کیا زندگی کی کارگاہ میں کوئی غزنوی موجود نہیں، جس کے لئے کعبہ والوں کے سومنات مدّت سے انتظار کر رہے ہیں؟

(۳) ذکرِ عرب کا سوز اور فکرِ عجم کا ساز بے شک موجود ہے، لیکن پہلے میں عربی مشاہدات نظر نہیں آتے اور دوسرے میں عجمی تخیلات بالکل ناپید ہیں۔

مراد یہ ہے کہ عرب حقیقت پسند قوم تھے۔ انہیں حقائق سے زیادہ دل بستگی تھی۔ اب وہ حقایق کہیں نظر نہیں آتے۔ عجمیوں کا کمال یہ تھا کہ ان کی فکر نہایت بلند تھی، لیکن آج وہ دولت بھی ان سے کنارہ کر گئی اور عرب و عجم دونوں ان وصفوں سے خالی ہو گئے جن کی بدولت انہوں نے عالمگیر شہرت حاصل کی تھی۔

(۴) حجاز کے قافلے کو دیکھو، اس میں ایک بھی حسینؓ نظر نہیں آتا، جو استبداد اور مطلق العنانی کے خلاف بے باکانہ کھڑا ہو جائے، اپنا سر کٹا دے، لیکن راہِ حق سے ادھر ادھر نہ ہو۔ دوسری طرف دیکھو کہ دجلہ اور فرات کے گیسوؤں میں ابھی تک پیچ و خم باقی ہیں۔

دجلہ و فرات کا ذکر اس لئے کیا کہ حضرت امام حسینؓ کی جنگ فرات کے کنارے ہوئی تھی۔ اقبالؔ کی مراد یہ ہے کہ استبداد اور مطلق العنانی کی شان شوکت اور رعنائی میں ابھی کچھ فرق نہیں آیا۔ اس شان و شوکت اور رعنائی کو توڑنے کے لئے امام حسینؓ جیسے مجاہدِ حق کی ضرورت ہے۔

جو اپنے عہد میں قافلۂ حجاز (قافلۂ اسلام) کا سالار تھا۔ آہ کہ اب اس قافلے میں ویسی شخصیت ایک بھی نظر نہیں آتی۔

(۵) حضرت امام حسین رضؓ نے جو کارنامہ انجام دیا، وہ عشقِ حق کا ایک کرشمہ تھا۔ عشقِ حق ہی عقل، دل اور نگاہ کے لئے سب سے پہلا ہادی ہے یعنی اسی عشق کی بدولت عقل، دل اور نگاہ کو صحیح راستہ ملتا ہے۔ عشقِ حق نہ ہو، تو شریعت اور دین کی حیثیت اس کے سوا کیا رہ جاتی ہے کہ انسان اپنے تخیّل اور تصوّر کی بنا پر مختلف صورتوں کا بت خانہ تیار کر لے۔

مراد یہ ہے کہ شریعت اور دین میں برتری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے قلب میں عشقِ حق موج زن ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر دنیا کے عام قوانین کی طرح شرع اور دین بھی قانون کا ایک مجموعہ رہ جاتے ہیں، مجبوری ہوئی تو ان پر عمل کر لیا ورنہ انہیں نظر انداز کر دیا۔ یہی حیثیت اپنے عام تصوّرات کی ہوتی ہے۔

(۶) یہی عشقِ حق تھا جس کی برکت سے حضرت ابراہیم خلیل ؑ نے صدق اور راست بازی کا اونچا مرتبہ حاصل کیا۔ جابر بادشاہ اور سنگ دل قوم کی مخالفت سے بے پروا ہو کر توحید کا نعرہ لگایا۔ یہی عشقِ حق تھا جس کی برکت سے وہ اپنے وطن، قوم اور عزیزوں کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ یہی عشقِ حق تھا جس کے زیرِ اثر اپنے اکلوتے بیٹے کو راہِ خدا میں قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔ حضرت امام حسین رضؓ کو کربلا کے میدان میں صبر کا جو بلند مقام نصیب ہوا، وہ بھی عشقِ حق ہی کا ایک کرشمہ تھا۔ ان کے فرزند، بھائی، بھتیجے اور دوسرے عزیز راہِ حق میں کٹے لیکن اس بلند منزلت امام نے انتہائی صبر سے یہ مصیبتیں برداشت

کرلیں۔ زندگی کے معرکے میں بھی بدر و حنین کی جنگیں اسی طرح پیش آتی ہیں، جس طرح رسول اللہ صلعم کو پیش آئی تھیں۔ انہیں جنگوں نے حق اور باطل کو الگ الگ کیا، حق کامیاب ہوا۔ باطل مٹ گیا۔ بدر و حنین کی ان جنگوں میں بھی عشق حق ہی کی بدولت سرخ روئی حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا بند | معنی دیریاب: وہ مطلب جو مشکل سے سمجھ میں آئے۔

قافلہائے رنگ و بو: لفظی معنی رنگ و بو کے قافلے۔ رنگ سے اشارہ بظاہر ان لوگوں کی طرف ہے جو دنیوی شان و شکوہ پر مائل ہوں اور بو سے اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے، جن کا ذوق روحانی ہوتا ہے یعنی مردانِ حق۔

جلوتیانِ مدرسہ: ظاہری ذکر و فکر اور سرحانیات میں لگن رہنے والے۔

گزشتہ بند کا آخری شعر عشق حق کے ذکر پر ختم ہوا تھا۔ اب عشق کی جانب خطاب ہے، لیکن یہ خطاب عشق کے بجائے محبوب کی طرف ہو گیا ہے۔

(۱) اگر کائنات کو ایک آیت سمجھ لیا جائے تو اے عشق محبوب! اس کا مشکل سے سمجھ میں آنے والا مطلب تو ہے۔ ارباب ظاہر اور ارباب باطن کے قافلوں کو تیری ہی تلاش ہے۔ یعنی تیرے بغیر کوئی بھی اپنے مقصد و مدعا کو نہیں پہنچ سکتا۔

(۲) یہاں حالت کیا ہے؟ جو لوگ علم پڑھنے پڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہیں حقیقت کی پہچان سے محروم ہیں اور ان کے دلوں کا ذوق مردہ ہو چکا ہے۔ جو لوگ مے خانہ محبت میں بیٹھے ہیں، انہیں شراب محبت کی

طلب باقی نہیں رہی اور ان کے ظرف اس شراب سے خالی ہیں۔

مراد یہ ہے کہ ارباب ظاہر اور ارباب باطن دونوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

(۳) میری زبان پر جو شعر جاری ہوتے ہیں، وہ اس حرارت عشق کا پتا دیتے ہیں، جو مدت ہوئی، افسردہ ہو چکی ہے۔ میری زندگی کی سرگزشت کیا ہے؟ صرف یہ کہ اس کا ایک ایک لمحہ کھوئے ہوؤں کی تلاش میں گزرا ہے یعنی میری کوشش یہ رہی ہے کہ پھر وہی حرارت عشق پیدا ہو جائے، جس سے ہمارے اسلاف کرام نے بلند رتبے حاصل کیے۔

(۴) باد صبا کی لہر سے گھاس پھوس نشوونما پاتے ہیں۔ میری سانس کی لہریں دلوں میں آرزوؤں کی پرورش کرتی ہیں، یعنی میں یہ پیغام دیتا ہوں کہ دل پھر ایمان و یقین کی دولت حاصل کریں۔ پھر ان میں پہلے کے سے ولولے پیدا ہوں اور پرانا دور دنیا میں تازہ ہو جائے۔

(۵) میرے نغمے دل و جگر کے خون سے پلتے ہیں۔ میں نے اپنے ساز کی رگوں میں اپنا لہو دوڑا دیا ہے، یعنی میری شاعری محض تخیل نہیں، بلکہ میرے دل کی تڑپ کا اظہار ہے۔

(۶) اے عشق محبوب! میرے بے قرار دل کو کشمکش کی مہلت نہ دے اپنی پرپیچ زلف میں ایک دو شکنیں بڑھا دے۔

مطلب یہ کہ عشق و محبت کی آگ اور تیز کر دے۔ زلف میں شکنیں بڑھ جائیں، تو دل اس طرح ان میں الجھ جائے گا کہ پھر اسے کھینچ تان کا موقع نہ رہے گا۔

چوتھا بند | **لوح و قلم**: لوح کے لفظی معنی تختی، اسے لوح محفوظ بھی کہتے ہیں۔ قلم جس سے لکھا جاتا ہے۔ لوح و قلم علم الٰہی کے بیان کی ایک مثالی صورت ہے اور اس سے مراد علم الٰہی ہے جو پوری کائنات پر حاوی ہے۔ **الکتاب**: قرآن مجید۔ **آبگینہ رنگ**: شیشے جیسا۔ **محیط**: لفظی معنی احاطہ کرنے والا، نیز سمندر۔ **سنجر**: سلجوقی خاندان کے ایک مشہور بادشاہ کا نام۔ **سلیم**: عثمانی خاندان کا مشہور تاجدار جس نے مصر کو فتح کیا اور جس کے عہد میں عثمانی ترکوں کو خلافت کا منصب نیز حرمین شریفین کی خدمت ملی۔ **جنیدؒ**: مشہور ولی اللہ حضرت جنید بغدادی۔ **بایزیدؒ**: مشہور ولی اللہ حضرت بایزید بسطامی۔ **غیاب**: غایب ہونا۔

اب براہ راست محبوب سے خطاب ہے اور محبوب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

(۱) اے حضرت رسول اکرم (صلعم)! آپ ہی لوح ہیں، آپ ہی قلم ہیں۔ علم الٰہی صرف آپ کے ذریعہ سے سب پر آشکارا ہوا۔ آپ ہی کا وجود مبارک قرآن مجید ہے۔ اس لئے کہ آپ ہی خدا کے حکموں کو انسانوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ یہ شیشہ جیسا گنبد جسے ہم لوگ آسمان کہتے ہیں، آپ کے سمندر میں ایک بلبلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

واضح رہے کہ حضور انور (صلعم) کو الکتاب کہنا بالکل مناسب ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ سے حضورؐ کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: **کان خلقہ القرآن**۔ آپ کے اخلاق عالیہ قرآن کی جیتی جاگتی تصویر تھے،

قرآن میں جو کچھ نازل ہوا، اس کا مکمل عملی نمونہ حضورؐ ہی کی ذات بابرکات تھی

(۲) اس دنیا کو آپ ہی کے ظہور سے آب و تاب اور رونق حاصل ہوئی۔ آپ نے ریت کے ذرّے کو سورج کی چمک عطا فرمادی۔

مراد یہ ہے کہ اس دنیا کی تمام اچھائیاں اور تمام خوبیاں حضورؐ ہی کے ظہور ہی کی برکت ہیں۔ انسان خدائی احکام کی پابندی ہی کے باعث مخلوقات میں سب سے اونچا رتبہ پاتا ہے اور اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ یہ احکام اور ان پر عمل کا مکمل نقشہ حضورؐ ہی نے اس دنیا پر آشکار کیا۔

(۳) سنجر اور سلیم جیسے شہنشاہوں کی شوکت آپؐ کے جلال کا ایک کرشمہ تھی جنیدؒ اور بایزیدؒ جیسے سچے خدا پرست درویشوں کا وجود حضورؐ کی جمالی شان کی جھلک پیش کرتا ہے یعنی انہیں دیکھ کر فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ آپ کی جمالی شان بے نقاب ہو گئی۔

(۴) اگر آپؐ کا عشق میری نماز کا امام نہ ہو یعنی اسے خدائے پاک کی بارگاہ میں عبادت کا نصب العین نہ بناؤں تو نماز کے لئے میرا کھڑا ہونا بھی جلوۂ ذات سے محرومی کا باعث ہو اور میرے سجدے کی بھی یہی کیفیت ہو۔

مطلب یہ کہ عشق رسولؐ ہی درحقیقت عبادت میں وہ شان پیدا کرتا ہے جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے؛ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمہیں پیار کرنے لگے گا) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایمان کی لذت نہیں پا سکتا، جب تک میں اس کے

نزدیک ماں باپ، بیٹے اور دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔

(۵) آپ کی نگاہِ لطف سے عقل بھی مراد پا گئی، جسے حضوری کا درجہ حاصل نہیں ہوتا لیکن وہ تلاش میں لگی رہتی ہے۔ عشق بھی مراد پا گیا، جو حضوری کا خواہش مند رہتا ہے اور بے قراری اس کا شیوہ ہے۔

مراد یہ ہے کہ عقل اور عشق دونوں اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق آپ سے فیض یاب ہوئے۔ جن ہستیوں میں عقل کا جوہر نمایاں تھا، وہ اپنی اہلیت کے مطابق مراد مند ہوئیں۔ جن میں جوہر عشق کا غلبہ تھا، وہ اپنی استعداد کے موافق کامیابی کے درجے پر پہنچیں۔

اس شعر میں عقل و عشق سے بظاہر اشارہ علمائے کرام اور اولیا اللہ کی طرف ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں طبقے حضور انورؐ کی ذات بابرکات سے وابستگی کے ایسے نمونے پیش کر چکے ہیں، جن کی نظیر کوئی دوسری امت پیش نہیں کر سکتی۔

(۶) اگرچہ سورج کی گردش جاری ہے لیکن دنیا تاریک دکھائی دیتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ سورج کی روشنی تو ہو رہی ہے لیکن وہ صرف جسموں کو منور کر سکتی ہے۔ ضرورت اس نورانی سورج کی ہے جو دلوں کی تاریکی اور سینہ کے اندھیرے کو دور کرے۔ یہ کام صرف آپ کی بے پردہ جلوہ گری سے انجام پا سکتا ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ زمانے کی فطرت کو اپنی تجلی سے فیض بخشیں اور تازگی عطا فرمائیں تاکہ دلوں کے اندھیرے دور ہو جائیں۔

پانچواں بند | نخیل بے رطب: کھجور کا درخت جو پھل نہ دے۔

(۱) اے حضور انور (صلعم)! میرے گزرے ہوئے رات دن آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ میں علم حاصل کرنے میں لگا رہا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایسا درخت ہے جو پھل نہیں دیتا۔ یعنی میری زندگی جس مشغلے میں گزر گئی روحانی نقطۂ نگاہ سے وہ بالکل بے سود ثابت ہوا۔

(۲) علم حاصل کرنے کے بعد میرے ضمیر میں حق و باطل کے درمیان وہی کھینچ تان شروع ہو گئی جو پرانے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ ایک طرف سچا عشق تھا جس کا پیغام یہ تھا کہ اپنے آپ کو حضرت محمد مصطفٰے (صلعم) کے رنگ میں رنگ لو۔ دوسری طرف وہ عقل تھی، جس نے خدائی احکام سے کوئی فیض حاصل نہ کیا تھا، وہ مجھے ابولہب بنا دینا چاہتی تھی، لیکن اس معرکے میں عشق کامیاب ہوا، عقل ہار گئی۔ اے حضورؐ! آپ کے لطف و کرم کی برکت سے میں مراد کو پہنچ گیا۔

(۳) عشق کی ابتدا اور انتہا دونوں عجیب ہیں۔ یہ کبھی عجیب و غریب تدبیروں سے کام لے کر انسان کو منزل مراد پر پہنچاتا ہے اور کبھی زور و قوت سے کھینچ کر لے جاتا ہے۔ مجھ سے آخری معاملہ پیش آیا، اس لئے کہ میں تو اپنی زندگی اس شغل میں گزار چکا تھا جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن عشق نے بزور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور عقل کے پھندے سے نجات دلا دی۔

(۴) عشق کی دنیا میں جدائی کو وصل پر فوقیت حاصل ہے۔ وصل میں آرزو پوری ہو جاتی ہے اور جو آرزو پوری ہو جائے، وہ باقی نہیں رہتی، لیکن جدائی میں طلب کی لذت حاصل رہتی ہے اور عاشق کے لئے محبوب کی طلب سے بڑھ کر

زندگی کی کوئی لذت نہیں۔

(۵) جب مجھے محبوب سے وصل کا شرف حاصل ہوا تو نظر اٹھا کر اسے دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اگرچہ میری گستاخ نگاہ شوقِ دیدار میں مختلف بہانے ڈھونڈتی رہی۔

(۶) آرزو کی گرمی جدائی ہی کی بدولت قائم رہتی ہے اور جدائی ہی نالہ و فریاد کا باعث ہوتی ہے۔ دیکھو موج ہر وقت بے قرار رہتی ہے، جدائی ہی کو ڈھونڈتی ہے اور قطرے کی آبرو بھی جدائی کے سوا کچھ نہیں۔

موج اس لئے سطح سے بار بار اٹھتی ہے کہ سمندر یا دریا سے جدا ہو جائے گویا وہ جدائی کے لئے بے قرار ہوتی ہے۔ قطرے کی ہستی ہی اس وقت تک ہے جب تک وہ سمندر یا دریا میں نہ ملے، گویا فراق اس کے لئے آبرو کا سامان ہے۔ اقبال مثلاً

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل   چیست حیات دوام سوختن ناتمام

پروانہ اور جگنو

دریوزہ گر، بھکاری۔

(۱) پروانہ جگنو سے کہتا ہے، جگنو پروانہ کے مقام سے بہت دور ہے، پروانہ شمع پر گر کر جل مرتا ہے، لیکن جگنو کے پاس جو آگ ہے، اس میں جلن ہے ہی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جگنو بے سوز آگ پر کیوں اترا رہا ہے۔

(۲) جگنو جواب دیتا ہے: خدا کا شکر ہے کہ میں پروانہ نہیں بنا، اس لئے کہ مجھے جل مرنے کے لئے دوسرے سے آگ کی بھیک نہیں مانگنی پڑتی۔

اس نظم سے ہمیں یہ اخلاقی سبق ملتا ہے کہ ہر وجود کو صرف اپنے جوہروں سے کام لینا چاہئے۔ اپنے جوہر کی نمائش کے لئے دوسروں کا محتاج ہونا شایان شان نہیں۔ یہ امر خودداری کے خلاف ہے۔

جاوید کے نام

یہ نظم اقبال نے اپنے فرزند عزیز جاوید کو مخاطب کر کے لکھی ہے جس میں گراں قدر نصیحتیں بھی ہیں اور دعائیں بھی، لیکن ان کے مخاطب تمام نونہالان امت ہیں۔

(۱) خودی کے بناؤ ہی میں ہمیشہ کی زندگی کا نشان مل سکتا ہے اور قوموں کی اقبال مندی کے چراغ خودی ہی کی حرارت سے جلتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ خودی ہی افراد کو جاودانی بناتی ہے اور خودی ہی قوموں کو اوج و عروج پر پہنچاتی ہے۔

(۲) یہ ایک بات ہے کہ آدمی اس دنیا میں ایک اہم مقصد لے کر آیا ہے۔ ہزار قسم کی ترقیوں اور ہزار قسم کے اطمینان اور دلجمعی کا باعث ہے۔

مراد یہ ہے کہ انسان کی قدر و قیمت اس کے لباس یا دولت یا ساز و سامان یا منصب پر موقوف نہیں۔ دنیا میں ہزاروں آدمی بڑے بڑے جاگیردار،

دولت اور عہدہ دار گزرے ہیں، لیکن انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ اس لئے کہ ان کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ میرے پاس اگرچہ کوئی ساز و سامان نہیں، نہ جاگیر حاصل ہے، نہ دولت، نہ عہدہ لیکن میرے سامنے ایک مقصد ہے اور اسی نے مجھے تمام سامانوں سے بے نیاز کر رکھا ہے۔ اے میرے پیارے بچے! تجھے بھی کوئی نصب العین تجویز کر لینا چاہیے اور تیری طرح ہر مسلمان نونہال کے لیے شایاں یہی ہے۔

(۳) کوا اور شاہین مل جل کر رہنے لگے۔ اس سے کوے میں تو شاہین کی طرح اونچا اڑنے کی ہمت پیدا نہ ہو سکی، لیکن کوے کی صحبت نے شاہین کی عادتیں بگاڑ دیں۔

مطلب یہ ہے کہ ناجنس کی صحبت میں بیٹھنا کبھی اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ ایسی صحبت سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

(۴) زمانہ ایسا آگیا ہے کہ اس کی آنکھ حیا کے جوہر سے خالی ہو گئی۔ اور رسول اللہ (صلعم) کے ارشاد کے مطابق حیا ایمان کا ایک جزو ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا تیری جوانی کے دامن کو برائی کے ہر داغ سے پاک رکھے! یعنی تو نیک اور صالح جوان بنے اور یہی دعا مت کے ہر نونہال کے لئے ہے۔

(۵) اقبال کسی خانقاہ میں ٹھہر نہ سکا۔ اس لئے کہ وہ خوش طبع، خوش فکر اور صاحب ذوق تھا اور اس کا دماغ شگفتہ ہے، پژمردہ نہیں۔

مطلب یہ کہ آج کل کی خانقاہوں میں خوش طبعی، خوش فکری اور خوش ذوقی کو نہ پسند کیا جاتا ہے اور نہ یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہاں تو

ایسے ہی لوگ رہ سکتے ہیں، جن کے دماغ خشک ہوں، ان میں کوئی اچھا خیال نہ ہو سکے اور خوش طبعی سے انہیں کوئی مناسبت نہ ہو۔

گدائی

یہ نظم جیسا کہ اقبال نے خود لکھا ہے، انوری سے ماخوذ ہے۔ انوری کی متعلقہ نظم صرف اس غرض سے ذیل میں درج کی جاتی ہے کہ اقبال کے طریق اخذ کا اندازہ ہو سکے:

آن شنیدستی کہ روزے زیر کے با ابلہے
گفت کیں والی کہ شہر ما گدائے بے حیاست
گفت چوں باشد گدا آں کز کلاہش تکمہ
صد چو ما را روزہا بل سالہا برگ و نواست

زیرک جواب دیتا ہے:

دُر و مروارید طوقش اشک طفلان من است
لعل و یاقوت ستامش خون ایتام شماست
آنکہ تا آب سبو پیوستہ از ما خواستہ است
گر بجوئی تا بہ مغز استخوانش نان ماست
خواستن کدیہ است خواہش عشر خواں خواہی خراج
زانکہ گر دہ نام باشد یک حقیقت را رواست

چوں گدائی چیز دیگر نیست جز خواہندگی

ہر کہ خواہد چوں سلیمان است و گر قاروں گداست

(۱) ایک دن کسی دانا رند نے شراب خانے میں کہا کہ ہمارے شہر کا حاکم ایک ایسا بھکاری ہے، جسے شرم و حیا سے کوئی واسطہ نہیں

(۲) بھلا دیکھو تو جو اس نے تاج پہن رکھا ہے، یہ کن کن لوگوں کے سروں سے ٹوپیاں چھین کر تیار کیا گیا ہے اور کس کس کا بدن ننگا کر کے اس کے لئے سنہری قبا تیار ہوئی ہے؟

(۳) حاکم لالے جیسے رنگ کی جو سرخ شراب پیتا ہے، کیا یہ دہقان کے لہو سے کشید نہیں کی گئی؟ یعنی دہقان نے خون پسینہ ایک کر کے جو فصل پیدا کی، کیا اسی کا ایک حصہ خراج کے طور پر لے کر حاکم نے اپنے لئے عیش و عشرت کا سامان مہیا نہیں کیا اور میرے تیرے کھیت کی مٹی اس کے لئے کیمیا نہیں بنی؟

کیمیا وہ چیز ہوتی ہے جو مٹی کو سونا بنا دے۔ حاکم بیٹھے بٹھائے پیسے وصول کر لیتا ہے اور کسان جس مٹی میں محنت کر کے جنسیں پیدا کرتے ہیں، وہی جنسیں حاکم کی دولت مندی کا ذریعہ ہیں۔ گویا عوام کی مٹی اس کے پاس جا کر کیمیا کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

(۴) اس کے توشہ خانے میں جو جو چیزیں نظر آتی ہیں، وہ سب مانگے کی ہیں اور یہ چیزیں اسے کون دیتا ہے؟ وہ غریب اور مفلس لوگ جو رات دن محنت کر کے روزی پیدا کرتے ہیں۔ حاکم ان سے اپنا حصہ الگ کرا لیتا ہے، حالانکہ

وہ محنت نہیں کرتا۔ گویا حاکم کا توشہ خانہ محنت کش غریبوں کی دی ہوئی چیزوں سے آراستہ ہے۔

(۵) سچی بات یہ ہے کہ مانگنے والا بھکاری ہے، خواہ وہ صدقے کے نام سے مانگے یا خراج کے نام سے۔ کوئی شخص میری یہ بات مانے یا نہ مانے، جتنے جاگیردار اور بادشاہ نظر آتے ہیں، یہ سب کے سب گدا ہیں اور ان کی زندگیاں بھیک پر گزر رہی ہیں۔

مُلّا اور بہشت

اس مختصر سی نظم میں دراصل آج کل کے نام نہاد علماء کی ایک عام برائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی لڑنا، بحثیں کرنا اور خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کرنے کی فکر میں رہنا جس سے خدا کے بندوں میں پھوٹ پڑے۔

جدل: لڑائی، اختلاف۔ قال و اقول: لفظی معنی اس نے کہا اور میں کہتا ہوں۔ اس سے بھی مراد جھگڑا اور بحث ہے۔ پرانے زمانے میں جو لوگ ایک دوسرے کے رد میں کتابیں لکھتے تھے۔ ان میں دوسروں کی عبارت کو قال کے ماتحت درج کرتے تھے اور اپنی تردید کو اقول کے ماتحت۔

سرشت: فطرت، جبلت۔ بدآموزی: بُری تعلیم دینا۔ ملّ کنشت: بت خانہ یا غیر مسلموں کی عبادت گاہ۔

(۱) خدا کی بارگاہ سے جب حضرت مُلّا کو بہشت میں جانے کا حکم ملا، تو

میں بھی وہاں موجود تھا اور بات کہنے سے رک نہ سکا یعنی ملا کو بہشت میں لے جانے لگے تو میں بول اٹھا۔

(۲) عرض کیا کہ اے خدا! میرا قصور معاف فرمائیے اسے کیوں بہشت میں بھیجتے ہیں؟ اسے حوریں، پاکیزہ شراب اور سبزہ و گل کیوں کر پسند آئیں گے اور ان پر کیوں کر مطمئن ہو گا؟

(۳) بہشت کوئی لڑائی جھگڑے اور بحث و تکرار کی جگہ تو ہے نہیں اور یہی چیزیں خدا کے اس بندے کی فطرت اور خصلت ہیں، ان کے بغیر یہ رہ ہی نہیں سکتا۔

(۴) قوموں اور ملتوں کو بری تعلیم دینا اور غلط راستے پر لگانا اس کا کام ہے یہ بھی یہ اسی جگہ خوش رہ سکتا ہے، جہاں بحث و تکرار کے لئے کچھ سامان موجود ہو۔ مثلاً مسجد کے ساتھ گرجے بھی ہوں اور بت خانے بھی، لیکن الٰہی تو یہ جانتا ہے کہ بہشت میں تو یہ چیزیں موجود نہیں، لہٰذا اسے شرارت کا موقع کیوں کر ملے گا اور یہ اپنی زندگی پر مطمئن کیوں کر ہو گا؟

دین و سیاست

اس کا مضمون یہ ہے کہ عیسائیت نے دین و سیاست کو الگ الگ کر کے دونوں کی بربادی کا انتظام کر دیا۔ ساتھ ہی واضح فرما دیا کہ اس علیحدگی کا بنیادی سبب کیا تھا؟ یہ اسلام کے داعی برحق کا معجزہ تھا کہ اس نے

سیاست اور دین کو ایک رکھا۔ یہ مضمون اقبال نے اپنی تمام کتابوں میں جا بجا پیش کیا ہے اور اس پر بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔

رہبانیت: ترک دنیا۔ قرآن نے عیسائیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَرُهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ (اور عیسائیوں نے ترک دنیا اپنے آپ گھڑ لیا۔ ہم ان کے لئے اس کا حکم نہ دیا تھا۔ ہمارا تو حکم یہ تھا کہ خدا کی رضامندی چاہیں، لیکن انہوں نے اس حکم کو جیسا نباہنا چاہیے تھا نہ نباہا) خصومت: دشمنی۔ سربزیری: لفظی معنی سر نیچے رکھنا، سرنگونی۔ پیر کلیسا: مسیحی مذہبی نظام کا پیشوا یعنی پوپ۔ نابصیری: اندھاپن، کوری۔ صحرا نشیں: لفظی معنی بیابان کا رہنے والا اشارہ ہے حضرت رسول اکرم (صلعم) کی طرف۔ بشیری: بشارت دینا یعنی لوگوں کو راہ حق پر چلا کر اس کے ثواب کی خوش خبری سنانا۔ نذیری: ڈرانا یعنی لوگوں کو برے کاموں کے نتیجے سے خبردار کرنا۔ یہاں مراد ہے سیاست سے یعنی انہیں برے کاموں سے روکنا۔ جنیدی: حضرت جنید بغدادی رح کی صفت، مراد ہے دین داری سے۔ اردشیری: اردشیر ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔ یہاں اس سے مراد شہنشاہی ہے یعنی سیاست۔

(۱) مسیحی کلیسا کی بنیاد یہ تھی کہ دنیا کو ترک کر کے الگ تھلگ رہا جائے اور دنیا اور دین سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے۔ بھلا ایسی فقیری درویشی میں بادشاہی اور حاکمی کے لئے کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

(۲) بادشاہی اور ترک دنیا میں کھلی ہوئی عداوت تھی۔ دونوں چیزیں ایک جگہ نہ ٹھہر سکتی تھیں۔ بادشاہوں کا کام سر بلندی ہے اور راہبوں کا کام یہ ہے کہ اپنے سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھے رہیں اور دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔

(۳) اس کشمکش سے نجات کی صورت یہ نکالی گئی کہ سیاست مذہب سے الگ ہوگئی۔ یورپ نے ہر چند ہاتھ پاؤں مارے، لیکن اس کا ذرا بس نہ چلا۔

(۴) جب سیاست مذہب سے الگ ہوگئی۔ دین اور سلطنت میں کوئی واسطہ نہ رہا تو حاکم اور ان کے وزیر صرف اپنی حرص و ہوس کے بندے بن کر رہ گئے، اس لئے کہ اخلاقی پابندیاں صرف دین عائد کر سکتا تھا اور دین کی کوئی بات حاکم لوگ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔

(۵) دین اور سیاست، ملک اور مذہب کے الگ ہو جانے سے دونوں پر نامرادی کا دور طاری ہوا۔ اسی دوئی کی وجہ سے موجودہ تہذیب کی آنکھیں اندھاپن پیدا ہوگیا۔ اسے نیک و بد کی کوئی تمیز نہ رہی۔

(۶) یہ حضرت رسول اکرم (صلعم) کا ایک معجزہ تھا کہ حضورؐ نے دین اور سیاست کو یک جا رکھا اور دین ہی کو حکمرانی کا آئینہ دار بنایا یعنی یہ کہ حاکم جو کچھ کرے، دینی احکام کے مطابق کرے اور ان حکموں سے بال برابر بھی ادھر سے ادھر نہ ہو۔ صاف فرمایا کہ (لاطاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق) (جس امر میں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو اس میں کسی

مخلوق کی اطاعت نہیں۔ اگرچہ وہ بادشاہ ہی ہو۔)

(۷) انسانیت کی حفاظت کا تقاضا یہی ہے کہ مذہب کی پیشوائی اور شہنشاہی یعنی دین اور سلطنت ایک رہیں۔ ان میں مطلق جدائی نہ ہو۔

الارض للہ

اس نظم کا مضمون یہ ہے کہ زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ نہ یہ زمیندار کی ہے، نہ جاگیردار کی اور نہ بادشاہ کی۔

دہ خدا: گاؤں کا مالک۔ زمیندار۔ آبا: اب کی جمع، باپ دادا۔

(۱) بھلا یہ تو بتاؤ کہ جب بیج زمین میں پڑجاتا ہے تو مٹی کے اندھیرے میں کون اسے پالتا ہے، کس کے حکم سے دریاؤں کی لہریں بھاپ بن کر اوپر اٹھتی ہیں اور بادل بن کر مینہ برساتی ہیں، جس سے کھیتیاں پلتی ہیں؟ یہ سب خدا کے کام ہیں۔

(۲) پچھم سے کون ایسی ہوا کھینچ کر لاتا ہے جو کھیتوں کے بڑھنے اور پھولنے پھلنے میں مدد دیتی ہے؟ یہ زمین کس کی ہے؟ یہ سورج کی روشنی کس کی ہے؟ یہ سب چیزیں خدا کی ہیں۔

(۳) گیہوں کے سٹے کی جیب موتی جیسے دانوں سے کون بھرتا ہے؟ موسموں کو بدل بدل کر آنے کے آداب کس نے سکھائے؟ یہ سب خدا کے کام ہیں۔

(۴) لہٰذا اے گاؤں کے مالک! اے زمیندار! یہ زمین تیری نہیں، ہرگز تیری نہیں۔ نہ یہ تیرے باپ دادا کی ہے، نہ تیری ہے، نہ میری ہے۔ یہ تو خدا کی ہے۔

ایک نوجوان کے نام

اس نظم میں اقبال نے ملّت کے نوجوانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ انہیں تن آساں نہیں، جفاکش ہونا چاہیے۔ ان میں حیدریؓ زور اور سلمانیؓ استغنا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کی معراج استغنا ہی ہے پھر ضروری ہے کہ ان کی نظریں اور ہمتیں بلند ہوں۔ وہ نا امیدی کو پاس تک نہ پھٹکنے دیں، اس لیے کہ نا امیدی علم و عرفان یعنی ظاہری و باطنی تہذیب و تنویر دونوں کے زائل ہو جانے سے نا امیدی کو دل میں جاگزیں ہونے کا موقع ملتا ہے۔ آخر میں یہ سبق دیا ہے کہ نوجوانوں کو بادشاہوں اور حاکموں کا دست پرورده نہ ہونا چاہیے۔

استغنائے سلیمانیؓ: استغنا کے لفظی معنی ہیں بے نیازی، دل کی سیری۔ ہر قسم کی احتیاج سے بے پروائی۔ سلیمانی سے مراد حضرت سلمان فارسیؓ ہیں۔ **علم و عرفان:** عام لفظ ہیں لیکن یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو دماغی جوہروں کو جلا دیتا ہے اور عرفان سے مراد وہ کیفیت ہے جو تزکیہ قلوب اور حقائق شناسی کا ذریعہ ہے۔

(۱) اے نوجوان! تو نے اپنے لیے یورپی وضع کے صوفے بنوائے ہیں اور تیرے قالین ایران سے منگوائے گئے ہیں یعنی آرام پسندی، عیش و عشرت اور امیری کی نمائش کے بہترین سامان تو نے اپنے لیے جمع کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تجھے آرام پسندی اور عیش کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں۔

میں جب جوانوں کو آرام پسندی میں ڈوبا ہوا دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں خون رونے لگتی ہیں، اس لئے کہ مسلمان نوجوانوں کو تو حد درجہ محنتی اور جفاکش ہونا چاہیئے۔ ان کے بلند نصب العین کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے جسموں کو سادگی کا عادی بنائیں تاکہ ہر قسم کی محنتیں اور مشقتیں بے تکلف برداشت کر سکیں اور ان میں خوش رہیں۔ جن نوجوانوں میں یہ کیفیت پیدا نہ ہوگی، وہ بڑے بڑے کارنامے کیوں کر انجام دے سکیں گے اور بلند قومی مقاصد کے پورا ہونے کی کیا صورت بنے گی؟

(۲) مانا کہ تو بڑا امیر ہے جیسا کہ تیرے ساز و سامان سے ظاہر ہوتا ہے لیکن ساز و سامان کی امیری کیا حیثیت رکھتی ہے؟ امیری تو رہی ایک طرف بادشاہی شان و شوکت بھی مل جائے تو اس سے کیا حاصل ہو گا؟ اصل شئے معنوی حسن ہے۔ تیری حقیقی شان اس میں ہے کہ بزرگوں کے خاص جوہر اپنے اندر پیدا کر لے۔ مثلاً تجھ میں حضرت شیر خدا کا سادہ ذوق پیدا ہونا چاہیئے جنھوں نے حد درجہ سادہ زندگی میں امت کی بڑی بڑی مشکلیں آسان کر دیں۔ تجھ میں حضرت سلمان رضؓ کی سی بے نیازی، خودداری اور درویشی پیدا ہونی چاہیئے۔ مسلمان نوجوان کی شان یہی ہے کہ مشکلات ہجوم کر آئیں تو حضرت شیر خداؓ کی طرح انہیں بزورِ ختم کرے اور دنیوی فائدوں سے حضرت سلمان فارسی رضؓ کی طرح بالکل بے نیاز رہے۔

(۳) دنیوی فائدوں سے بے نیازی ایسی چیز نہیں کہ تہذیب دورِ حاضر کی روشنی میں مل سکے، جس کی بنیاد ہی ذاتی فائدوں پر ہے اور اس میں

حرص وہوس کے سوا کسی چیز کی تربیت نہیں ہوتی، لیکن اس کے برعکس اسلام کی معراج ہی بے نیازی ہے۔ اسلام کی تعلیم ہی یہ ہے کہ انسان ہر کام کو خدا کی عبادت سمجھ کر کرے اور خدا کی عبادت دنیوی فائدوں کے لئے نہیں کی جاتی۔ ہر قسم کے فائدوں کی حرص سے انسان کا دل پاک رہنا چاہئے۔

(۴) جب نوجوانوں میں ارادے اور ہمت کی بلندی کا خاص جوہر پیدا ہوتا ہے تو وہ آسمانوں کو اپنی منزلِ مقصود بنا لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت کے لئے یہ بہت ہی بڑی بلندی ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ ہمّت و حوصلے میں مسلمان نوجوانوں کی منزل کم از کم آسمانوں جتنی اونچی تو ہونی چاہیے۔ ہمّت و حوصلہ کے بغیر جد و جہد نہیں کی جا سکتی اور انسان ترقی نہیں کر سکتا۔

(۵) اے نوجوان! اگر حالات موافق نظر نہیں آتے تو نا امید نہ ہو، اس لئے کہ ناامیدی علم و عرفان یعنی دماغ اور دل کے حقیقی جوہر زائل ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ اس کی امید کا چراغ کبھی نہیں بجھتا، اسی لئے کامیاب ہوتا ہے۔ مومن کی امید کو خدا کے رازدانوں میں شامل کرنے کا مطلب بھی سمجھ لینا چاہیے۔ کوئی انسان قبل از وقت نہیں جان سکتا کہ مشکلات کی حقیقی حیثیت کیا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہو کر اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے کتنی محنت و مشقت اٹھانی پڑے گی۔ اس کا فرض یہ ہے کہ مقصد کو پورا کرے اور اس کے لئے لگاتار جد و جہد کرتا جائے۔ یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جد و جہد کب منزلِ مقصود پر پہنچے گی؟ امید کا قائم رہنا جد و جہد جاری رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ آخر انسان مقصد پورا کر لیتا ہے۔

اسی بنا پر امید خدا کی رازدانوں میں قرار دی گئی۔

(۶) اے جوان! تیرا ٹھکانا بادشاہی محل کے گنبد پر نہیں۔ تو شاہین ہے۔ جا، پہاڑوں کی چٹانوں میں زندگی بسر کر۔

اس میں بھی جفاکشی ہی کی تعلیم ہے۔ شاہی محل راحت و آسائش اور تن پروری کا ذریعہ ہے چٹانوں میں بسیرا کرنے والے ہمیشہ جفاکشی اور بلند ہمتی کے پیکر بنے رہیں گے۔

نصیحت

اس نظم میں بھی جفاکشی اور جد و جہد کی تعلیم دی گئی ہے۔

سال خوردہ: بوڑھا۔ تلخ: کڑواہٹ۔ انگبیں: شہد۔

(۱) ایک بوڑھا عقاب شاہین کے کسی بچے سے کہتا تھا کہ اے بچے! خدا تیرے بازوؤں میں ایسی قوت عطا کرے جس کی برکت سے تیرے لئے اعلیٰ آسمان کی بلندی تک اڑنا بھی آسان ہو جائے۔

(۲) مجھ سے سن کہ جوانی کا مطلب کیا ہے؟ جوانی کا مطلب یہ ہے کہ انسان لگاتار محنت و مشقت کرتا رہے اور خون کی حرارت اسے ہر وقت جد وجہد میں لگائے رکھے۔ یہی اپنے لہو کی آگ میں جلنا ہے۔ جب کوئی ہر وقت محنت و مشقت میں مصروف رہے اور اس کی سرگرمی میں کمی نہ آنے پائے، تو زندگی کی کڑواہٹیں اس کے لئے شہد بن جاتی ہیں، یعنی جتنی مشکلات اسے

پیش آتی ہیں، حل ہو جاتی ہیں اور وہ اپنی جد و جہد کا خاص لطف اٹھاتا ہے۔

(۳) بیٹا! کبوتر پر جھپٹنے اور حملہ کرنے میں جو مزہ ملتا ہے وہ مزہ شاید کبوتر کا لہو پینے میں بھی نہیں۔

مراد یہ ہے کہ زندگی کی جو لذت جد و جہد میں ہے، وہ جد و جہد سے حاصل کی ہوئی چیزوں میں نہیں۔

لالۂ صحرا

اس نظم میں لالۂ صحرا سے مخاطب ہو کر اپنے دل کی وہ کیفیت واضح کی گئی ہے جو اس پر عشق کے دوران میں وارد ہوتی ہے۔

(۱) اے لالۂ صحرا! آسمان کا یہ نیلا گنبد، تنہائی کا یہ عالم، مجھے تو اس جنگل کی وسعت، کشادگی اور فراخی دیکھ کر ڈر لگتا ہے، خدا جانے تو یہاں کیوں کر رہتا سہتا ہے؟

(۲) میں بھی ایسا مسافر ہوں جو راستہ بھول گیا ہو اور تو بھی، اے جنگل میں کھلے ہوئے لالے کے پھول! تیری منزل کہاں ہے؟ یہ جنگل تو یقیناً نہیں کیونکہ یہاں تیرا داغ جگر دیکھ کر تیری قدر کرنے والا ناپید ہے۔ تجھے تو کسی باغ کی بہار بن کر اسی کے حسن و جمال کو چار چاند لگانا چاہیے تھا۔

مراد یہ ہے کہ مومن کی زندگی کا مقصد دنیا کو چھوڑ دینا نہیں بلکہ دنیا رہ کر دنیا کی پابندی کرتے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر چلانا اور ان کی

اصلاح کرنا ہے۔

(۳) یہ پہاڑ اور اس کا دامن کلیم جیسی بلند پایہ ہستیوں سے خالی ہے۔ ورنہ تو اور میں دونوں اپنے اپنے سینے میں کوہ طور سے شعلے جیسا نور پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی صاحب نظر دکھائی نہیں دیتا ورنہ تجھ میں حسن حقیقی جلوہ گر ہے اور مجھ میں بھی۔

(۴) تو شاخ سے الگ کیوں ہوا اور میں عدم سے ہستی میں کیوں آیا؟

صرف اس وجہ سے کہ ہر شے میں خودنمائی کی امنگ، جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ میں بے مثال خوبیوں کی مالک بن جاؤں۔

(۵) اللہ تعالیٰ ہی محبت کے دریا میں غوطہ لگانے والے کی نگہبانی کرے۔ اس دریا کے ہر قطرے کی گہرائی دریا کی گہرائی کے برابر ہے۔

مراد یہ ہے کہ عاشق خدا کی مدد کے بغیر دلی مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ منزل عشق بڑی کٹھن ہے۔ اس کے ہر راستہ میں اتنی ہی خوفناک آفتوں سے پالا پڑتا ہے جتنی تمام راستوں کی یک جائی آفتوں سے۔

(۶) بھنور کی آنکھ اس لہر کے ماتم میں سر پیٹ رہی ہے جو دریا سے تو ابھری لیکن کنارے سے بغل گیر نہ ہوئی۔

مطلب یہ کہ فطرت اس انسان کی ناکامی و نامرادی پر بے حد افسوس کرتی ہے جو مشکلات کا بہادرانہ مقابلہ کر کے ان پر فتح حاصل کرنے کے بعد زندگی کے حقیقی مقصد سے ہم آغوش نہ ہو سکے۔

(۷) دنیا کی یہ گرمیٔ بازار انسان کی سرگرم جدوجہد کے دم سے ہے سورج اور چاند تارے سب یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ کائنات میں یہ جو کچھ ہنگامہ آرائی، چہل پہل، رونق اور گرمیٔ بازار نظر آرہی ہے۔ اس کا سہرا انسان ہی کی سربکف سعی و کوشش کے سر ہے۔ آفتاب و مہتاب، ستارے اور ساری مخلوقات انسان کی خدمت گار ہے اور انسان ان سب کا سردار و مخدوم۔ یعنی انسان ساری کائنات سے اشرف و اعلیٰ ہے۔

(۸) اے بیابان کی ہوا! مجھے بھی چپ رہنا، سوز و گداز، غم گساری، ہمدردی، مستی اور حسن و جمال بخش دے۔

مطلب یہ کہ اے قدرت خدا! مجھے بھی عشق کی ان مول نعمت عطا کردے تاکہ میری آرزو کا دامن خاموشی، انسانی ہمدردی، ذکر محبوب کے سرور اور کیف اور حسن و رعنائی سے بھر جائے۔

قطعہ

(۱) کل اقبال نے اہل چمن کو یہ سرور بخش، سوز و گداز سے بھرا ہوا دل آویز شعر سنایا۔

(۲) کہ میں پھول کی طرح شگفتہ ہونے کے لئے صبا کا حاجت مند نہیں، بلکہ میرے جنون کا جوش ہی میری قبا تار تار کردیتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے زندگی کا مقصد حاصل کرنے کے لئے دوسروں کی محتاج ہوتی ہے، لیکن صرف انسان ایک ایسی ہستی ہے جو اپنے نفس کو پہچان کر خودی کی نعمت سے مالا مال ہونے کے باعث اپنا مقصد حیات آپ حاصل کر سکتا ہے۔

ساقی نامہ

اس نظم کے سات بند ہیں اور ہر بند میں ایک خاص مضمون پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلے بند میں بہار کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، جسے ساقی نامے کی تمہید سے خاص مناسبت ہے۔

دوسرے بند میں دورِ حاضر کے اہم انقلابات کا ذکر فرماتے ہوئے مسلمانانِ عالم کے غیر اسلامی اعمال و مشاغل کا ماتم کیا گیا ہے۔

تیسرے بند میں نونہالانِ اسلام کے لئے ساقیِ کائنات یعنی ذاتِ باری تعالیٰ سے دلسوز دعا کی گئی ہے

چوتھے بند میں حقیقتِ زندگی کے چہرے سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

پانچویں بند میں زندگی کی خصوصیتیں کھول کر بیان کی گئی ہیں۔

چھٹے بند میں خودی کا راز بے نقاب کیا گیا ہے۔

ساتویں بند میں خودی کے اوصاف و محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخری شعروں میں انسان سے خطاب کرتے ہوئے زندگی کے فلسفے اور اپنے پیغام کی وضاحت کی گئی ہے۔

پہلا بند | (۱) بہار کے قافلے نے آکر ڈیرے ڈال دیئے اور پہاڑ کے آس پاس کی جگہ بہشت کا ٹکڑا بن گئی۔

(۲) گلاب، نرگس، سوسن اور چنبیلی کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور لالہ نے جو ازلی شہید ہے، خونیں کفن پہن رکھا ہے، یعنی اس کی سرخی نگاہوں کو تازگی بخش رہی ہے۔

(۳) سارا جہان رنگ کے پردے میں پوشیدہ ہوگیا اور پتھر کی نس نس خون دورہ کرنے لگا۔

مراد یہ ہے کہ دنیا نے بہار کا لباس پہن لیا اور ذرّے ذرّے میں رعنائی جوش مارنے لگی۔

(۴) نیلی نیلی فضا ہے۔ ہوا کے نشہ سے دل و دماغ مست ہوے ہیں۔ پرندے گھونسلوں میں آرام کرنے کے بجائے خوشی سے ادھر ادھر اڑ رہے ہیں۔

(۵-۶) پہاڑ کی ندی کبھی تو اچکتی، رکتی، بل کھاتی اور سرکتی ہوئی خراماں خراماں بہے چلی جا رہی ہے اور کبھی کودتی، پھسلتی، سنبھلتی اور پیچ کھاتی ہوئی بھاگ دوڑ رہی ہے۔

(۷) جب یہ ندی ذرا رک جاتی ہے تو بہاؤ کے زور شور سے پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے اور پہاڑوں کا سینہ چھلنی چھلنی کر دیتی ہے۔

ان تین شعروں میں پہاڑی ندی کی روانی کا نقشہ نہایت دل کش

انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس کا صحیح لطف وہ خوش نصیب اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے پہاڑوں میں ندی نالوں کے بہنے کا سماں بہ غور دیکھا ہے۔

(۸) اے گل عذار ساقی! ذرا اس ندی کو گہری نظر سے دیکھ، یہ زندگی اور بیداری کا پیغام پہنچا رہی ہے۔

(۹) اے ساقی! مجھے ایسی شراب پلا جس کی آتشیں گرمی وہ پردے جلا ڈالے جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہیں کیونکہ فصل گل کبھی کبھی آتی ہے۔

(۱۰) مجھے ایسی شراب عنایت کر جس سے زندگی کا دل جگمگا رہا ہے۔ اور کیف و سرور سے ساری دنیا کو مست و مدہوش کر رہی ہے۔

(۱۱) مجھے ایسی شراب عطا کر جو اہل دل کے سوز و ساز سے لبریز ہے یعنی جس سے عشق و حسن کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور جو دنیا کے آغاز اور پیدائش کا راز کھول کر رکھ دیتی ہے۔

(۱۲) اے ساقی! مجھے اپنے عشق کی شراب پلا کر کائنات کے بھید سے آگاہ کر دے اور مجھ جیسے کمزور بے حقیقت جانور کو وہ ہمت عطا کرے کہ شہباز سے لڑ جائے۔

دوسرا بند (۱) زمانے میں انقلاب آ گیا۔ اس کے طور طریقے بدل گئے۔ پرانے ساز باقی نہ رہے۔ ان کی جگہ نئے ساز آ گئے اور راگ بھی نیا گایا جانے لگا۔ نئے نغمے نکلنے لگے یعنی جدید نظریے اور نئی تحریکیں بروئے کار آ گئیں۔ جن کی تفصیل خود آگے فرماتی ہے۔

(۲) یورپ کا بھید یوں ظاہر ہو گیا کہ وہ خود ہی اپنی عیاری اور مکاری کے

آشکارا ہو جانے پر دنگ رہ گیا۔

مراد یہ کہ یورپ کی سرمایہ داری اور ملوکیت کا طلسم پارہ پارہ ہو گیا۔

(۳) سیاست کے پرانے ہتھکنڈے بیکار اور ذلیل و خوار ہو گئے ہیں اور سارا جہان ملوکیت کو بیزاری و نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔

(۴) سرمایہ داری کا دور ختم ہو گیا۔ گویا یہ مداری کا تماشا تھا اور وہ تماشا دکھا کر رخصت ہو گیا

(۵) اہل چین جن پر مدت دراز سے پستی و غفلت کی گہری نیند طاری تھی، وہ بھی بیدار ہونے لگے اور غلامی کی قید و بند سے آزاد ہونے کے لئے سرگرم جدوجہد میں لگ رہے ہیں۔ ہمالہ پہاڑ کے چشمے بھی جوش میں آ کر ابلنے لگے ہیں۔ یعنی ہندوستان میں بھی آزادی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔

(۶) طور اور فاران دونوں پہاڑوں کے دل دو پارہ ہو گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ پھر دیدار الٰہی کے لئے بیتاب ہیں۔

مراد یہ کہ عرب اقوام بھی طمع ملک گیری کے خلاف کمر بستہ ہو گئی ہیں اور غیبی امداد کا انتظار کر رہی ہیں۔

(۷) بظاہر تو مسلمان جوش و خروش سے توحید کے اقرار اور تائید میں سرگرم ہیں لیکن ان کے دلوں نے ابھی تک زنّار باندھ رکھے ہیں۔ یعنی بظاہر اسلامیت کا جوش و خروش نظر آ رہا ہے، اس نے مسلمانوں کے باطن پر ابھی تک کوئی اثر نہیں ڈالا، ان کے عقائد و اعمال میں کوئی نمایاں تغیر پیدا نہیں ہوا۔

(۸) تمدن ہو یا تصوف، شریعت ہو یا علم کلام، مسلمانوں کی ہر چیز عجمی بتوں کی پجاری ہے۔ یعنی ان کے رہنے سہنے کے ڈھنگ، ان کے ذکر و فکر

کے حلقے، ان کی فقہ یا دینی حقیقتوں کے متعلق دلیلیں دینے کے طور طریقے، کسی بھی چیز کو لے لیا جائے، اس پر عجمیت کا رنگ غالب ہے۔ اسلامیت کا وہ نقشہ نظر نہیں آتا جو خود اسلام نے پیش کیا تھا۔ اس کی مزید تشریح اگلے شعروں میں کی ہے۔

(۹) اس غفلت اور کوتاہ بینی کا افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی حقیقت و صداقت لغویات اور فضولیات کے بوجھ سے دب کر رہ گئی اور مسلمان قوم غیر اسلامی قصے کہانیوں میں کھو گئی۔

(۱۰) مسلمانوں کے عالموں اور واعظوں کا یہ حال ہے کہ ان کی عجیب و غریب تقریریں دلوں کو لبھا لیتی ہیں، لیکن ان کے سینے عشق حق کی لذّت سے بے بہرہ ہیں۔

(۱۱) خطیبوں کی تقریریں منطق اور فلسفہ کے لحاظ سے خوب سلجھی ہوئی، الفاظ بڑے پُرشوکت، اور ترکیبیں حسین و دل فریب ہوتی ہیں۔

(۱۲-۱۳) صوفیۂ کرام کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کسی زمانے میں حق و صداقت کے علم بردار تھے۔ اور اسے دور دور تک پھیلانے کے لئے سر بکف جد و جہد کرتے تھے عشق حق میں ان کا جواب نہ تھا۔ اسلامی حمیّت اور غیرت میں کوئی بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اب وہ غیر اسلامی خیالات اور رسوم و عقائد میں گم ہو گئے یعنی یہ مسافر منزلوں ہی میں کھو گیا۔

(۱۴) کیسا اندھیر ہے کہ عشق حق کی آگ بجھ گئی اور مسلمان راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا یعنی مسلمان میں حرارت کی جو بھی متاع تھی، وہ عشق حق کی بدولت تھی۔

وہ متاع ضائع ہوئی تو مسلمان کی قدر و قیمت بھی جاتی رہی۔

تیسرا بند | سیّار: چلنے پھرنے والا، گردش کرنے والا۔ غزالانِ افکار: خیالات کے ہرن یعنی خیالات۔

(۱) اے ساقی! مجھے پھر پرانی شراب پلا دے اور اسی پیالے کا دور چلا کر دل کی آگ بجھا دے۔

مطلب یہ کہ اے خدا! مجھے عشق رسول ؐ کی نعمت عطا کر دے اور اس پاکیزہ شراب کے ساغر پر ساغر پلا کر بےخود بنا دے۔

(۲) مجھے عشق رسول ؐ کے بال و پر بخش دے تاکہ میں محبت کی اونچی اور پاک فضا میں اڑتا پھروں۔ میری خاک کو عشق کی آگ سے ایسا گرما دے کہ اس کا ہر ذرّہ جگنو کی صورت پرواز کرنے لگے۔

(۳) مسلمانوں کی ذہنیتوں کو غلامی کی قید و بند سے چھڑا دے۔ نوجوانوں کو عشق رسول ؐ کے نشہ میں ایسا چور کر دے کہ وہ اسلامی شریعت کے احکام کی تعمیل میں بوڑھوں سے بھی بازی لے جائیں۔

(۴) اے خدا! قوم کا باغ تیرے ہی آبِ کرم سے سرسبز و شاداب ہے اور ملّت اسلامیہ تیرے ہی لطف و احسان کی بدولت زندہ ہے۔

(۵) مسلمانوں کے دلوں میں عشق رسول کی بے قراری اتڑپ اور جذبہ پیدا کر دے اور انہیں حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کی تب و تاب اور حضرت صدیقِ اکبر رضؓ کا سوز و گداز بخش کر انہیں کے رنگ میں رنگ دے۔

(۶) پھر قوم کے جگر سے عشق رسول ؐ کا تیر پار کر دے اور زندگی کا مدّعا

حاصل کرنے کی آرزو کو افرادِ ملّت کے سینوں میں جگا دے۔

(۷) تیرے آسمانوں کے ستارے ہمیشہ قائم اور چمکتے رہیں۔ دنیا میں جو نیک لوگ راتوں کو جاگ کر تیرا نام لیتے اور تیری عبادت کرتے ہیں، وہ صحیح و سلامت رہیں۔

(۸) مسلمان نوجوانوں کو میری طرح دل و جگر کا سوز و گداز عطا کر دے اور جس طرح میرا سینہ عشقِ رسول کی تب و تاب سے روشن ہے اور میری نظریں حقیقت کے نور سے منوّر ہیں۔ یہی نعمت اور سعادت انہیں بخش دے۔

(۹) میری کشتی بھنور سے نکال کر ساحل پر لگا دے۔ یہ ایک ہی مقام پر جمی ہوئی ہے۔ اس میں حرکت پیدا کر دے۔

مراد یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ عمل سے بیگانہ ہونے کے باعث پستی کی گہرائیوں میں گری ہوئی ہے، تو اسے سرگرمِ عمل کر کے اس میں اسلامی جوہر پیدا کر دے تاکہ یہ ترقی و برتری کی بلندیوں پر پہنچ جائے۔

(۱۰) مجھے زندگی اور موت کے رازوں اور رمزوں اور نکتوں سے آگاہ کر دے کیوں کہ تیری بلند و برتر ذات ساری کائنات کے حال سے باخبر ہے۔

(۱۱) میری آنکھیں آنسوؤں کا مینہ برساتی رہتی ہیں۔ میں رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ میرا دل بے قرار اور بے چین رہتا ہے اور میری اس حالت سے کوئی بھی آگاہ نہیں۔

(۱۲) میں آدھی رات کے وقت تیری بارگاہ میں نالہ و فغاں کرتا ہوں۔ میں تنہا ہوں یا کسی بزم میں، ہر جگہ سوز و گداز سے بیتاب رہتا ہوں۔

(۱۳) میرے پُرجوش جذبات، میرا ذوق وشوق، میرے ارادے اور تمنائیں، میری طلب اور تلاش۔

(۱۴) میری سرگزشت زمانے کا آئینہ ہے یعنی ساری دنیا کی حقیقت میری نظروں میں ہے۔ میرا ذہن فکر وخیال کے ہرنوں کا سبزہ زار ہے۔ یعنی میرے دماغ میں اونچے اور پاک خیالات بھرے ہوئے ہیں۔

(۱۵) میرا دل میری زندگی کی جنگ کا میدان ہے۔ میرا سینہ خیالات کے لشکروں کی قیام گاہ ہے۔ میرا یقین و ایمان ثابت وقائم ہے۔

(۱۶) اے ساقی! مجھ درویش کا سرمایہ یہی کچھ ہے۔ ایسی دولت سے فقیری میں امیری کے مزے لے رہا ہوں

(۱۷) میں نے جتنی چیزیں اوپر بیان کی ہیں، ان سب کو میر قوم میں بانٹ دے۔ تاکہ میری یہ پونجی ٹھکانے لگ جائے۔

مطلب یہ ہے کہ ملّت اسلامیہ کے ہر فرد کا دل عشق رسول کی اسی یگانہ نعمت سے مالامال کر دے جس سے میرا سینہ بھرپور ہے۔

چوتھا بند (۱) زندگی کا دریا ہر دم لہریں لے رہا ہے، ہر شے سے زندگی کی تگ ودو اور آگے قدم بڑھانے کی جد وجہد ظاہر ہے۔

(۲) جس طرح شعلے میں دھوئیں کی لہر پوشیدہ ہوتی ہے، اسی طرح جسم کے اندر زندگی پوشیدہ ہے اور زندگی ہی اسے وجود عطا کر کے آنکھوں کے آگے نمایاں کر دیتی ہے۔

(۳) اگرچہ زندگی کو یہ عمل ناگوار گزرتا ہے کہ عناصر دنیا کے ساتھ مل جل کر

رہے۔ لیکن اسے آگ، پانی، مٹی، ہوا کی جدوجہد اچھی معلوم ہوتی ہے۔

مطلب یہ کہ اگرچہ زندگی آب و گل کی قید میں رہنا پسند نہیں کرتی لیکن اسے اس کی تگ و دو اس وجہ سے خوش گوار معلوم ہوتی ہے کہ زندگی کی ترقی و برتری کے لیے جسم کا ہونا لازم ہے۔

(۴) زندگی ایک جگہ قائم بھی ہے کیوں کہ وجود کے وسیلہ سے دکھائی دے رہی ہے اور حرکت کرنے والی بھی کیوں کہ یہ ترقی کے راستہ میں رواں دواں رہتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی عناصر کی زنجیروں میں جکڑی بھی ہوئی ہے اور ان سے بیزار بھی۔

(۵) زندگی وحدت ہے، جو ہر لحظہ کثرت میں گرفتار ہے، یعنی زندگی تو ایک ہی چیز ہے، مگر اس کے نظارے کثرت کے لباس میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر نظارہ دوسرے نظارے سے وضع قطع میں جداگانہ ہوتا ہے اور ایک کی مثال کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔

(۶) یہ دنیا، یہ چھ طرفوں کا بت کدہ زندگی ہی کی بدولت وجود میں آیا ہے اسی زندگی نے جہان کا یہ سومنات، یہ بت خانہ تعمیر کیا ہے۔

(۷) زندگی کو ایک چیز کے بار بار دہرانے کی عادت نہیں، کیوں کہ تو اور میں شکل میں ایک جیسے نہیں۔

مراد یہ ہے کہ کسی کی صورت کسی سے ملتی نہیں۔ ہر شخص اپنے آپ کو دوسرے سے جدا خیال کرتا ہے۔

(۸) زندگی مختلف افراد کو اکٹھا کر کے بزم سجا لیتی ہے لیکن خود بزم ہی کے

اندر تنہائی میں پوشیدہ ہو جاتی ہے، یعنی ظاہر کی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتی۔

(۹) زندگی دنیا کی بے شمار چیزوں میں مختلف شکل و صورت اور جداگانہ رنگ ڈھنگ سے نظر آتی ہے۔ مثلاً کبھی بجلی اور تارے میں جلوہ دکھاتی ہے، کبھی چاندی، سونے اور پارے میں چمکتی دمکتی ہے۔

(۱۰) صحرا، جنگل، ببول، کانٹے اور پھول، ان سب کا وجود زندگی ہی کی بدولت ہے۔

(۱۱) کہیں زندگی بے پناہ قوّت سے پہاڑوں کو ٹکڑے کر دیتی ہے کہیں حضرت جبریلؑ اور حوروں کو دام میں پھانس لیتی ہے یعنی انسان کو روحانی قوّت کا جوہر عطا کر کے اسے فرشتوں کے جہان اور جنّت کی سیر کرا دیتی ہے۔

(۱۲) کہیں زندگی اس رنگ میں جلوہ دکھاتی ہے کہ حیرت انگیز قوّت و طاقت رکھنے والا شہباز چکوروں پر جھپٹ کر ان کے لہو سے اپنے پنجے بھر لیتا ہے۔

مطلب یہ کہ کوئی زبردست ملک کمزور علاقے پر حملہ کر کے وہاں خون کے دریا بہانے کے بعد اس پر قبضہ جما لیتا ہے۔

(۱۳) کہیں زندگی اس شکل میں ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی کبوتر گھونسلے سے الگ تھلگ کسی دور دراز مقام میں شکاری کے دام میں گرفتار ہو کر انتہائی بیتابی سے پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔

پانچواں بند | حضر: سفر کے برعکس، اپنے گھر میں ٹھہرے رہنا۔

مکافات: بدلہ۔ زوج زوج: جوڑا جوڑا۔ تیز جولاں: تیز چلنے والی۔

زود رس: جلد پہنچنے والی۔

(۱) ٹھہرنا اور ایک جگہ قائم رہنا نگاہ کا دھوکا ہے۔ ورنہ دنیا کا ایک ایک ذرّہ تڑپ رہا ہے۔

مراد یہ ہے کہ کائنات میں کوئی بھی شے ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں، بلکہ حرکت کر رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ظاہر کی آنکھ اس حرکت کو نہ دیکھ سکے

(۲) وجود کے قافلے کو کسی ایک جگہ قرار نہیں۔ وجود کی شان ہر دم تازہ بہ تازہ رہتی ہے۔

مطلب یہ کہ وجود ہر وقت نئے نئے رنگ بدلتا اور گوناگوں جلوے دکھاتا رہتا ہے۔

(۳) تو خیال کرتا ہے کہ زندگی ایک راز ہے جو ہر کس و ناکس پر ظاہر نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف اڑان کی لذّت ہے اور بس۔

مراد یہ ہے کہ زندگی دم بہ دم ترقی کی بلندیوں پر چڑھتی جاتی ہے۔

(۴) زندگی بہت سی پستیوں اور بلندیوں میں سے ہو کر گزری ہے۔ یہ منزل میں ٹھہر کر آرام کرنے کی نسبت سفر کو زیادہ پسند کرتی ہے یعنی زندگی پہلے پہل نچلی جگہوں اور ادنیٰ مقامات میں تھی۔ آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھا کر موجودہ بلند درجے پر پہنچ گئی۔ سفر اور گردش اس کی جان ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ کسی پڑاؤ پر رک کر آرام نہ لے، بلکہ لگاتار چلتی جائے۔ اس لگاتار چلتے جانے پر ہی اس کا وجود اور بقا موقوف ہے۔

(۵) سفر زندگی کے لئے سازوسامان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سفر حقیقت ہے

اور اپنے گھر میں ٹھہرا رہنا مجاز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ سفر ہی زندگی کو ہمیشہ قائم اور مضبوط رکھتا ہے، سفر اصلیت اور قیام دکھاوا۔ بس یوں سمجھیے کہ زندگی سفر ہی کی دوسری شکل ہے

(۶) زندگی کو اسی میں لطف آتا ہے کہ چاروں طرف سے آفتوں اور مصیبتوں میں گھر کر ان پر فتح پائے۔ اسے یہی امر آرام اور سکون بخشتا ہے کہ تڑپے، پھڑکے لڑے بھڑے، کشمکش، آویزش اور ہنگامہ خیزی میں مصروف رہے۔ یعنی زندگی اسی صورت میں ترقی کر سکتی ہے کہ راستے میں پیش آنے والی تمام رکاوٹوں اور مشکلوں کا بہادرانہ مقابلہ کر کے ان پر غلبہ حاصل کرے۔

(۷) جب زندگی کو موت سے مقابلہ کرنا پڑا تو اس کی زد سے بچ کر نکلنا بے حد مشکل تھا۔

مراد یہ ہے کہ اگرچہ زندگی کے لئے موت کا وار روکنا بڑا کٹھن تھا لیکن اس نے اپنی غیر معمولی اور بے پناہ قوتوں کے بل پر اسے مات دے دی۔

(۸) جب زندگی بدلہ اور انتقام لینے پر تل گئی تو ہر وقت موت کو شکست دینے کے لئے موقع کی تاک میں رہی۔

مطلب یہ کہ زندگی نے اپنی گوناگوں، حیرت انگیز اور مسخر کرنے والی قوتوں کے ہتھیاروں سے موت پر فتح پالی۔

(۹) خدا نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا تھا اس لئے زندگی نر اور مادہ کے ملنے سے جوڑا جوڑا بن گئی آخر وہ جنگلوں اور پہاڑوں سے بے شمار فوجوں کی شکل میں ظاہر ہو گئی۔

(۱۰) کبھی اس شاخ سے پھول ٹوٹ گئے اور کبھی پھوٹ پڑے، یعنی زندگی موجود سے نابود اور نابود سے موجود ہوتی رہتی ہے۔

(۱۱) بے خبر لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ زندگی فانی اور ناپائدار ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ حق یہ ہے کہ زندگی کا نقش محو ہو ہو کر نمودار ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ زندگی کی معمولی صورت مٹ جاتی ہے تو اسی سے نمایاں صورت ظاہر ہو جاتی ہے۔

(۱۲) زندگی نہایت تیز رفتار ہے۔ یہ جہاں پہنچنا ہے، آن کی آن میں پہنچ جاتی ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایک سانس کے آنے جانے کی شکل میں اپنی ہستی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ اسی طرح یہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی۔

(۱۳) زمانہ جو گویا دنوں کی زنجیر ہے، سانسوں کی گردش اور حرکت کا دوسرا نام ہے یعنی زمانہ زندگی کے رواں دواں ہونے کی دوسری صورت ہے۔

چھٹا بند تجسس: تلاش جستجو، ڈھونڈ ڈھانڈ۔ تقویم: قیام، ثبات، مضبوطی، استحکام، پائداری، استقامت۔

(۱) سانس کی لہر کیا ہے؟ تلوار ہے۔ خودی کیا ہے؟ اس تلوار کی دھار۔ مراد یہ ہے کہ اگر زندگی کو تلوار مانا جائے تو خودی کو اس کی دھار کہنا چاہیے۔ جس طرح تیز دھار کے بغیر تلوار بیکار ہوتی ہے، اسی طرح خودی کے بغیر زندگی ہیچ ہے۔ غرض خودی زندگی کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو شخص خودی کو درجۂ کمال تک پہنچا لے، وہی انسانیت کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) خودی کیا ہے؟ زندگی کا چھپا ہوا بھید۔ خودی سے کیا مراد؟ کائنات کی

بیداری اور مستعدی۔

مطلب یہ کہ زندگی کا بھید خودی میں چھپا ہوا ہے۔ خودی ترقی کرے تو زندگی بھی ساتھ ہی ترقی کے درجے طے کرتی جاتی ہے۔ جس طرح انسان عقل و شعور کی بدولت اشرف المخلوقات ہے۔ اسی طرح کائنات خودی کے دم سے قائم اور بیدار ہے۔ انسان شعور سے محروم ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ کائنات خودی سے خالی ہو تو وہ بے مقصد اور بے معنی ہے۔ غرض خودی ساری دنیا سے بلند و برتر ہے۔

(۳) خودی کو جلوت بھی پسند ہے اور خلوت بھی۔ وہ دونوں صورتوں میں اپنا کمال دکھاتی ہے۔ جب پانی کا ایک قطرہ خودی کے جوہر دکھانے لگے تو سمندر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ خودی مادی دنیا کی تسخیر کے وقت جلوت میں نمودار ہوتی ہے اور روحانی دنیا میں اونچا درجہ حاصل کرنے کے لئے خلوت میں جا بیٹھتی ہے۔

(۴) خودی تاریکی اور روشنی دونوں جگہوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ کثرت میں بھی نمودار ہے اور وحدت میں بھی۔

مطلب یہ کہ جب خودی درجۂ کمال کو پہنچ جائے تو وہ روحانی نور کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مادی دنیا کی کوئی شے اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ اندھیرے اجالے سے آزاد اور بے پروا ہو کر جگہ دیکھ سکتی ہے۔ کثرت اور وحدت دونوں رنگوں میں اس کے جلوے نظر آتے ہیں۔

(۵) اگر خودی سے پہلے کے زمانے پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو اس کی کڑی

آغازِ عالم کے بے کنارہ وقت سے جا ملتی ہے یعنی اس کے پیچھے ازل ہوتی ہے اور اگر اس سے بعد کے زمانے پر غور و فکر کی جائے تو اس کا سلسلہ ہمیشگی یا قیامت سے جا ملتا ہے یعنی اس کے سامنے ابد ہوتی ہے۔ غرض خودی کے قبل اور بعد کے دونوں زمانوں کی کوئی حد و نہایت نہیں۔

(۶) خودی زمانے کے دریا میں بہتی اور کی لہروں کے ظلم سہتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ خودی زمانے سے بغل گیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ خودی سے زمانے کی اور زمانے سے خودی کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے۔

(۷) خودی تلاش کی راہیں اور نگاہیں لگاتار بدلتی رہتی ہے، یعنی جب خودی کمال کے درجے طے کرتی ہے تو اسے تغیر اور انقلاب کے گوناگوں راستوں میں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس پر رنگ برنگ کی حالتیں طاری ہوتی ہیں۔

(۸) جب خودی معراجِ کمال پر پہنچ جاتی ہے تو وہ بے پناہ طاقت حاصل کر لیتی ہے۔ بھاری پتھر اس کے لئے ہلکی سی چیز بن جاتا ہے۔ وہ حیرت انگیز قوت سے پہاڑ پر دم بدم ضربیں لگا کر اسے پیس ڈالتی اور چلنے والی ریت میں بدل دیتی ہے۔

(۹) خودی شروع بھی سفر ہی سے ہوتی ہے اور ختم بھی سفر ہی پر۔ اسی سفر میں اس کے پختہ ہونے اور باقی رہنے کا بھید چھپا ہوا ہے۔ اگر اس میں سفر اور گردش کے بجائے ایک جگہ قائم رہنے اور ٹھہر جانے کا رنگ پیدا ہو جائے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۱۰) خودی چاند میں کرن کی اور پتھر میں چنگاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ رنگ میں غوطہ لگا کر بھی بے رنگ ہی رہتی ہے۔ یعنی طرح طرح کی شکلوں اور رنگوں میں ظاہر ہونے کے باوجود شکل اور رنگ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا کیوں کہ یہ مادّی نہیں۔

(۱۱) خودی کو کمی زیادتی، اونچ نیچ اور آگے پیچھے سے کوئی واسطہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خودی مادّیت سے پاک ہے، لہٰذا اس میں مادّی چیزوں کی خاصیتیں قطعاً نہیں پائی جاتیں۔

(۱۲) جب سے دنیا پیدا ہوئی، اسی وقت سے خودی پر کھینچا تانی کی ضربیں لگ رہی ہیں، آخر وہ آدمی کی خاک میں نمودار ہو گئی۔ مراد یہ ہے کہ خودی آغاز عالم ہی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ آخر اس نے انسان کے جسم میں گھر بنا لیا۔

(۱۳) خودی کا مقام انسان کے دل میں ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آسمان آنکھ کے تل میں ہے۔

حاصل یہ کہ خودی کے رہنے کی اصلی جگہ دل کا گوشہ ہے اور اس کی بے حد و کنار پہنائیاں دل میں اسی طرح سمٹ آتی ہیں، جس طرح آنکھ کے اتنے سے تل میں آسمان سمٹ آتا ہے۔ یہ پیچ در پیچ گتھی وہی شخص سلجھا سکتا ہے، جو خودی میں ڈوب کر زندگی کا بھید پا جائے۔

ساتواں بند	فر و فال: شان و شوکت اور اقبال مندی۔ خاکدان:

لفظی معنی مٹی کا گھر، مراد دنیا۔ یلغار: ترکتاز، یورش، حملہ۔

(۱) جو شخص خودی کی حفاظت کرتا ہے، اس کے لئے وہ روٹی خالص زہر کا حکم رکھتی ہے جس سے اس کی آب و تاب قائم نہ رہے۔

مطلب یہ ہے کہ خودی کو معراج کمال پر پہنچانے کے لئے جائز اور حلال کمائی کا ہونا لازم ہے کیوں کہ ناجائز اور حرام کی روزی کمانے اور کھانے سے خودی مر جاتی ہے۔

(۲) خودی کے لئے وہی روٹی قدر و قیمت والی ہے جس سے جہان میں بلند مقام حاصل رہے۔

مراد یہ ہے کہ خودی حلال روزی ہی سے درجۂ کمال حاصل کر سکتی ہے۔ اور جائز کمائی ہی سے انسان اوج و اقبال اور عزت و عظمت کا مالک بن سکتا ہے۔

(۳) سلطان محمود کے شاہانہ ٹھاٹھ اور بخت بلند کا خیال چھوڑ دے۔ خودی کی حفاظت کر اور غلامی سے بیزار ہو جا۔

حاصل یہ کہ خودی کے مقابلے میں سلطنت کی بھی پروانہ کر۔ خودی کی دولت ان مول ہے، اسے کسی بھی قیمت پر ہاتھ سے نہ دے۔ جہاں تک ممکن ہو، یہ نایاب نعمت ہر قسم کی حرص سے بچا کر رکھ اگر تو اسے فروخت کر دے گا تو غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گا۔

(۴) وہ سجدہ ہر قسم کے اہتمام کا حق دار ہے، جسے ادا کرنے سے تمام سجدے تیرے لئے ناجائز اور حرام ہو جائیں۔

یعنی خودی اسی طرح مکمل ہوتی ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے سوا کسی کے

آگے سر خم نہ کیا جائے۔ بندگی، طاعت اور سجدہ صرف شہنشاہ حقیقی کے لئے زیبا ہے۔ غیر اللہ کی فرماں برداری، غلامی اور اس کے آستانے پر ماتھا رگڑنا سراسر حرام ہے۔

(۵-۶-۷) یہ جہان، یہ آواز و رنگ کا غلغلہ اور نقش گاہ۔ یہ جہان جو موت کے تابع فرمان ہے۔ یہ دنیا، یہ آنکھ اور کان کا بت خانہ جہاں زندگی کھانے پینے کے سوا کچھ نہیں۔ خودی کا سب سے پہلا مقام ہے۔ اے مسافر! نہ یہ تیرا دائمی گھر ہے، نہ منزل مقصود۔

(۸) تیری آگ خاک کے اس جہان سے نہیں۔ یہ عالم تجھ سے ہے، تو اس عالم سے نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تو اس مادی دنیا سے تعلّق نہیں رکھتا۔ تیری فطرت غیر مادّی ہے۔ تو اس دنیا کے لئے نہیں، بلکہ یہ دنیا تیرے لئے پیدا کی گئی ہے۔

(۹) اے انسان! آگ، پانی، مٹی، ہوا کی یہ دنیا، زمان و مکان کا گورکھ دھندا، یہ پہاڑ ہی پہاڑ توڑ کر آگے قدم بڑھائے جا۔ اور خودی کو معراج کمال پر پہنچا کر زمان و مکان کی زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔

(۱۰) خودی اللہ کا شیر ہے۔ سارا عالم اس کا شکار ہے۔ اس کی کمند آسمان اور زمین دونوں کی گردن میں ہے۔

مراد یہ ہے کہ جس نے اپنی خودی پایۂ تکمیل کو پہنچائی، اس نے ساری کائنات کو مسخر کر لیا۔

(۱۱) اس عالم فانی کے علاوہ ابھی اور بھی عالم ہیں جو نظر نہیں آتے۔

وجود کے ضمیر کا خالی رہنا ناممکن ہے، تُو خودی کو معراج کمال پر پہنچا۔ پھر تجھے دوسرے ان گنت عالم بھی دکھائی دیں گے۔

(۱۲) ان بے نمود اور نظر نہ آنے والے جہانوں میں سے ہر ایک تیری یورش اور دانش وسیرت کی شوخی کا منتظر ہے، یعنی ابھی تجھے متعدد دوسری دنیائیں مسخر کرنی ہیں۔

(۱۳) زمانے کے گھومنے پھرنے اور چکر لگانے کا مدعا یہ ہے کہ تجھ پر اپنی خودی کا بھید کھل جائے، یعنی نظام عالم کا مقصد یہ ہے کہ تو اپنی خودی کا راز پاکر اپنا سب سے اونچا مقام حاصل کر لے۔

(۱۴) میں تجھے کیا بتاؤں کہ تیری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ تو اچھی اور بُری چیزوں کے اس جہان پر فتح پانے والا ہے۔

حاصل یہ کہ اے انسان! تو بیدار بخت اور جواں نصیب ہے۔ اور تجھے پیدا کرنے سے خالق اکبر غرض یہ ہے کہ تو کائنات میں اس کی نیابت کے فرائض انجام دے کر ساری مخلوقات پر حکم چلائے۔

(۱۵) حقیقت پر قول و بیان کا جامہ تنگ ہے۔ حقیقت گویا ایک آئینہ ہے اور گفتگو اس کا زنگ۔

مطلب یہ کہ اے انسان! تیری حقیقت الفاظ میں بیان کرنا غیر ممکن ہے، کیونکہ حقیقت غیر مادّی ہے اور الفاظ مادّی۔ مادّی چیز غیر مادّی چیز کا مفہوم اور غایت کیوں کر ادا کر سکتی ہے؟

(۱۶) سانس کی شمع سینہ کے اندر جلوے برسا رہی ہے، لیکن بولنے

کی قوت تھک کر چور ہونے کے باعث بس بس کہ رہی ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو انسان عشق حق کی شراب سے مست ہو جائے۔ اسے دل کی خلوتوں میں محبوب حقیقی کی تجلی نظر آتی ہے لیکن اس کے لبوں پر خاموشی کی مُہر لگ جاتی ہے۔ وہ اس بھید کو کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا۔

(۱۷) اگر میری اڑان مقررہ حد سے بال برابر بھی اونچی ہو جائے تو نورِ مطلق کی آتشیں تجلی میرے بال پر جلا کر خاک کر دے۔

حاصل یہ کہ اگر کوئی خدادوست درویش نشۂ عشق حق کی سرمستی میں کوئی نامناسب حرکت کر بیٹھے تو محبوبِ حقیقی کی بے پناہ تجلی اسے جلا کر بھسم کر دیتی ہے

زمانہ

اس نظم میں زمانے کی کیفیت خود اس کی زبان سے پیش کی گئی ہے۔

حرف محرمانہ: نکتہ، رمز، بیتے کی بات۔ مقامر: جوا کھیلنے والا۔

(۱) زمانہ کہتا کہ جو کبھی موجود تھا، وہ اب ناپید ہے۔ جو موجود ہے، وہ بھی ناپید ہو جائے گا۔ چل چلاؤ اسی طرح جاری رہے گا۔ یہی ایک بیتے کی بات ہے زمانہ اسی کا انتظار شوق سے کرتا ہے، جس کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہو۔

(۲) صراحی کو دیکھو جس میں جو کچھ بھرا ہوتا ہے، تھوڑا تھوڑا نکلتا ہے اور ٹپکتا رہتا ہے۔ مجھے اگر صراحی فرض کر لیا جائے تو اس سے نئے نئے واقعات آہستہ آہستہ نکل نکل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ دن اور رات کا سلسلہ میری تسبیح ہے

اور میں دانہ دانہ گنتا رہتا ہوں یعنی کوئی واقعہ میری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہتا۔

(۳) ہر ایک سے میری جان پہچان ہے لیکن میرے سلوک کے طریقے سب کے ساتھ جدا جدا ہیں۔ کسی پر میں خود سوار رہتا ہوں۔ کوئی زبردست شخصیت مجھ پر سواری جمالیتی ہے۔ کسی کے لئے میں عبرت کا تازیانہ بن جاتا ہوں۔

مراد یہ ہے کہ اکثر لوگ میرے پیچھے چلتے ہیں اور زندگی میں عموماً نامراد رہتے ہیں کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہیں جو مجھے اپنے پیچھے چلاتی ہیں اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جن کی حالت دیکھ کر دنیا کو عبرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(۴) میری محفل میں ہر وقت شراب کا دور چلتا رہتا ہے۔ اے مخاطب! اگر تو کسی موقع پر اس محفل میں شریک نہ ہو تو قصور تیرا ہے، میرا نہیں۔ میرا دستور ہرگز یہ نہیں کہ جو شخص محفل شریک نہ ہو، اس کے لئے شراب بچا کر رکھ لوں تاکہ جب آئے، پی لوں۔

مطلب کہ جو شخص اس دنیا میں فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، اس کا فرض ہے کہ ایک لمحے کے لئے بھی غفلت نہ کرے اور فرصت کا جو وقت ملتا ہے اسے پیش نظر مقاصد کے لئے جد و جہد میں لگائے رکھے جو غفلت کرے گا، وقت سے فائدہ نہ اٹھائے گا، وہ مراد سے محروم رہے گا۔ میں موقع کسی کے لئے اٹھا نہیں رکھتا۔

(۵) نجومی کی نظر ستاروں پر جمی رہتی ہے۔ وہ انہیں کی گردش سے پیش آنے والے حالات کے متعلق قیاس اور اندازے کرتا ہے۔ وہ میری حقیقت کو کیا پہچان سکتا ہے؟ ستاروں کی گردش میری حقیقت کو سمجھنے کا معیار نہیں۔

بن سکتی جس شخص کی نظر حقیقت کی اندازہ شناس نہ ہو اور جسے معرفت کا مقام حاصل نہ ہو، اس کا تیر کبھی نشانے پر نہیں بیٹھ سکتا۔

(۶) زمانہ اپنی حقیقت بیان کرتے ہوئے دفعتہً یورپ کے حالات کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے، مغرب کے افق پر جو شفق پھولی ہوئی نظر آتی ہے، وہ شفق نہیں، لہو کا دریا ہے۔ تو انتظار کر کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ گزشتہ کل اور آج کو محض افسانہ سمجھ لے، اس لئے کہ جو کچھ ہو چکا اس سے ہم صرف عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ رونے اور افسوس کرنے سے اسے بدل نہیں سکتے۔

(۷) آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ یہ کہ جس گستاخ عقل نے فطرت کی قوتوں کو بے نقاب کیا، اس کا ٹھکانا اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطرے میں پڑ گیا۔ یعنی یورپ کے سائنس دانوں نے کھوج لگا کر ایسی ہولناک چیزیں ایجاد کر لیں جو پہلے کسی کو معلوم نہ تھیں لیکن وہی ہولناک چیزیں خود ان کے لئے تباہی کا باعث بن گئیں۔

اقبال نے یہ شعر اس زمانے میں کہا تھا جب یورپ ان خوفناک قوتوں سے آشنا بھی نہ ہوا تھا جو دوسری جنگ عظیم کے آخری دور میں ایجاد ہوئیں یعنی ایٹم بم۔ لیکن دیکھئے اقبال کی فکر سلیم نے کس معجز نما پیش بینی سے آنے والے حالات کا اندازہ کر لیا۔

(۸) بے شک آج وہ ہواؤں، فضاؤں اور سمندروں پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے ہوائی جہاز اور بحری جہاز ہر جگہ چکر لگا رہے ہیں، لیکن بھنور کی گرہ نہیں کھل سکتی کیوں کر کھلے؟ یہ تو قدرت نے ان کی تباہی کے لئے ایک پھندا تیار

کر رکھا ہے یعنی اہل یورپ کی کوئی ایجاد انہیں تقدیر کی زد سے بچا نہیں سکتی۔

(۹) وہ پرانی دنیا راہی ہے جسے یورپ کے جواریوں نے جوئے کا مرکز بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ نے ساری دنیا کو جوئے کا مرکز بنا دیا۔ سرسری نظر سے دیکھو، ان کی گھڑدوڑیں جوا، کلبوں کی تفریحات جوا، اخباروں کے معمے جوا، تجارت میں سٹّہ جوا، لاٹری جوا، کھیل تماشا مثلاً کارنیوال جوا۔ غرض زندگی کی کوئی شاخ نہیں جس میں جوا نہ ہوتا ہو۔ ایسی دنیا کب تک زندہ رہ سکتی تھی؟ یقیناً وہ مر رہی ہے۔ اور جن قوموں یا جماعتوں نے یورپی تمدن کی تقلید میں اہل یورپ کے طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں، وہ بھی بچ نہیں سکتیں۔ نیا جہان کیسا ہوگا؟ اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن وہ ان لعنتوں اور مصیبتوں سے یقیناً پاک ہوگا جو یورپی تہذیب کی وجہ جگہ جگہ مسلط ہوئیں۔

(۱۰) ہوا اگرچہ تیز و تند ہے، لیکن جس درویش کو خدا نے بادشاہی کے انداز اور سلطانی کے طور طریقے عطا کئے ہیں، اس نے اپنا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ ہوا کی کوئی تیز لہر اس کے چراغ کو مدھم نہیں کر سکتی۔ یہ اشارہ اقبال نے اپنی طرف کیا ہے۔

فرشتے آدم کو جنّت سے رخصت کرتے ہیں

اس نظم میں انسان کے فطری کمالات فرشتوں کی زبان سے بیان کئے گئے ہیں اور اس کے لئے موقع وہ تجویز کیا ہے جب آدم جنت سے رخصت ہو رہے تھے۔ اقبال نے اس موضوع پر متعدد نظمیں لکھی ہیں اور خود آدم کے قصّے پر اپنے لیکچروں میں بھی مفصل بحث کی ہے۔ ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج یہاں پیش نہیں کئے جا سکتے بلکہ "پیام مشرق" کی شرح میں پیش کئے جائیں گے، جہاں اس موضوع پر انہوں نے مسلسل اظہار خیال کیا ہے۔

شکرِ خوابی: میٹھی نیند۔

(۱) فرشتے کہتے ہیں، اے انسان! قدرت نے تجھے رات دن کی بیتابی اور بے قراری عطا کر دی ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ تو مٹّی سے بنا ہے یا پارے سے؟

رات دن کی بیتابی عشق کا نشان، فرشتے یہ کہہ رہے ہے کہ قدرت نے انسان کی فطرت میں عشق کا جذبہ رکھ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ محبوب حقیقی کی تلاش میں رات دن بیتاب و بے قرار رہتا ہے۔

(۲) ہم نے سنا ہے کہ تجھے مٹّی سے پیدا کیا گیا ہے لیکن تیری فطرت پر نظر ڈالیں تو اس میں تاروں اور چاند کی سی چمک دمک اور ویسی ہی بلندی نظر آتی ہے۔

مطلب یہ کہ انسان اگرچہ مٹّی سے پیدا ہونے کے باعث چنداں بلند پایہ نظر نہیں آتا۔ لیکن قدرت نے اس میں معنوی ترقی کے ایسے جوہر

رکھ دیئے تھے جو ابھی تک انتہائی درجے پر نہیں پہنچے اور ترقی کا سلسلہ جاری ہے۔

(۳) خدا نے تجھے وہ کمالات عطا کئے ہیں کہ اگر ان کا جلوہ خواب میں بھی دیکھ لے تو تیری میٹھی نیند ہزار بیداریوں پر بھی فوقیت لے جائے

(۴) صبح کے وقت تیرا خدا کی بارگاہ میں رونا اور گریہ وزاری کرنا بہت بیش قیمت چیز ہے۔ اسی گریہ وزاری کی برکت سے تیری زندگی کا پرانا درخت شاداب اور تر و تازہ رہتا ہے۔

(۵) تیرے ہی نغمے سے زندگی کے ضمیر کا چہرہ بے نقاب ہوا ہے اور قدرت نے تیرے ہی ساز کو اپنی مضراب سے بجایا ہے۔ یعنی تیرے کمالات کی نمائش کے لئے قدرت نے جو انتظام اور اہتمام کئے۔ وہ کسی دوسرے وجود کے لئے نہ کیے گئے۔

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

آدم جنت سے رخصت ہوئے تو فرشتوں نے ان کے فطری کمالات کے گن گائے تھے۔ اب زمین کی روح ان کا خیر مقدم کرتی ہے۔ وہ بھی آدم کی عظمت و برتری کے اعتراف میں فرشتوں سے پیچھے نہیں، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی جاتی ہے کہ دنیا میں اس کے لئے جد و جہد کے کیسے کیسے مرحلے پیش آنے والے ہیں۔

بیم و رجا: خوف اور امید۔ نا آئندہ: لفظی معنی نہ آنے والا، مراد بچنے والا۔

پہلا بند | زمین کی روح کا خطاب آدمؑ سے اس وقت شروع ہوتا ہے، جب اس میں شعور بیدار ہوا تھا۔ روح کہتی ہے، اے انسان! آنکھیں کھول یہ تیرے سامنے زمین ہے، آسمان ہے، فضا ہے، ان پر نظر ڈال، یہ دیکھ مشرق کی جانب سورج طلوع ہو رہا ہے اور یہ نظّارہ قابل دید ہے۔ یہ جتنے نظّارے تیرے سامنے ہیں! ان سب پر نظر ڈالتے ہی تجھ میں اس پاک ذات کا احساس پیدا ہوا ہوگا جس نے یہ سب کچھ بنایا۔ تو ان نظّاروں کے پردے میں اسی کا جلوہ بے پردہ دیکھے گا۔ تو محبوب حقیقی سے جدا ہو چکا، یہ زندگی تیرے لئے جدائی کا زمانہ ہے۔ اس میں تجھے ظلم و ستم کا تختہ مشق بننا پڑے گا۔ یہ منزل بے قراری سے طے نہیں ہو سکتی۔ تجھے صبر سے کام لے کر خوف اور امید کا یہ معرکہ دیکھنا ہوگا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

اس زندگی کو خوف و امید کا معرکہ اس لئے قرار دیا کہ اس میں ہر وقت دونوں قسم کی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ انسان جس کام میں ہاتھ ڈالے، اس میں دونوں صورتیں پیش آسکتی ہیں۔ کامیابی بھی اور ناکامی بھی۔ کامیابی امید ہے اور ناکامی خوف۔

دوسرا بند | یہ بادل، یہ گھٹائیں، یہ آسمانوں کے گنبد، یہ سنسان فضائیں، پہاڑ، بیابان، سمندر، ہوائیں، غرض سب چیزیں خدا نے تیرے قبضے میں دے دی ہیں۔ کل تک تو فرشتوں کی ادائیں دیکھنے میں مگن تھا، آج زمانے کے آئینے میں اپنی ادائیں دیکھ۔

تمام چیزیں انسان کے قبضے میں دے دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ

تمام چیزیں انسان زندگی کے مقاصد پورے کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ گھٹائیں برستی ہیں کہ زمین سرسبز و شاداب رہے۔ جانوروں کے لئے چارا پیدا ہو، کھیتیاں لہلہائیں، انسان کے لئے غذا کا انتظام ہوتا ہے۔ پہاڑ، بیابان، سمندر، ہوائیں سب اپنی اپنی جگہ یہی کام انجام دے رہی ہیں۔ یہ سامان موجود نہ ہوتے تو انسان اس دنیا میں زندہ نہ رہ سکتا۔

تیسرا بند تو ابھی اس دنیا میں آیا ہے۔ وہ وقت دور نہیں، جب زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے سمجھے گا۔ آسمان کے ستارے بلندیوں سے تیرے کمالات کے جوہروں کا نظارہ کریں گے۔ تیرے خیالات کا سمندر اتنا وسیع ہے کہ اس کے کناروں کا پتا نہیں لگایا جا سکتا۔ تیرے سینے سے آہیں اٹھیں گی، ان کے شرارے آسمان تک پہنچیں گے۔ تو اپنی خودی کو استوار کرلے، پھر دیکھ کہ تیری کامیاب آہ کیا اثر پیدا کرتی ہے۔

چوتھا بند قدرت نے دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی چمک دمک تیری چنگاری میں رکھ دی ہے۔ تجھے وہ ہنر عطا کیا ہے جو نیا جہان پیدا کرسکتا ہے۔ تیری غیرت و حمیت بخشی ہوئی جنتیں قبول نہیں کرسکتیں۔ تیری محنت و مشقت میں نئی جنت چھپی ہوئی ہے۔ اے خاک کے پتلے! تو لگاتار کوشش کا صلہ دیکھ۔

مطلب یہ کہ انسان میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی قوتیں جمع کردی ہیں، وہ خدا کے حکموں کے مطابق ان سے کام لے اور جدوجہد میں لگا رہے تو اس کی ترقیات کے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔ دیکھئے انسان کی محنت سے کس طرح

بیابان گلزار بن گئے اور اس دنیا کی کایا پلٹ گئی۔

پانچواں بند | تیرے ساز کا ہر تار دنیا کی پیدائش کے وقت سے نغمے گا رہا ہے۔ تو ہی عشق کی جنس کا خریدار ہے۔ تو ہی اسرار کے بت خانے کا پیر و مرشد ہے۔ تو محنت و مشقت اٹھاتا ہے۔ اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے اور کسی کو نہیں ستاتا۔ تیری ہی مرضی دنیا کی تقدیر پر سوار ہے یعنی اس تقدیر کو چلا رہی ہے۔

قطعہ

میری فطرت صبح کی نسیم کی مانند ہے۔ وہ کبھی آہستہ چلتی ہے کبھی تیز۔ میں لالے اور گلاب کے پھول کو اطلس کا لباس پہناتا ہوں اور کانٹے کی نوک کو سوئی کی طرح تیز کرتا ہوں۔

پیر و مرید

اس مکالمے میں اقبالؔ نے مولانا رومؒ کی زبان سے بعض مسائل کی حقیقت بیان کی ہے اور اس سلسلے میں مثنوی کے مختلف اشعار کی بھی صحیح شرح فرما دی ہے۔

(۱)

مرید ہندی: حقیقتوں کی پہچاننے والی آنکھ سے اس لئے خون کی

ندّی یہ وہی ہے کہ موجودہ زمانے کے علوم نے دین کو خوار و خستہ کر دیا ہے۔ فرمائیے، علاج کی کیا صورت ہے؟

پیرِ رومیؒ: اگر تو علم کو تن پروری کے لئے استعمال کرے گا تو وہ سانپ بن کر ڈس لے گا۔ اگر تو علم کے ذریعے سے اپنا باطن آراستہ کرے گا تو وہ تیرے لئے دوست اور رفیق کا کام دے گا۔

مراد یہ ہے کہ علم کو ظاہری آسائش یا آرائش کے لئے استعمال نہ کرنا چاہیئے، بلکہ اس سے دل و دماغ کی آرائش کا کام لینا چاہیئے۔ اگر مغربی علوم سے بھی یہی کام لیا جائے تو وہ انسانیت کے لئے رحمت کا باعث بن جائیں۔ مصیبت یہ ہے کہ انہیں غلط طریق پر استعمال کیا جا رہا ہے، لہٰذا وہ دینی نقطۂ نگاہ سے مصیبت کا باعث بن گئے ہیں اور اب تو لوگ دنیوی نقطۂ نگاہ سے بھی ان علوم پر لعنت بھیج رہے ہیں۔

(۲)

مریدِ ہندی: اے دردمند عاشقوں کے امام! تیرا یہ پر معنی قول مجھے یاد ہے کہ ساز کا مغز خشک ہوتا ہے، تار خشک ہوتے ہیں، ڈھانچا خشک ہوتا ہے پھر اس میں سے وہ نغمے کیوں کر پیدا ہوتے ہیں جو محبوبِ حقیقی کی یاد تازہ کرتے ہیں؟

موجودہ دور ساز کی آواز پرست ہے لیکن وہ کیف و سرور سے بے بہرہ ہے۔ نہ اس کے قدم راہِ حق پر جمے ہوئے ہیں، نہ اس میں یقین کا شمہ نظر آتا ہے، نہ اسے حضوری کا ذوق نصیب ہے۔ وہ کیا جانے کہ اصل بھید کیا ہے۔ دوست کون ہے اور دوست کی آواز سے کیا مراد ہے؟ افسوس کہ یورپ والوں نے

علوم وفنون کی روشنی سے بظاہر ترقی کر لی اور ان میں چمک دمک بھی پیدا ہو گئی لیکن نغمہ انہیں خاک ہی کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے، آسمان کی طرف نہیں یعنی وہ نیچے ہی گرے جاتے ہیں۔ زمین ہی کی چیزوں میں انہوں نے دل اٹکا رکھے ہیں، اپنے خالق ومالک سے تعلق پیدا نہیں کرتے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

پیر رومی: ہر وجود اس بات پر قادر نہیں کہ نغمے سے صحیح فائدہ اٹھائے، دیکھو، انجیر ہر پرندے کی غذا نہیں۔

مراد یہ ہے کہ جس طرح انجیر جیسا لذیذ پھل ہر پرندہ نہیں کھا سکتا، اسی طرح موسیقی سے صحیح فائدہ بھی ہر شخص نہیں اٹھا سکتا۔ یورپ کی کم نصیبی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حقیقی سماع کا اہل نہ بنا سکا۔

(۳)

مرید ہندی: میں نے مشرق و مغرب کے تمام علم پڑھ لئے، لیکن ان علوم سے روح کے غم اور دکھ کا مداوا نہ ہو سکا۔ کھٹک اب تک چلی جا رہی ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے کس کے پاس جاؤں؟

پیر رومی: ہر نااہل کا ہاتھ تجھے بیمار کرے گا۔ ماں کی طرف آ اسی کی تیمارداری سے تجھے شفا ہو گی۔

مراد یہ ہے کہ صرف علوم وفنون پڑھ لینے سے کبھی کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوا روح کی کھٹک کا علاج وہی کر سکتے ہیں، جنہیں خدا نے انسانوں کی صحیح تربیت کے لئے بھیجا ہو جس طرح ماں بچے کی تربیت کرتی ہے، یعنی اہلِ حق۔

(۴)

مرید ہندی: اے میرے پیرو مرشد! آپ ہی کی نگاہ سے میرے دل کی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ مہربانی فرما کر یہ بھی بتا دیجیے کہ حکم جہاد میں خاص نکتہ کیا ہے؟

پیر رومیؒ: جہاد یہ ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے نقش کو خدا کے حکم کے مطابق مٹا دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں دوست کے کانچ پر دوست کا پتھر مارا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ سلسلے دو ہیں: ایک جسے ہم اصطلاح میں سلسلۂ تکوین کہتے ہیں، یعنی خدا کا مختلف چیزیں بنانا اور پیدا کرنا۔ دوسرا سلسلہ امر کا ہے یعنی خدا کے حکموں کا پابند رہنا۔ اس دنیا میں جو کچھ موجود ہے، وہ تکوین کا کرشمہ ہے۔ انسان کا فرض یہ ہے کہ خدا نے جو حکم دے دیئے، ان کی پیروی کرے اور انہیں کے مطابق تکوین میں رد و بدل کرنا چاہئے۔ باطل قوتیں تکوین میں خدا کی مخلوق ہیں، لیکن عالم امر میں ان سے تصادم کا موقع آجائے تو انہیں مٹا دینے میں دریغ نہ ہونا چاہیئے، اس لیے کہ خدا کا حکم یہی ہے۔ مانا کہ کانچ دوست نے پیدا کیا، لیکن اگر دوست کہتا ہے کہ اس پر پتھر مارو تو اس حکم کی تعمیل میں تامل غیر مناسب ہوگا۔

(۵)

مرید ہندی: مشرق والوں کی نگاہیں یورپ کی تہذیب اور اس کے ظاہری حسن و جمال پر فریفتہ ہو رہی ہیں۔ انہیں یورپ کی حسین و جمیل عورتیں جنت کی حور سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔

پیر رومیؒ: چاندی ظاہر میں اگرچہ سفید چمکیلی اور نئی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سے ہاتھ اور کپڑے سیاہ بھی ہو جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ چیزوں کی ظاہری حالت پر نہ جانا چاہئے۔ ان کی حقیقی حیثیت پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ یورپ کی حسین وجمیل عورتیں کتنی ہی کشش کا باعث ہوں، لیکن اگر چاندی کی طرح وہ قلب و روح کی سیاہی کا باعث بنیں تو ان پر فریفتہ ہونا سراسر نقصان کا باعث ہے۔

(۶)

مرید ہندی: افسوس کہ ہماری درس گاہوں میں جو نوجوان تعلیم پا چکے ہیں اور ان کا خون گرم ہوتا ہے۔ یعنی انہیں اپنے جذبات پر قابو حاصل نہیں ہوتا۔ وہ فرنگستانی جادوگروں کا شکار ہو گئے ہیں اور انہیں کے طور طریقوں پر مٹے جا رہے ہیں۔

پیر رومیؒ: جس پرندے کے پر نہ نکلے ہوں، وہ اڑے گا تو ہر پھاڑنے والی بلی کا لقمہ بن جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ نوجوانوں کو یورپی علوم و تہذیب کے برے اثرات سے بچانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انہیں صحیح دینی تربیت دی جائے۔ یہی تربیت ان کے لئے پروں کا کام دے گی اور وہ اڑیں گے تو کسی کا لقمہ نہ بن سکیں گے۔

(۷)

مرید ہندی: یہ دین اور وطن کی لڑائی کب تک جاری رہے گی؟

گیا یہ سمجھا جائے کہ جسم کو جان پر سبقت حاصل ہے؟ یعنی دین کی حیثیت جان کی ہے اور جان کے بغیر جسم بالکل بے حقیقت رہ جاتا ہے۔

پیر رومیؒ: رات کے وقت کھوٹا سکہ سونے کی برابری کا دم بھرنے لگتا ہے، اس لئے کہ تاریکی میں کھرے کھوٹے کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ سونا اپنی حقیقت نمایاں کرنے کے لئے اس امر کا انتظار کرتا ہے کہ دن کی روشنی نمودار ہو اور حقیقت سب پر ظاہر ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ آج کل نگاہوں پر چکا چوند طاری ہے۔ اس میں کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں ہو سکتی اور کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا کہ دین کا درجہ کیا ہے اور وطن کو کس مقام پر رکھنا چاہیئے؟ ضروری ہے کہ چکا چوند کا یہ دور ختم ہو، حقیقت حال سب پر آشکارا ہو جائے۔ اسی وقت معلوم ہو گا کہ وطنیت کھوٹا سکہ ہے اور دین کی حیثیت کھرے سونے کی ہے۔

(۸)

مرید ہندی: اے میرے پیرو مرشد! مجھے انسان کی حقیقت سے آگاہ کیجیے۔ میں خاک کا ایک ذرہ ہوں اس آگاہی سے مجھے سورج اور چاند کے رتبے پر پہنچا دیجیے۔

پیر رومیؒ: انسان کا ظاہر اتنا بے حیثیت ہے کہ ایک مچھر بھی اسے چکر میں لا سکتا ہے اور دم بھر کے لئے بھی چین نصیب نہیں ہونے دیتا، لیکن اس کے باطن میں خدا نے ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں کہ وہ ساتوں آسمانوں پر چھا سکتا ہے۔

اس سلسلے کی ایک مشہور تاریخی مثال نمرود کی ہے جس کی زندگی ایک مچھر نے اجیرن کر دی تھی اور بادشاہی شان و شوکت اسے کوئی مدد نہ دے سکی۔ دوسری مثال حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ہے، جو تفصیل سے بے نیاز ہے۔

(۹)

مرید ہندی: اے پیرومرشد! آپ کو خدا نے وہ صلاحیت عطا کی ہے کہ اپنے نور سے مٹّی کے پتلے کی آنکھیں روشن کر سکتے ہیں۔ مجھے بتایئے کہ انسان کا مقصد اس دنیا میں حقیقتوں کا بالواسطہ علم حاصل کر لینا ہے یا ان حقیقتوں کو بلاواسطہ دیکھنا؟

پیر رومیؒ: اصل انسانیت محض دیدار ہے، باقی جو کچھ ہے، وہ محض چھلکا ہے۔ دیدار سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ محبوب حقیقی کے جمال سے آنکھیں روشن ہوں۔

(۱۰)

مرید ہندیؒ: اے میرے پیرومرشد! مشرق کے باشندے تیرے کلام سے زندگی کی حرارت حاصل کرتے ہیں۔ یہ تو فرمایئے کہ کونسی بیماری قوموں کے لئے موت کا پیغام بنتی ہے؟

پیر رومیؒ: پہلے جو امتیں ہلاک ہوتی رہیں، ان کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے پتھر کو عود سمجھ لیا۔

عود اگرچہ پتھر سے ملتا جلتا ہے، لیکن اس میں اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہوتی ہے۔

اسے جس مقام پر جلایا جائے، وہ خوش بو سے بھر جاتا ہے۔ پتھر میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی۔ مولانا کی مراد یہ ہے کہ بے جوہر شے کو جوہر دار سمجھ لینا ذہن و بصیرت کی موت کا ثبوت ہے۔ جن قوموں کے ذہن و بصیرت کی یہ حالت ہو جائے، وہ زندہ کیوں کر رہ سکتی ہیں؟

(۱۱)

مرید ہندی: اب مسلمان میں پہلے کی سی ظاہری اور باطنی حالت باقی نہیں رہی۔ دنیوی شان و شوکت بھی جاتی رہی۔ دماغی اور روحانی کمالات بھی زائل ہو گئے۔ اے میرے پیر و مرشد! اس کا لہو کیوں سرد ہو گیا؟ اس کی قوّتِ عمل کیوں افسردہ ہو کر رہ گئی؟

پیر رومی: جب تک کسی مقبول بندے کا دل نہ دکھے، خدا کسی قوم کو رسوا اور ذلیل و خوار نہیں کرتا۔ بظاہر اس سے یہ مراد ہے کہ مسلمان قوم مدّت دراز سے خدا کے سچے بندوں کا دل دکھاتی چلی آئی ہے اور اس کی سزا پا رہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن اہلِ حق نے اسلامی حکومتوں میں اسلام کی خاطر تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں امّت کے امام بھی ہیں، علمائے کرام بھی اور صوفیائے عظام بھی۔ ایسے واقعات پر قدرت کی طرف سے جو سزا ملتی ہے، وہ حقیقۃً کسی فرد کو دکھ پہنچانے کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ اس سچائی اور صداقت سے دشمنی ہوتی ہے، جس کا پیکر وہ مردِ حق ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قوم کو سچائیوں سے کوئی محبّت و الفت نہیں۔ یہی رسوائی یا منصبِ عزّت سے محرومی کا سبب ہوتا ہے۔

(۱۲)

مریدِ ہندی: اگرچہ یہ دنیا فانی ہے اور اس کے بازار کی رونق بالکل عارضی ہے، اس لئے اسے رونق نہ کہنا چاہیئے۔ تاہم یہ فرمادیجئے کہ یہاں مردانِ حق کو کس سودے سے نفع حاصل ہو سکتا ہے؟ یعنی انہیں کیا دینا چاہیئے اور کیا لینا چاہیئے۔

پیر رومیؒ: مردانِ حق کو چاہیئے کہ دانائی بیچیں اور حیرانی خریدیں، اس لئے کہ دانائی محض وہم و گمان ہے اور حیرانی معرفت۔

دانائی سے یہاں بظاہر عقل مراد ہے اور حیرانی سے عشق۔

(۱۳)

مریدِ ہندی: میرے تمام ساتھی اور ہم مجلس بادشاہوں کے مصاحب بن گئے ہیں۔ میں وہ فقیر ہوں جس کا سر کلاہ سے اور بدن گدڑی سے بھی محروم ہے۔ یعنی باقی لوگوں نے بڑے بڑے منصب لے لئے، مجھے عام ضروریات کی طرف سے اطمینان نہ ہوا۔

پیر رومیؒ: بادشاہوں کی مجلس میں بیٹھنے سے کہیں بہتر ہے کہ تو کسی روشن ضمیر آدمی سے فیض حاصل کرے اور اسی کی مریدی اختیار کرلے۔

(۱۴)

مریدِ ہندی: اے میرے پیرومرشد! آپ کو غزوۂ بدر کے خاص خاص اور ممتاز اصحاب کے ذوق شوق سے حصہ نصیب ہوا ہے۔ میں اب تک جبر و قدر کی حقیقت نہیں سمجھ سکا۔ یعنی انسان کے مجبور اور مختار ہونے کا

مسئلہ میرے ذہن نشیں نہیں ہوا مہربانی فرما کر یہ تو سمجھا دیجئے۔

پیر رومیؒ: قدرت نے باز اور کوّے دونوں کو بال و پر عطا کئے ہیں۔ لیکن باز کو بال و پر بادشاہ کی طرف لے جاتے ہیں اور کوّے کو قبرستان میں پہنچا دیتے ہیں۔ باز کو بادشاہ پالتے ہیں تاکہ ان سے شکار کا کام لیں، کوّے پیٹ پالنے کے لئے مردار کی تلاش میں رہتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ قدرت نے اڑنے کی قوّت دونوں کو عطا کی۔ اس بنا پر دونوں مختار ہوئے۔ لیکن دونوں کا ذوق الگ الگ ہے۔ ایک بلند پروازی و خوش ذوقی کی بدولت انتہائی عزّت پاتا ہے۔ دوسرا پست فطرتی اور دوں ہمتی کے باعث خوار و ذلیل رہتا ہے۔ قدرت نے دونوں کے لئے اڑنے کا سامان مہیّا کر دیا لیکن دونوں کی اڑان کا مقصد الگ الگ ہو گیا، جیسے اہلِ حق اور اہلِ باطل دونوں کے پاس تلوار ہوتی ہے لیکن ایک تلوار صرف حق کے لئے چلتی ہے اور دوسری تلوار صرف باطل کی خدمت کے لئے بے نیام ہوتی ہے۔

(۱۵)

مریدِ ہندی: اے میرے پیر و مرشد! یہ تو بتایئے کہ ہمارے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دین کی غرض و غایت اور مقصد کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ بادشاہی و حکمرانی کا سلسلہ استوار کیا جائے؟ یا یہ ہے کہ دنیا کو ترک کر کے گوشہ گیری اور درویشی اختیار کر لی جائے؟

پیر رومیؒ: ہمارے دین میں حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ جہاد کیا جائے۔

اور حکومت حاصل کی جائے۔ حضرت مسیحؑ کے دین میں حالات ہی کا تقاضا یہ ہوا کہ دنیا سے الگ ہو کر پہاڑوں اور غاروں میں پناہ لی جائے۔

مراد یہ ہے کہ درویشی اور ترک دنیا یا حکومت اور فرماں فرمائی بجائے خود کوئی نصب العین نہیں۔ اصل مدعا یہ ہے کہ خدا کا دین سب تک پہنچایا جائے اور اس کی پابندی میں فرق نہ آئے، البتہ ماحول کی بنا پر مشغلے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

(۱۶)

مرید ہندی: یہ تو فرمائیے کہ انسان جسمانی خواہشات پر کیوں کر غالب آسکتا ہے اور آب و گل پر کیوں کر قابو پا سکتا ہے تاکہ دل سینے میں بیدار ہو جائے اور اس میں زندگی کی نئی روح پھونکی جائے؟

پیر رومیؒ: تو خدا کا سچا بندہ بن اور گھوڑے کی طرح زین پر چل۔ یعنی جس طرح گھوڑا سوار کے اشاروں پر چلتا ہے، اسی طرح تو بھی خدا کے دیئے ہوئے حکموں کا پابند رہ اور محنت اور مشقت میں کوئی کمی نہ آنے دے۔ اس جنازے کی شکل اختیار نہ کر، جو دوسروں کی گردن کا بوجھ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا کے حکموں کا پابند اور خود دار بننا چاہیے دوسروں کے سہارے زندگی بسر نہ کرنا چاہیے۔

(۱۷)

مرید ہندی: دین ہی کا بھید سمجھ میں نہیں آتا قیامت کا یقین کس طرح آئے۔

مطلب یہ کہ جب تک دین کی حقیقت سے آگاہی نہ ہو، یہ یقین کیوں کر ہو سکتا ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور مردوں کے زندہ ہونے پر ان کے اعمال کا حساب ضرور لیا جائے گا؟

پیر رومیؒ: تو خود قیامت ہو جا اور قیامت کو دیکھ لے۔ ہر چیز کے دیکھنے کی شرط یہی ہے۔

مراد یہ ہے کہ اپنے اندر وہ انقلاب پیدا کر لے جو قیامت اس دنیا میں پیدا کرے گی۔ اس کے بعد تجھے خود بخود قیامت کا یقین ہو جائے گا۔

(۱۸)

مرید ہندی: بے شک خودی میں ایسی قوت ہے کہ وہ آسمان پر پہنچ کر سورج اور چاند کا شکار کر سکتی ہے یعنی جب خودی اپنی قوت کے بل پر فروغ حاصل کر لیتی لیکن اسے حضوری کا شرف حاصل نہیں ہوتا اور فراغت میسر نہیں آتی تو وہ اپنے شکاروں ہی کے ہاتھوں پریشان حال، مصیبت زدہ رہتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ خودی کے لئے محض فروغ حاصل کر لینا کوئی کمال نہیں۔ لازم ہے کہ وہ خدا سے گہرا تعلق پیدا کرے اس کے احکام کے مطابق چلے۔ اس کی بارگاہ میں شرف حضوری حاصل کرے۔ اسی طرح اس کا فروغ پائدار ہو سکتا ہے اور اسے فراغت میسر آسکتی ہے۔ اس کی بہترین مثال آج کل کا یوروپ ہے جس نے قوت کے بل پر فروغ حاصل کیا۔ یہ فروغ نہ پائدار رہ سکا۔ نہ یورپی قوموں کو باہمی لام و پیکار سے نجات مل سکی۔ محکوم قومیں اٹھ کر ہر لحظہ ان کے لئے مصیبت بنی رہیں۔

پیر رومی: اگر شکار کے لائق کوئی چیز ہے تو صرف عشق حقیقی ہے لیکن یہ شکار کسی کے جال میں کب سما سکتا ہے؟

(۱۹)

مرید ہندی: آپ پر دنیا کے تمام بھید روشن ہیں۔ یہ فرمائیے کہ قومی زندگی کیوں کر پختہ و مستحکم ہو سکتی ہے؟

پیر رومی: اگر تو دانہ بنے گا تو پرندے تجھے چگ لیں گے۔ اگر تو کلی کی شکل اختیار کرے گا تو بچے تجھے نوچ پھینکیں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ دانہ چھپا لے اور سراپا جال بن جائے۔ کلی کو پوشیدہ کرے اور کوٹھے کی سبزی ہو جائے۔

مطلب یہ کہ برباد کرنے والوں کی دسترس سے باہر رہنا چاہیے۔ دانہ پوشیدہ ہوگا تو جو بھی جال میں آئے گا، وہ خود پھنس جائے گا۔ اسی طرح کوٹھے کی سبزی تک ہر شخص کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ قومیں اسی طرح مضبوط و مستحکم ہوتی ہیں کہ اپنے بچاؤ کی تمام ممکن تدبیریں ہر لحظہ منظور نظر رکھیں۔

(۲۰)

مرید ہندی: آپ یہ کہتے ہیں کہ دل کو ڈھونڈ۔ آپ ہی کا ارشاد ہے کہ دل کا طلب گار رہ اور اس سلسلے میں جو مزاحمتیں پیش آئیں، ان کے مقابلے کی تیاری کر۔ میرا دل میرے سینے میں موجود ہے اور میرا جوہر میرے آئینے میں چمک رہا ہے۔

پیر رومی: تو یہ کہتا ہے کہ میرے پاس بھی دل ہے، حالانکہ دل گوشت کے

اس ٹکڑے کو نہیں کہتے جو پہلو میں دھڑکتا رہتا ہے۔ دل عرش پر رہتا ہے، نہ کہ بستی میں۔ یعنی اس کا تعلق خدا سے ہوتا ہے، نہ کہ دنیا سے۔ تو نے میرے قول کو غلط سمجھتے ہوئے اپنے دل کو دل قرار دے لیا۔ میری مراد یہ تھی کہ اہل دل کی تلاش کی جائے، وہ تلاش تو نے چھوڑ دی۔

(۲۱)

مرید ہندی: میرے بلند خیالات آسمانوں پر پہنچے ہوئے ہیں۔ میں زمین پر خوار و خستہ اور دکھی بیٹھا ہوں۔ دنیا کا کام مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ اس راستہ میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ زمین کا کاروبار کیوں میرے بس کا نہیں؟ اسے میں کیوں نہیں انجام دے سکتا؟ جو شخص دین کی حقیقتوں سے آگاہ ہے، وہ دنیا کے کام سے کیوں ناواقف ہے؟

پیر رومی: جو شخص آسمانوں پر بلا تکلف اڑا پھرتا ہے، اس کے لئے زمین پر چلنا کیوں کر مشکل ہو سکتا ہے؟

(۲۲)

مرید ہندی: مجھے یہ تو بتا کہ علم و حکمت کا نشان کیونکر مل سکتا ہے؟ سوز و گداز، درد و داغ کس طرح ہاتھ آ سکتے ہیں، جو عشق کے خاص اوصاف سمجھے جاتے ہیں؟

پیر رومی: علم اور حکمت عشق اور سوز و گداز حلال کی روزی سے حاصل ہوتے ہیں۔ جو بھی شخص کسب حلال کرے گا، وہ ان نعمتوں سے مالا مال ہو سکے گا۔

(۲۳)

مرید ہندی: زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں سے میل جول رکھا جائے۔ اور انسان گوشہ گیری پہ مائل نہ رہے، لیکن گوشہ گیری کے بغیر شعر میں سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا۔

پیر رومی: گوشہ گیری اور خلوت غیروں سے چاہیے، نہ کہ اپنوں سے۔ پتیں سردی کے موسم میں پہنچ جاتی ہے نہ کہ بہار کے موسم میں۔

(۲۴)

مرید ہندی: اب ہندوستان میں نہ نور باقی ہے، نہ سوز و گداز، نہ وہ لوگ موجود ہیں جن کے فیض سے باطن روشن ہو جائے۔ نہ وہ موجود ہیں جو دلوں میں عشق کا سوز و گداز پیدا کر دیں۔ اس دیس میں دل والے لوگوں کی زندگی مصیبت کا گھر بن گئی۔

پیر رومی: مردان حق کا کام یہ ہے کہ سب میں ایمان کا نور اور عشق کی گرمی پیدا کریں، البتہ کمینے لوگ حیلہ و بے شرمی پر عمل پیرا رہیں گے، لیکن ان کی حالت دیکھ کر مردان حق کو اپنا حق کو اپنا فرض زیادہ سرگرمی سے انجام دینا چاہیے۔

رباعی

تیرا جسم روح سے بے تعلق ہو گیا۔ اگر تیری فریاد بارگاہ حق تک نہیں

پہنچتی تو اس پر تعجب کیوں ہو؟ غذا بے روح جسم سے بیزار ہے، وہ خود زندہ اور حی و قیوم ہے اور زندوں کا غذا ہے۔

جبریل و ابلیس

کاخ و کو: محل اور کوچے۔ لا تقنطوا: تم ناامید ہو۔ لا تقنطوا: تم ناامید مت ہو۔ تار و پود: تانا بانا۔

جبریل: پرانے ساتھی! یہ تو بتاؤ کہ رنگ و بو کے جہان، یعنی دنیا کا کیا حال ہے؟

ابلیس: وہاں سوز و ساز، درد و داغ، جستجو اور آرزو کے سوا کیا رکھا ہے؟

جبریل: آسمانوں پر ہر وقت تیرے متعلق بات چیت ہوتی رہتی ہے. کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تیرے دامن کا چاک سل جائے اور تو جو غلطی کر بیٹھا ہے، اس کی تلافی ہو جائے؟

ابلیس: اے جبریل! افسوس تو اس بھید سے آگاہ نہیں کہ میرا سُبو ٹوٹا تو مجھ پر وہ نشہ چھا گیا جو اتر نہیں سکتا۔

میں دنیا کے محل اور کوچے دیکھ چکا ہوں، جہاں ہر طرف شور و غل اور چہل پہل ہے۔ اب میں اس دنیا میں نہیں رہ سکتا. ہرگز نہیں رہ سکتا جہاں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے اور جو سراسر سنسان ہے یعنی فرشتوں

اور قدوسیوں کا جہان۔

میں نافرمانی کے باعث خدا کی رحمت سے مایوس ہو گیا ہے لیکن میری مایوسی ہی نے کائنات کے دل میں سوز و گداز پیدا کیا۔ اب تو ہی بتا کہ میرے حق میں تقنطوا اچھا ہے کہ لا تقنطوا؟

جبرئیل: اے ابلیس! تو نے خدا کا نافرمان بن کر وہ بلند مرتبے کھو دیے جو نافرمانی سے پہلے تجھے حاصل تھے۔ کیا کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ تیری غلطی کے بعد خدا کی نظروں فرشتوں کی آبرو کیا رہی؟

ابلیس: میں نے نافرمانی کی جرأت کی۔ اسی جرأت کی بدولت خاک کے پتلے یعنی انسان میں پھولنے پھلنے اور ترقی کرنے کا ذوق پیدا ہوا۔ میں جو فتنے اٹھاتا ہوں وہی عقل و دانش کا تانا بانا ہیں۔

تو صرف ایک طرف کھڑا نیکی اور بدی کی جنگ کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ میں اس جنگ کے طوفان میں بیٹھا ہوں اور اس کی بے پناہ لہروں کے تھپیڑے میں کھا رہا ہوں کہ تو؟

میرے اٹھائے ہوئے طوفانوں نے سمندروں، دریاؤں اور ندیوں میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔ ان طوفانوں میں حضرت خضرؑ بھی بے بس ہیں اور حضرت الیاسؑ بھی۔

اگر کبھی بارگاہ الٰہی میں خاص حاضری کا شرف حاصل ہو تو پوچھنا کہ کس کے لہو سے بنی نوع انسان کی سرگزشت رنگین و دل آویز بنی ہے یہ میرا ہی لہو تھا۔

میں نے نافرمانی کی اور جزو کل کے مالک و خالق سے ٹکرا گیا، لہٰذا اس

ذاتِ پاک کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہوں۔ تیری حیثیت کیا ہے؟ یہ کہ ہر لحظہ اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو کر رہا ہے۔

قطعہ

کل پیرِ مغاں نے اپنے مریدوں سے کہا کہ یہ بات قدر و قیمت میں سچے موتی سے بھی دس گنا بڑھی ہوئی ہے۔ وہ کیا بات ہے؟ وہ یہ کہ جس قوم کے بچے خوددار اور ہنرور نہ ہوں، اس کے حق میں یورپی تہذیب کی شراب شراب نہیں، زہر ملا ہوا پانی ہے، جو انہیں ہلاک کر دے گا۔

مراد یہ کہ فرنگی تہذیب کے اثر سے وہی نوجوان بچ سکتے ہیں جن میں خودداری کا جوہر موجود ہو اور جو اپنی ہنروری کی بدولت فرنگیوں کی محتاجی پر مجبور نہ ہوں۔

اذان

اس نظم میں اقبال نے شب بیداری اور رات کے سکوت میں ذوقِ عبادت کی برتری نہایت پراثر انداز میں واضح فرمائی ہے اور اس کا آخری شعر اذان پر ختم ہوتا ہے، جو مسلمان کے لیے بیداری اور ذوقِ عبادت کا سب سے موثر پیغام ہے۔ اس میں یہ حقیقت بھی بتائی گئی ہے کہ اگر انسان

اپنی ذاتی تجلّی کو بے نقاب کر سکے تو آسمان کے تمام ثابت و سیّار ماند پڑ جائیں، یعنی انسان ہی کائنات کی سب سے بڑی اور اشرف ہستی ہے۔

مریخ: ایک مشہور ستارہ جسے انگریزی میں مارس اور فارسی میں جلاد فلک کہتے ہیں اور اسے جنگ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ زہرہ: مشہور ستارہ جسے انگریزی میں وینس اور فارسی میں لولیٔ فلک یا رقاصۂ فلک کہتے ہیں۔ کرمک شب کور: وہ کیڑا جسے رات کو کچھ نظر نہ آئے۔

(۱) ایک رات صبح کے ستارے نے دوسرے ستاروں سے پوچھا کہ کیا تم نے انسانوں کو بھی رات کے وقت یا اس کے آخری حصے میں جاگتے دیکھا ہے؟

ستاروں سے رات کے وقت جاگتے رہنے کا سوال اس لئے کیا کہ وہ ساری رات چمکتے رہتے ہیں۔ رات کے آخری حصے میں انسان کے بیدار نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ صبح کا ستارہ رات کے آخری حصے ہی میں طلوع ہوتا ہے۔ اس نے انسان کو سوئے ہوئے پایا تو سوال کی ضرورت پیش آئی۔

(۲) مریخ ستارے نے جواب دیا کہ قضا و قدر کا کام جن فرشتوں کے سپرد ہے وہ حقیقت کو خوب پہچانتے ہیں۔ انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس چھوٹے سے فتنے کا سویا ہی رہنا بہتر ہے۔ اگر یہ جاگ اٹھے تو خدا جانے کیا قیامت برپا کرے۔

(۳) زہرہ ستارے نے یہ بات چیت سنی تو کہا کہ کیا تمہیں گفتگو کا

کوئی اور موضوع نہیں ملتا؟ انسان سے ہمیں کیا مطلب؟ اس کی حیثیت تو اس کیڑے کی سی ہے، جسے رات کے وقت کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ پھر وہ رات کو کیوں جاگے؟

سوال وجواب سے ظاہر ہے کہ صبح کے ستارے نے صرف پوچھا تھا کہ انسان کبھی بیدار بھی ہوتا ہے؟ مریخ اور زہرہ نے ایسے جواب دیئے، جن سے بے تعلقی ظاہر ہوتی ہے۔ مریخ انسان کو فتنہ قرار دیتا ہے۔ زہرہ کہتی ہے کہ ہمیں اس سے واسطہ ہی نہیں، لیکن چاند نے حقیقت واضح کی۔ یقیناً اس لئے کہ وہ زمین سے قریب ہے اور یہاں کے معاملات سے اسے پوری آگاہی حاصل ہے۔

(۴) چودھویں کا چاند بولا کہ جس طرح تم آسمان کے ستارے ہو، انسان زمین کا ستارہ ہے۔ تم رات کے اندھیرے میں چمکتے ہو، انسان دن کی روشنی میں جدوجہد کا فرض انجام دیتا ہے۔ گویا وہ دن کو چمکتا ہے۔

(۵) اگر انسان شب بیداری کی لذت سے آگاہ ہو جائے اور جان لے کہ رات کے وقت کی عبادت سے کیا کیا فیض حاصل ہوتے ہیں تو خاک کی یہ مٹھی جس کے اندر خدا جانے کیا کیا راز بھرے ہوئے ہیں، ثریا سے بھی اونچا درجہ حاصل کر لے۔

(۶) اس کے پہلو میں وہ نور لہریں لے رہا ہے جو بے نقاب ہو جائے تو آسمان کے تمام ستارے اور سیارے اس کی جلوہ باریوں میں کھو جائیں۔

(۷) یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک فضا میں اذان کی آواز گونجی۔ ایسا

معلوم ہو رہا تھا کہ فضا اسی آواز سے بھر گئی ہے۔ یہی وہ نعرہ ہے جسے سن کر پہاڑوں کے دل بھی ہل جاتے ہیں۔ گویا انسان کو بیداری کا خدائی پیغام مل گیا۔

قطعہ

اس مختصر سے قطعہ میں مذہب کے دو تصور پیش کئے گئے ہیں۔ اوّل وہ تصوّر جس پر خدا کے سچّے بندے کاربند رہتے ہیں۔ دوسرا وہ تصور جس میں مذہب کے صرف ظاہر طور طریقوں کو پورا کیا جاتا ہے اور اس کی حقیقت سے بے خبری رہتی ہے۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقبال اسی تصور کی دعوت دیتے ہیں جو خدا کے سچّے بندوں کے پیش نظر رہتا ہے اور جس کی بدولت کائنات میں انقلابی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ اس تصور کو پسندیدہ نہیں سمجھتے جو مذہب کی روح سے خالی ہوتا ہے۔

(۱) میرے بیان کا طریقہ اگرچہ زیادہ شوخ اور پُرتاثیر نہیں، لیکن کیا عجب ہے کہ میری بات تیرے دل میں اتر جائے اور اسے متاثر کر سکے۔

(۲) دنیا میں زندگی بسر کرنے کے دو طریقے ہیں اوّل یہ کہ آسمانوں کے پھیلاؤ میں لگاتار اللہ اکبر کے نعرے لگائے جائیں، یعنی خدا کا پیغام اس انداز میں پہنچایا جائے کہ اس کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دے اور ہر چیز اسی پیغام پر کاربند ہو جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زمین کی آغوش میں بیٹھ کر تسبیح پڑھی جائے اور مناجات کی جائے۔

پہلا طریقہ خدا کی راہ میں جہاد کا ہے جو اہلِ حق کا اصلی کام ہے اور جس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ گرد و پیش کے حالات کو بدل کر خدا کی رضا کے مطابق بنایا جائے۔ دوسرا طریقہ ان لوگوں کا ہے، جن کے دل مذہبی روح سے خالی ہوتے ہیں اور وہ صرف ظاہری عبادات رسمی طریق پر پوری کرتے ہیں۔

(۳) پہلا طریقہ ان مردانِ حق کا ہے جو اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں اور اپنی زندگیاں خدا کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ دوسرا طریقہ انسانوں میں سے ملّاؤں کا ہے اور اسی پر جمادات و نباتات کاربند ہیں۔

خوب غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جمادات اور نباتات بھی ایک خدائی قانون کے پابند ہیں اور اسے ٹھیک ٹھیک پورا کرتے رہتے ہیں، مگر چونکہ ان میں نہ عزم و ارادہ ہوتا ہے نہ فہم و بصیرت۔ بالکل وہی حالت ان انسانوں کی ہے، جن کے ہاں مذہب کی حیثیت رسم و ریت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ خواہ وہ ملّا ہوں، جن کی آج کل کے زمانے میں کثرت ہے یا اور لوگ ہوں، انہیں عمل کے لحاظ سے جمادات اور نباتات پر کوئی فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

محبت

اس مختصر سی نظم میں محبت کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ محبت دراصل آدم گری ہے، یعنی اس کی بدولت آدمی انسان بنتا ہے اور انسانیت سیکھتا ہے۔

غزنوی: سلطان محمود غزنوی۔ **ایازی**: ایاز سلطان محمود کا غلام اور عہدہ دار تھا۔ مشہور ہے کہ سلطان کو اس سے بے حد محبّت تھی۔ اردو اور فارسی ادبیات میں غزنوی عموماً عاشق کے لئے اور ایاز معشوق کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایازی سے مراد ہے ایاز کی حیثیت و خصوصیت۔ **شیشہ بازی**: فریب کاری۔ **مرعوب**: رعب میں آیا ہوا۔ ڈرا ہوا۔ **اسکندری**: بادشاہی اس لئے کہ سکندر بہت بڑا بادشاہ تھا۔ **آئینہ سازی**: بلفظی معنی آئینہ بنانا۔ مشہور ہے کہ سکندر نے ایک آئینہ بنا کر اسکندریہ کے مینار پر لگا دیا تھا جس میں زمانے کے حالات معلوم ہو جاتے تھے۔ دراصل یہ شہرت محض افسانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسکندریہ میں سمندر کے کنارے ایک مینار ضرور بنا تھا۔ اس پر رات کے وقت اس غرض سے روشنی کر دی جاتی تھی کہ آنے والے جہازوں کو دور سے اسکندریہ کا پتا مل جائے۔

(۱) محبّت کا شہید نہ کافر ہوتا ہے، نہ غازی اور محبّت کی رسمیں نہ ترکی ہوتی ہیں، نہ عربی یعنی محبّت کو ان انسانی تقسیمات سے کوئی تعلق ہے جو کافر، غازی وغیرہ کی شکل میں انسانوں نے بنا رکھی ہیں، نہ اسے مختلف قوموں اور ملکوں سے کوئی خصوصیت اور وابستگی ہے۔

(۲) مشہور ہے کہ سلطان محمود غزنوی محبّت کی بدولت اپنے غلام ایاز کا نیاز مند بن گیا تھا لیکن اسے محبّت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو کوئی اور ہی شے تھی، تم چاہو تو اسے مادہ پرستی یا نفس پرستی قرار دے سکتے ہو۔ محبّت اس سے بہت بالا ہے۔

(۳) اگر علم و حکمت میں محبّت کا جوہر کارفرما نہ ہو تو یہ دونوں چیزیں محض فریب کاری رہ جاتی ہیں۔

علم اور حکمت کا مقصود صرف یہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچے اور وہ بہبود و بہتری کی منزلیں تیزی سے طے کرلے۔ بہبود و بہتری محض مادّی نہیں بلکہ اخلاقی بھی، محبّت کا تقاضا یہی ہے، لیکن اگر علم و حکمت میں مخلوق کی محبّت اور ہمدردی کا کوئی پہلو موجود نہ ہو تو انہیں فریب کے سوا کچھ نہ سمجھا جائے گا۔ اس کی عبرتناک مثال یورپ اور امریکہ کی مادّی ترقیات میں مل سکتی ہے۔ ان ملکوں کے سائنس دانوں نے وہ عجیب و غریب قوّتیں دریافت کرلیں جو اب تک انسانوں کی نظروں سے چھپی ہوئی تھیں۔ نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ انسانوں کی ہلاکت اور ملکوں کی تباہی کے خوفناک سامان جمع ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان سائنس دانوں یا حکومتوں کے کارفرماؤں کو مخلوقِ خدا کی محبّت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر انہیں خدا کے بندوں سے سچی محبّت ہوتی تو وہ دریافت کی ہوئی قوّتوں سے دنیا کی بہتری اور بہبودی کا کام لیتے۔

(۴) محبّت نہ بادشاہوں کی محتاج ہوتی ہے، نہ ان سے دبتی اور خوف کھاتی ہے۔ محبّت آزادی اور بے پروائی کا دوسرا نام ہے۔ بادشاہوں کا محتاج وہی ہوتا ہے جس کا دل اغراض سے پاک نہ ہو۔ جس انسان میں بے نیازی کی شان موجود ہو، وہ بادشاہوں کا نیازمند کیوں کر بن سکتا ہے اور جو آزادی ہو، وہ کسی فرماں روا سے کیوں کر دب سکتا ہے۔

(۵) میری درویشی اور فقیری سکندر کی بادشاہی سے بہتر ہے اس لئے کہ میری درویشی آدمیت اور انسانیت کا سبق سکھاتی ہے اور سکندر کے پاس آئینہ سازی کے سوا کوئی ہنر نہیں۔ اس آئینہ سازی سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟

ستارے کا پیغام

(۱) ستارہ کہتا ہے کہ مجھے فضا کا اندھیرا ڈرا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ میری فطرت پاک ہے اور چمک دمک کا جوہر اس میں موجود ہے۔ جب کائنات میں اندھیر اچھائے گا میری فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ چمکنے لگوں اور اس اندھیرے میں راستہ طے کرنے کے لئے خود اپنا چراغ بن جاؤں۔

(۲) اے رات کو چلنے والے مسافر! میری طرح تو بھی اپنا چراغ آپ بن جا اور اپنی رات کے اندھیرے کو جگر کے داغ سے روشن کرلے تاکہ تجھے راستہ چلنے میں کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔

ستارے کا یہ پیغام انسان کے لئے ہے۔ اگر انسان کی فطرت ستارے کی طرح پاکیزہ اور درخشاں ہو تو زندگی کے راستہ کا کوئی اندھیرا اس کے سفر میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ انسان ستارے کی طرح روشن نہیں ہو سکتا، لیکن وہ داغ جگر یعنی عشق حق کی بدولت ہر اندھیرے میں اجالا کر سکتا ہے۔

جاوید کے نام

اقبال نے خود فرمایا ہے کہ یہ نظم اس موقع پر لکھی گئی جب جاوید کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط انہیں لندن میں ملا۔ اس نظم میں مخاطب اگرچہ جاوید ہے لیکن اصل میں یہ تمام مسلمان نوجوانوں کے لئے ایک ضروری پیغام ہے، جس میں انہیں گراں قدر نصیحتیں کی گئی ہیں اور سچی اسلامی تربیت کا راستہ بتایا گیا ہے۔

سفال: مٹی، مٹی کا برتن۔

(۱) اے جاوید! تو عشقِ حق میں اپنا خاص مقام اور مرتبہ پیدا کر لے۔ اسی عشق کی بدولت تو اپنے لئے نیا زمانہ اور نئے صبح و شام مہیا کرے گا۔

مراد یہ ہے کہ عشقِ حق کے سوا انسانی زندگی میں درجہ کمال حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ مقام جسے میسر آجائے، وہ زمانے کی ہر گردش اور صبح و شام کی ہر افتاد سے بالکل بے نیاز ہو جائے گا۔ اس کا اپنا زمانہ ہوگا اس کے اپنے صبح و شام ہوں گے۔

(۲) اگرچہ خدا کی بارگاہ سے تجھے فطرت کو پہچاننے والا دل عطا ہو جائے لالے اور گلاب کی خاموشی بھی تیرے لئے کلام بن جائے گی یعنی قدرت جو چیزیں بولنے والی زبان سے محروم ہیں ان کی باتیں بھی تو سمجھنے لگے گا۔

(۳) یورپی تہذیب کے شیشہ گروں کا احسان نہ اٹھا۔ ہندوستان کی مٹی سے تو اپنے لئے مینا اور جام پیدا کر لے۔

مراد یہ ہے کہ یورپی علوم حاصل کرنے کو درجۂ کمال نہ سمجھ۔ ان کی تہذیب

اور ان کے طور طریقے اختیار نہ کر۔ تجھے اپنی تہذیب اور اپنے وطن کے طور طریقوں سے شوق اور وابستگی پیدا کرنی چاہیے۔ واضح رہے کہ اقبال نے یورپی تہذیب علوم اور طور طریقوں کو شیشہ گری سے تعبیر کیا۔ اس لئے کہ ان میں شیشہ کی طرح صفائی اور جلا نظر آتی ہے لیکن پائداری کچھ نہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگے اور ریزہ ریزہ ہو جائے۔ وطن کی تہذیب اور طور طریقے اگرچہ ظاہر میں زیادہ اچھے نہ معلوم ہوں تاہم ان میں پائداری ہے اور انہیں سے حقیقی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

(۴) میں انگور کی بیل ہوں اور میری شاعری ہی میرا پھل ہے۔ اس پھل سے تو اپنے لئے لالے جیسی سرخ شراب تیار کر لے۔ یعنی میں نے جو حقیقتیں شعروں میں بیان کی ہیں، انہیں اپنے ذہن میں بٹھا لے اور ان پر کاربند ہو جا۔ اسی کو انگور سے شراب کشید کرنا قرار دیا ہے۔

(۵) میرا طریقہ امیری کا نہیں بلکہ فقیری اور درویشی کا ہے۔ تو بھی اسی طریقہ پر مضبوطی سے قائم رہ۔ اپنی خودی اور خودداری کو کبھی کسی قیمت پر نہ بیچ۔ اسی طرح غریبی کے باوجود تو عالمگیر شہرت اور ناموری حاصل کرے گا۔

فلسفہ و مذہب

اس مختصر سی نظم میں یا کہنا چاہیے اس کے صرف ایک شعر میں اقبال نے فلسفہ اور مذہب کے مقاصد بیان کئے ہیں۔ یعنی فلسفہ اشیاء کی حقیقت معلوم کرنے میں لگا رہتا ہے اور اس کی بحثیں زیادہ تر اس قسم کی ہوتی ہیں کہ انسان، حیوان، درخت، پتھر، چاند، تارے، سورج کس نے پیدا کئے؟ کہاں سے پیدا ہوئے؟

بحثیں اگر کسی نتیجہ پر بھی پہنچ جائیں تو انسان کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اس کے برعکس مذہب کا طریقہ ہے کہ وہ زندگی کے مقصد اور نصب العین پر نظر رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کا انجام کیا ہے؟ اس انجام کی بہتری کے لئے اسے کیا کچھ کرنا چاہیئے؟ اسی سوال کے جواب میں اعتقاد، عمل اور اخلاق کا وہ عظیم الشان نظام پیدا ہوا جسے ہم مذہب کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی نے انسان کو بتایا کہ فلاں چیز اچھی ہے، فلاں بری۔ فلاں عمل نیک ہے، فلاں بد۔ فلاں طریقہ مفید ہے، فلاں مضر۔ اچھے برے، نیک بد، مفید مضر ہی کا دوسرا نام حلال اور حرام، جائز اور ناجائز ہے۔ مذہب ہی ہمیں وہ باتیں سکھاتا ہے، جن کے کرنے یا جن سے بچے رہنے پر انسان کے انجام کی بہتری موقوف ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک مشہور فلسفی اور حکیم بوعلی سینا فلسفیوں کا نمائندہ ہے اور مولانا روم مذہبی گروہ کے ترجمان ہیں۔ یہ دونوں شخصیتیں اقبالؔ کی اصطلاح میں کبھی کبھی عقل اور عشق کا جامہ بھی پہن لیتی ہیں۔

اس نظم کے تیسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفی کو بھی عقل و فکر کی تمام صلاحیتیں صرف کر چکنے کے بعد احساس ہونے لگتا ہے کہ صاحب نظر کے بغیر حقیقت کا پتا نہیں لگ سکتا۔

سپہرِ بریں: بلند آسمان۔ **غریب الدّیار**: پردیسی، مسافر۔

(۱) فلسفی سوچتا ہے کہ یہ سورج یہ بلند آسمان، اس پر چمکنے والے تارے اور چاند، یہ سب کیا ہیں؟ کہاں سے آئے کس طرح پیدا ہوئے اور کیونکر شام اور صبح کا سلسلہ قائم ہو گیا؟ یہ کیا بات ہے کہ سورج ایک خاص وقت پر

غروب ہوتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ شام ہو گئی۔ ایک خاص وقت پر نکلتا ہے اور ہم نے اسے صبح قرار دے لیا؟ یہ سلسلہ ایک ایسے ماضی سے لگاتار چلا آرہا ہے، جس کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں اور اب تک ان باتوں کی حقیقت سمجھ میں نہ آئی۔

(۲) پھر یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کا اصلی وطن یہی دنیا ہے؟ یا وہ کسی دوسری دنیا کا رہنے والا ہے؟ یہاں پردیسی اور مسافر کے طور پر چلا آیا۔ یہ بڑے بڑے بیابان اور یہ آبادیاں دیکھ دیکھ کر دل میں ڈر پیدا ہوتا ہے۔

مراد غالباً یہ ہے کہ انسان جہاں کا مستقل باشندہ ہو، وہاں کی ہر چیز سے وہ مانوس ہوتا ہے، لہٰذا وہ خوف نہیں کھاتا، لیکن جہاں عارضی طور پر آیا ہو، وہاں کی ہر شے اجنبیت کے باعث اس کے دل پر ایک گونہ ڈر طاری کر دیتی ہے یہی خوف انسان کے دل میں فلسفی کے نقطۂ نگاہ سے یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ دنیا اس کا اصلی وطن نہیں بلکہ پردیس ہے۔

(۳) فلسفی کہتا ہے، اب تک مجھ پر یہ بھید نہ کھلا کہ میری زندگی کے سفر کا مقصد کیا ہے؟ میں نے بہت سوچا، بہت غور کیا، لیکن کوئی دل لگتی بات ذہن میں نہ آئی۔ کوئی صاحب نظر مل جاتا تو حقیقت حال بتا دیتا، مگر میں ایسا آدمی کہاں سے لاؤں؟

(۴) یہ میرے سامنے فلسفیوں کا سرپنچ بو علی سینا موجود ہے۔ وہ تو یہی سوچتے سوچتے حیران ہے کہ انسان کہاں سے آیا اور جو شخص خود حیران ہو، وہ دوسروں کی رہنمائی کیسا کرے گا؟ دوسری طرف مولانا روم ہیں، جن کے غور و فکر اور سوچ بچار کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مجھے جانا کس طرف چاہیے، یعنی

میری منزل مقصود کون سی ہے۔

(۵) اب میں ان میں سے کس کو صاحب نظر مانوں؟ خود حیران ششدر رہوں اور حالت یہ ہے کہ راستہ چلنے والا جو بھی مل جاتا ہے، اس کے ساتھ ہو جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہی میری رہنمائی کرے گا، لیکن تھوڑی دور جا کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رہنما تو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ میرے دل میں منزل کا شوق تو بہت ہے، اسی وجہ سے ہر ایک چلنے والے کا ساتھی بن جاتا ہوں، مگر عقلی رہنما کو پہچاننے کا سلیقہ مجھ میں پیدا نہیں ہوا۔

آخری شعر مرزا غالب کا ہے۔

یورپ سے ایک خط

اس خط نظم میں اقبال نے مولانا روم کی زبان سے یہ پیغام دیا ہے کہ مادیت کسی کو منزل مقصود پر نہیں پہنچا سکتی بلکہ تباہی کا باعث ہوتی ہے اور روحانیت کے نور کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اس نظم کے پہلے تین شعروں میں اقبال سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ آیا دور حاضر کو بھی مولانا روم نے کوئی پیغام دیا ہے؟ اقبال نے اس سوال کے جواب میں مثنوی کے دو شعر پیش کر دیئے۔

محسوس: وہ شے جس کا علم حواس خمسہ کے ذریعہ سے ہو سکے، یعنی جو دیکھی سنی، چھوئی، چکھی اور سونگھی جا سکے۔ مراد ہے مادی شے۔ پر آشوب: طوفانی۔ احرار: حُر کی جمع، لفظی معنی آزاد، اصطلاحی معنی اہل حق اور خدا دوست اصحاب۔

(۱) ہم لوگ مادی چیزوں کے عادی ہو چکے ہیں اور انہیں پسندیدہ سمجھتے ہیں

ہم سمندر کے کنارے ہی پر کھڑے رہنا بہتر جانتے ہیں، لیکن مولانا روم ایک طوفانی سمندر ہیں، جس کے بھید اب تک کھل نہیں سکتے۔

مطلب یہ کہ ہم لوگ تو انہیں علوم و فنون میں مست ہیں، جن کا تعلّق مادّیات سے ہے اور اس دائرے سے ایک قدم باہر رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ مولانا روم روحانیت و معرفت کا اتھاہ سمندر ہیں۔

(۲) اے اقبال! تو بھی تو شوق کے اسی قافلے میں شامل ہے، جس کے سالار مولانا روم ہیں یعنی تیرا ذوق و مشرب بھی تو مولانا روم کی طرح روحانی اور عرفانی ہی ہے، لہٰذا تو اس بزرگ کے مقاصد ہمارے سامنے بہتر طریق پر بیان کر سکتا ہے۔

(۳) ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ مولانا روم کو تو خدا دوست اہل حق کے لئے چراغ راہ سمجھا جاتا ہے، آیا انہوں نے موجودہ دور کے لئے بھی کوئی پیغام دیا ہے؟

جواب

اقبال فرماتے ہیں کہ ہاں اس دور کے لئے مولانا کا پیغام یہ ہے:-

(۱) گدھوں کی طرح گھاس اور جَو کھا کر گزارا نہ کرنا چاہئے بلکہ ہرن کی طرح ختن کے پہاڑوں میں ارغواں چرنا چاہئے۔

مولانا روم کا مطلب یہ ہے کہ گھاس اور جَو کھانا گدھوں کا کام ہے۔ یہ عام غذا ہے، جو کھانے والے میں کوئی جوہر پیدا نہیں کر سکتی۔ البتہ اس کا پیٹ پال سکتی ہے۔ ختن کے ہرن جو مشک نافہ پیدا کرتے ہیں، گھاس اور

جو نہیں کھاتے بلکہ ارغواں چرتے ہیں اور اسی غذا کی بدولت ان کے خون میں وہ جوہر پیدا ہوتا ہے جو نافہ میں پہنچ کر مشک بن جاتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ مادیّت، تن پروری کے سوا کسی کام نہیں آتی، روحانیت ہی کی بدولت انسان کی قدر و قیمت بڑھتی ہے اور اس کی برتری مشک کی طرح ہر فضا کو معطر کرتی ہے

(۲) جو گھاس اور جو کھاتا ہے، وہ بھیڑ بکری اور گائے بیل کی طرح ذبح کر دیا جاتا ہے تاکہ دوسروں کی تن پروری کے لئے سامان مہیا ہو سکے، جو خدا کا نور کھاتا ہے وہ قرآن بن جاتا ہے۔

مراد یہ کہ مادیّت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دوسروں کی مادیّت کے لئے غذا مہیّا ہو۔ روحانیّت انسان کے سینہ میں وہ روشنی پیدا کر دیتی ہے، کہ وہ خود دوسروں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

نپولین کے مزار پر

نپولین کی زندگی کا ممتاز پہلو یہ ہے کہ اس کا ایک ایک سانس ہمّت اور جوشِ عمل میں گزرا۔ اسی جوشِ عمل کی بدولت وہ ایک غیر معروف اور بے وسیلہ یتیم ہونے کے باوجود دنیا کا سب سے بڑا سپہ سالار اور یورپ کا سب سے بڑا تاجدار بن گیا۔

اس نظم میں اقبال نے نپولین کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا ہے اور عالمِ انسانیت کو جوشِ عمل ہی کا درس دیا ہے۔

نپولین: نپولین ۱۷۶۹ء میں جزیرہ کارسیکا کے صدر مقام اجیشیو میں پیدا ہوا۔ فرانس میں جنگی تعلیم پائی۔ سب سے پہلے توپ خانے میں لفٹیننٹ بنا۔ انقلاب فرانس سے پانچ چھ برس بعد اچانک اس کی تقدیر کا ستارہ چمکا اور ایک کارنامے کی بدولت اسے اس فرانسیسی فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا جو اٹلی پر حملہ کرنے والی تھی۔ ایک سال میں اس نے چھوٹی بڑی چودہ لڑائیاں کیں، آسٹریا کی چار عظیم الشان فوجوں کو فنا کے گھاٹ اتارا اور دنیا کے عظیم ترین فاتحوں میں شمار ہونے لگا۔ پھر وہ فرانس کا شہنشاہ بن گیا اور یورپ کا بڑا حصہ اس کے زیر نگیں آ گیا۔ ۱۸۱۵ء میں واٹرلو کے مقام پر شکست کھائی۔ اس نے خوشی سے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے ظلم و جبر سے کام لیتے ہوئے اسے جزیرہ سینٹ ہلینا میں قید کر دیا۔ وہیں ۱۸۲۱ء میں وفات پائی۔ ۱۸۴۰ء میں اس کی نعش شاہی جاہ و جلال سے پیرس پہنچی۔ وہاں پیرس کے قلب میں اس کا عالیشان مقبرہ بنایا گیا۔ ایسا مقبرہ یورپ کے کسی شہنشاہ کو نصیب نہ ہوا۔

جہانِ تگ و تاز: وہ دنیا جس میں دوڑ دھوپ اور جد و جہد لازم ہے، یعنی یہ دنیا۔ الوند: ایران کا ایک مشہور پہاڑ۔ تیمور: ترکستان کا مشہور مغل فاتح جس نے اپنی ہمت سے ایشیا میں ایک نہایت عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر تیمور ہی کی اولاد میں سے تھا۔ اسی وجہ سے مغل سلاطین کو تیموری بھی کہتے ہیں۔

(۱) اس دنیا میں دوڑ دھوپ اور جد و جہد کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تقدیر ایک ایسا راز ہے جس سے اب تک پردہ نہیں اٹھ سکا، لیکن

انسان میں بے پناہ جوش عمل موجود ہو تو اس کی تقدیر کے بھید کھل جاتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ انسان کو کچھ معلوم نہیں، اس کا مستقبل کیا ہے؟ جوشِ عمل اس کے مستقبل کو شاندار بناتا ہے اور پستی سے اٹھا کر انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ خود نپولین اس حقیقت کی ایک روشن مثال ہے۔

(۲) جوشِ عمل ہی کی بدولت سکندر یونانی کی تلوار اسی طرح چمکی، جس طرح سورج صبح کی پیشانی پر چمکتا ہے۔ اسی تلوار کی گرمی سے الوند جیسا پہاڑ پانی پانی ہو گیا۔

مراد یہ ہے کہ ایرانیوں کی وہ عظیم الشّان شہنشاہی جو کوہ الوند کی طرح مستحکم اور پائدار نظر آتی تھی، سکندر کی تلوار کے سامنے ٹھہر نہ سکی اور اس کا نقش دنیا کے صفحے سے مٹ گیا، اس لئے کہ سکندر کا جوش عمل اس کی تلوار کا پشتیبان تھا۔

(۳) تیمور کی فتوحات کا سیل جوش عمل ہی کی بدولت ہمہ گیر بنا اور جو کچھ سامنے آیا، اسے بہا لے گیا۔ بھلا تیز اور تند سیل کے سامنے بلندی اور پستی کی کیا حقیقت ہے؟ وہ تو جب بڑھتا ہے، نہ بلندی دیکھتا ہے نہ پستی۔ ہر شے کو روندتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تیموری فتوحات کی کیفیت یہی تھی۔

(۴) جوشِ عمل ہی میں وہ قوّت و صلاحیّت ہے کہ میدان جنگ میں مردانِ خدا کے نعرۂ تکبیر کو خدا کی آواز بنا دیتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ تکبیر کا نعرہ اگرچہ انسانوں کے حلق سے بلند ہوتا ہے، لیکن ان کا جوش عمل نعرے میں ایسی قوّت پیدا کر دیتا ہے کہ دشمنوں کی کوئی بھیڑ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ آواز ان کی نہ تھی بلکہ خدا کی تھی

اور تلوار مردانِ حق نے نہ چلائی تھی۔ خدا کی آواز اور خدا کی تلوار کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟

اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مردانِ حق کا ہر کام چونکہ خدا کی رضا کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے ان کے نعرۂ تکبیر کو بھی خدا کی آواز سمجھنا چاہیئے۔

(۵) لیکن عمل کی فرصت ایک دو لمحے سے زیادہ نہیں ملتی یعنی یہ فرصت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اس کے بدلے میں قبر کی لمبی راتیں ملتی ہیں۔

مراد یہ ہے کہ جوشِ عمل کا وقت عمر کی طرح بہت تھوڑا ہے۔ اسے ضائع نہ کرنا چاہیئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان غفلت یا سہل انکاری یا نفع نقصان کے اندازوں میں عمر کے مختصر سے اوقات گزار دیتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے، انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ زندگی تو بہت تھوڑی ہے۔ اس کے بعد قیامت تک کے لئے لحد کی تاریکی میں سونا ہوگا۔ پھر کیوں اس تھوڑی سی مہلت کو جوشِ عمل میں نہ صرف کیا جائے؟

(۶) آخر ہماری منزل قبرستان ہے، جہاں خاموشی ہی کا دور دورہ ہے اور کوئی آواز کوئی صدا وہاں سے نہیں اُٹھ سکتی۔ جب حالت یہ ہے تو کیوں زندگی کے اوقات آسمانوں کے گنبد میں غلغلہ اور ہنگامہ بپا کرنے کے لئے وقف نہ کر دیئے جائیں۔

آخری شعر خواجہ حافظ کا ہے اور نظم کا انداز ایسا ہے گویا اقبال نے یہ پوری کیفیت نپولین کی زبان سے بیان کی۔

مسولینی

یہ نظم ان تاثرات کا نتیجہ ہے جو اطالویوں میں مسولینی کے زیرِ قیادت قومی زندگی کی نئی روح دیکھ کر اقبال کے قلبِ صافی پر وارد ہوئے۔ وہ اٹلی

سیاسی تغیرات سے واقف تھے جو اٹلی میں میزینی اور گریبالڈی نے پیدا کئے لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ اٹلی کی مختلف ریاستوں کے اتحاد سے قوم کے اوضاع و اطوار میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس کی اکثریت پہلے کی طرح بے حس ہی رہی۔ اٹلی نے ۱۸۹۵ء میں اہل حبش سے خوفناک شکست کھائی۔ ۱۹۱۱ء میں بڑی بڑی یورپی طاقتوں کی شہ پا کر طرابلس الغرب (موجودہ لیبیا) پر حملہ کیا، لیکن نہتے عربوں نے اطالوی فوجوں کو ساحلی مقامات سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

پہلی جنگ یورپ کے بعد ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے قوم کی قیادت سنبھالی تو تھوڑی ہی مدت میں جوش و ہمت کی لہر پورے اٹلی میں دوڑا دی۔ خصوصاً نوجوان اس کی تحریک سے بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال نے ۱۹۳۱ء کے آخر میں دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی کے وقت اٹلی میں چند روز گزارے تھے۔ وہ اس طرح کہ مسولینی نے اپنے قونصل متعینہ ہند ڈاکٹر سکارپا کے ذریعہ سے اقبال کو روما آنے اور لیکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ لندن میں یہ دعوت انہیں ملی اور وہ تقریباً آٹھ دن اٹلی میں رہے۔ اس اثنا میں ایک لیکچر بھی دیا۔ وہاں کے اکابر سے بھی ملے۔ مسولینی سے بھی ملاقات کی اور اس ملاقات کا گہرا اثر ان کے دل پر پڑا۔ روما اور نیپلز کی سیر بھی کی۔ پھر برنڈزی سے جہاز پر سوار ہو کر اسکندریہ پہنچے۔ اس سفر میں انہوں نے اٹلی کے طول و عرض میں فاشسٹ نوجوانوں کے جتھے جا بجا دیکھے اور یہ اثر قبول کیا کہ اٹلی کی کایا پلٹ گئی ہے۔

یہ نظم انہیں تاثرات کا نتیجہ ہے

مسولینی ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا۔ اپنے عجیب و غریب خیالات کی وجہ سے

تکلیفیں بھی اٹھائیں۔ فوج بھی رہا۔ پھر اس نے اخبار نویسی اختیار کی جس کے ذریعہ سے فاشزم کی تحریک پھیلائی۔ ۱۹۲۲ء میں کہنے کو وزیراعظم اور حقیقۃً مختار کل بن گیا۔ تقریریں نہایت دل آویز کرتا تھا۔ اس نے قوم میں جنگی روح پیدا کی۔ رومیوں کی پرانی عظمت یاد دلاکر عظیم الشان سلطنت کا تصوّر پیش کیا۔ دوسری جنگ یورپ میں ہٹلر کے مقابلہ میں فرانس شکست کھا گیا اور انگریز میدان میں اکیلے رہ گئے تو مسولینی نے بھی فرانس اور انگلستان کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ البانیہ اور یونان پر حملوں میں اسے سخت ناکامیاں پیش آئیں۔ اتحادی فوجوں نے مصر پر آخری یورش شروع کی تو طرابلس (لیبیا) ٹیونس اور سسلی تھوڑے ہی دنوں میں مسخر ہو گئے۔ پھر اٹلی پر حملہ شروع ہوا۔ مسولینی کو وزارت سے الگ کرکے ایک جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا، جہاں سے ہٹلر کے ہوا باز اسے چھڑا کر لے گئے اور شمالی اٹلی میں دوبارہ اس کی حکومت قائم ہوئی، لیکن اسے چین نصیب نہ ہوا۔ وہ بھیس بدل کر اٹلی سے سوئیزرلینڈ جانا چاہتا تھا۔ راستے میں پکڑا گیا اور اسے گولی مار دی گئی۔ پھر اس کی لاش مشہور شہر میلان کے چوک میں کئی روز تک لٹکتی رہی۔ آخر اسے ایک خفیہ مقام پر دفن کردیا گیا۔

غرض جنگ میں اس کی تیاریاں بالکل ہیچ ثابت ہوئیں۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس نے قوم میں اگرچہ ایک خاص جوش پیدا کردیا تھا لیکن قوم کی سیرت وکردار میں کوئی گہرا تغیر پیدا نہ ہوسکا۔ تاہم فکر وگفتار میں اس کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور خود اتحادیوں کے دل پر بھی خاصی دیر تک اس کی جانب سے

ہراس طاری رہا، یہاں تک کہ جمہوریہ امریکہ کے پریزیڈنٹ مسٹر روزویلٹ اسے خاص الاہج دے کر جنگ میں شامل ہونے اور ہٹلر کا ساتھ دینے سے روکتے رہے۔ بلکہ ۱۹۳۶ء میں مسولینی کی عظمت کے جو نظارے اٹلی کے طول و عرض میں جا بجا دکھائی دیتے تھے وہ بڑے ہی پرتاثیر تھے اور اقبال کی زیرِ غور نظم انہیں کا مرقع پیش کر رہی ہے۔

ندرت: تازگی، انوکھا پن۔ رومۃ الکبریٰ: بلفظی معنی سب سے بڑا شہر رومہ۔ یہ اس زمانے سے رومہ کا لقب چلا آتا ہے جب وہ رومی سلطنت کا مرکز تھا۔ سینہ تاب: جن کے سینے گرم ہوں۔ زخمہ دار: ساز بجانے والا۔

(۱) فکر اور عمل کا انوکھا پن کیا ہے؟ یہ کہ قوم میں انقلاب کا ذوق پیدا ہو۔ وہ اپنی حالت بدلنے اور پلٹنے کے لئے بیتاب نظر آئے۔

فکر اور عمل کا انوکھا پن کیا ہے؟ یہ کہ قوم میں جوانی کی روح اور جوش تازہ ہو جائے۔ وہ ہر طرف بڑھنے اور دنیا پر چھا جانے کے لئے بے قرار دکھائی دے۔

(۲) فکر اور عمل کے انوکھے پن ہی کی بدولت زندگی عجیب و غریب معجزے دکھاتی ہے۔ فکر و عمل کے انوکھے پن ہی سے سخت پتھر اعلیٰ درجہ کا خاص لعل بن جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ جس قوم کی فکر اور عمل میں ایک حیرت انگیز تغیر پیدا ہو جائے وہ جوانی کی منزل میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی قوت نمائش کے لئے بیتاب ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی حالت پر قانع نہیں رہتی۔ خود بھی بدل جاتی ہے اور دوسروں کو بھی بدل دینے کے لئے مضطرب ہو جاتی ہے۔ وہی قوم نادر کارنامے

انجام دیتی ہے۔ اسی کی ہمت سے پتھر لعل بن جاتے ہیں اور بے حقیقت چیزیں بیش بہائی کے درجے پر پہنچ جاتی ہیں۔

(۳) اے رومہ! تیرے ضمیر کی کایا پلٹ گئی۔ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، اے خدا! یہ بیداری کے عالم میں دیکھ رہا ہوں یا یہ خواب کی دنیا کے نظارے ہیں۔
مطلب یہ اٹلی کی حالت اس درجہ بدل گئی ہے، جیسے حقیقت سمجھنے میں سو مرتبہ تامل ہوتا ہے۔

(۴) بوڑھوں پر نظر ڈالو تو ان کی آنکھوں میں زندگی کی نئی رونق اور نئی آب و تاب نمایاں ہے۔ نوجوانوں کو دیکھو تو ان کے سینے بلند ولولوں کے سوز سے گرم ہیں۔ قوموں میں ایسا ہمہ گیر تغیر بہت کم دیکھا گیا ہے۔

(۵) حبِ وطن کی یہ گرمی، دنیا پر چھا جانے کی یہ آرزو، اپنے جوہر دکھانے کی یہ بیتابی پہلے کہاں نظر آتی تھی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی کے لئے بہار کا موسم آگیا یہی وجہ ہے کہ پھول پردے میں چھپے نہیں رہ سکتے بلکہ شاخساروں سے پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہے ہیں یعنی قوم میں غیر معمولی جوش و خروش قدم قدم پر نمایاں ہے۔

(۶) اے رومہ! شوق کے گیتوں سے تیری فضا لبریز ہوگئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تیری فطرت کا ساز کسی ایسے ہاتھ کا منتظر تھا جو مضراب سے کام لے کر تیرے ساز کے خاموش تاروں میں حرکت پیدا کر دے اور ان سے نغمے اٹھنے لگیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اطالویوں کی فطرت کے ساز سے جس نے نغمے پیدا کئے، اقبال کے نزدیک وہ مسولینی تھا۔

(۷) اے رومہ! یہ جو کچھ ہوا کس کی نظر کا فیض ہے اور یہ کس کی کرامت ہے؟

اس کا سرچشمہ وہ شخصیت ہے جس کی نگاہ سورج کی کرن کے مشابہ ہے یعنی مسولینی

سوال

(۱) ایک غریب آدمی جو خوددار تھا، خدا سے کہہ رہا تھا کہ میں اپنی غریبی کی مصیبت کا گلہ نہیں کرسکتا۔ میری خودداری اس امر کی روادار نہیں ہوسکتی کہ تو نے اپنی رحمت سے جو فیصلہ کردیا، اس کے خلاف لب کھولوں۔ تو نے جو کچھ میرے حصّہ میں لکھ دیا، میں اس پر صابر و شاکر ہوں۔ یہی میری خودداری کا تقاضا ہے اور اسی کو سچّی بندگی کہتے ہیں۔

(۲) تاہم اپنے لطف و کرم سے یہ بتادے کہ فرشتے ایک بے حقیقت مردک کو دولت اور حکومت عطا کرتے ہیں تو کیا یہ سب کچھ تیری اجازت سے ہوتا ہے؟

اس نظم میں اوّل یہ بتایا گیا ہے کہ دولت اور حکومت عموماً نااہلوں کے ہاتھ میں رہتی ہے اور یہی موجودہ نظام کے خراب ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔ دوسرے یہ بتایا گیا ہے کہ خوددار انسان اگرچہ غریبی کا گلہ پسند نہیں کرتے تاہم یہ حقیقت کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکتی رہتی ہے کہ دنیا کا انتظام نادرست ہے اس لئے کہ نالائق لوگ اس میں مزے اڑاتے ہیں۔ تیسرے اس نظم میں نہایت دل کش طریق پر نظام کی نادرستی کو واضح کیا گیا ہے۔

پنجاب کے دہقان سے

اس نظم میں اقبالؔ نے پنجاب کے کسانوں کو بیداری کا پیغام دیا ہے۔

اور ان سے کہا ہے کہ اپنے اندر خودی کا احساس پیدا کریں، قبیلوں اور ذاتوں کے پرانے بت توڑ دیں اور دلوں میں زندگی کی نئی روح پیدا کریں۔

شعوب: شعب کی جمع۔ بڑے قبیلے **سلاسل**: سلسلہ کی جمع۔ زنجیریں

(۱) اے کسان! تو ہزاروں برس سے خاک چھان رہا ہے۔ یہ تو سوچ کہ تیری زندگی کا مقصد کیا ہے؟

(۲) تجھے زندگی کی جو حرارت عطا کی گئی تھی، وہ اسی مٹی میں دب کر رہ گئی صبح کی اذان ہو گئی یعنی نیا دور آ گیا۔ ہر ملک کے عوام بیدار ہو رہے ہیں۔ ان میں نفع نقصان کی تمیز پیدا ہو گئی ہے۔ تو بھی آنکھیں کھول اور خواب غفلت سے بیدار ہو۔

(۳۔۴) اس میں شبہ نہیں کہ زمین پر رہنے والوں کو رزق زمین ہی سے ملتا ہے۔ اور کھیتی باڑی زندگی کی اہم ضرورتوں میں سے ہے لیکن آب حیات اس اندھیرے میں نہیں، یعنی زندگی محض اسی کا نام نہیں کہ فصل پیدا کی، پیٹ بھرا اور پھر محنت کے لیے تیار ہو گئے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو پہچانے اور اسے قدم قدم پر پرکھتا رہے۔ جو انسان یہ فرض انجام نہیں دیتا، سمجھنا چاہیئے کہ اس کی زندگی کا نگینہ جھوٹا ہے۔ یعنی اسے انسانیت کا حقیقی مرتبہ حاصل نہیں۔

(۵) اے پنجاب کے کسان! تو ذاتوں، قبیلوں اور خاندانوں کی پرانی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ زنجیریں توڑ ڈال اور ذاتوں، قبیلوں، شاخوں کے بت ریزہ ریزہ کر کے اسلام سے رشتہ جوڑ لے۔

(۶) سچا اور پکا دین کیا ہے؟ کامیابی کے بند دروازے کس طرح کھلتے ہیں؟ اس طرح کہ دنیا میں توحید کے چہرے سے پردہ اٹھ جائے یعنی انسان چھوٹی

چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹا رہنے کے بجائے ایک بڑی ملت کا جزو بن جائے اور اس میں اپنے آپ کو گم کر دے۔ کوئی شخص جاٹ، مغل، پٹھان، سید وغیرہ نہ رہے۔ ایرانی، تورانی، ہندی، عربی وغیرہ کے امتیازات مٹا دیئے جائیں، سب مسلمان ایک ہو جائیں۔ اسی طرح توحید دنیا میں عملی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اسی طرح اس پیغام حق کی تبلیغ دنیا میں ہو سکتی ہے۔

(۷) اے پنجاب کے کسان! تو اپنے بدن کی مٹی میں دل کا دانہ بو دے کیونکہ اسی دانے سے وہ پیداوار مل سکتی ہے جو انسان کے لئے شرف کا باعث ہے۔

بدن کی مٹی میں دل کا دانہ بونے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں زندگی کے حقیقی نصب العین کی تڑپ پیدا ہو جائے۔ یہی تڑپ اسے خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے اور اسی کی بدولت انسان زندگی میں عظیم الشان کارنامے انجام دیتا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

آخری شعر کی قابل غور خوبی یہ ہے کہ کسان کو اسی کی زبان اور اصطلاح میں مخاطب کیا گیا ہے۔

نادر شاہ افغان

لولوئے لالا: روشن اور تابدار موتی۔ ہرات۔ کابل۔ غزنی: افغانستان کے مشہور شہر۔ سبزۂ نورس: لہلہاتا ہوا سبزہ۔

(۱) خدا کی بارگاہ سے وہ بادل روشن اور تابدار موتی لے کر چلا جس کی بدولت پھول کی رگ سانس کا تار بنی ہوئی ہے یعنی جس طرح سانس کی آمد و رفت جسم کو زندگی بخشتی ہے، اسی طرح رگ گل پھول کے لئے زندگی کا سامان بن گئی ہے۔

(۲) اس بادل کا گزر بہشت پر ہوا تو اسے دیکھتے ہی بے قرار ہو گیا۔ جی میں کہنے لگا کہ یہ نہایت انوکھی جگہ ہے کیوں نہ اسی پر برس جاؤں اور اس کے دامن میں اپنے موتی بکھیر دوں۔

(۳) بہشت نے بادل کے جی کی بات بھانپ لی تو کہا کہ یہاں برسنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھ، ہرات، کابل اور غزنی کا لہلہاتا ہوا سبزہ جو ابھی پیدا ہوا ہے تیرے انتظار میں ہے، وہاں جا کر برس۔

(۴) نادر شاہ افغان کی آنکھوں کے آنسوؤں کو لالے کے داغ پر اس طرح چھڑک دے کہ پھر داغ کی آگ کبھی بجھنے نہ پائے۔

مطلب یہ کہ نادر شاہ افغان کے آنسوؤں میں زندگی کی حرارت بھری ہوئی ہے، وہ پوری افغان قوم میں بھڑک اٹھنی چاہیے اور اس کا اندازہ ایسا ہو کہ پھر کبھی افسردہ نہ ہو سکے۔

خوشحال خاں کی وصیت

خوشحال خان خٹک عالمگیر اعظم کے عہد میں پشتو کا مشہور شاعر تھا اور اس کی زندگی مغلوں کے خلاف لڑتے بھڑتے گزری۔ وہ افغانوں کو مغلوں کی

حکومت سے آزاد کرانے کا خواہاں تھا، اس لحاظ سے اس نے افغانوں میں قبائلی اور نسلی تعصب کی آگ بھڑکانے کی زبردست کوشش کی۔ اقبال کو اس کے پورے مسلک سے کوئی ہمدردی نہ ہو سکتی تھی اس لئے کہ وہ وحدت ملت کے داعی تھے، لیکن خوشحال خاں کا جذبۂ آزادی اور اس کے لئے مدت العمر کی جانبازی اقبال کے نزدیک اپنی مخصوص دعوت کی ایک عمدہ مثال تھی۔ لہٰذا اس سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ کیا۔

قہستان: افغانستان کے ایک حصہ کا نام۔

(۱) افغانوں کا نام بلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام افغان قبیلے اپنے امتیازات مٹا کر ایک وحدت اور ملت بن جائیں۔ اس طرح ان کی قوت یک جا ہو جائے گی اور وہ اپنے مقصد آزادی کے لئے بدرجہا بہتر طریق پر مغلوں سے لڑ سکیں گے۔

(۲) مجھے ان بہادر اولوالعزم افغان جوانوں سے محبت ہے جو ستاروں پر کمند ڈالتے ہیں، یعنی جن کے ارادے زیادہ سے زیادہ بلند ہیں۔

(۳) افغانی علاقے کے ہونہار اور ہمت ور نوجوانوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ کسی بات میں بھی مغلوں سے کم نہیں، پھر کیوں ان کی محکومی قبول کریں اور کیوں نہ اپنی آزادی کے لئے لڑیں؟

(۴-۵) اے دوست! میں تجھ سے دل کی بات کہوں؟ وہ کیا ہے؟ یہ کہ خوشحال خاں کو ایسے مقام پر دفن کرنا جہاں پہاڑ کی تیز ہوائیں مغل شہسواروں کے گھوڑوں کی گرد نہ پہنچا سکیں یعنی خوشحال خاں کو مغلوں سے اتنی نفرت تھی

کہ اپنی قبر میں ان کے گھوڑوں کی گرد کے آنے کا بھی روادار نہ تھا۔

تاتاری کا خواب

اس نظم میں تاتاریوں کو اتحاد کی دعوت دی گئی ہے۔ تاتاریوں سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہیں ہم پرانے زمانے میں چینی اور روسی ترکستان کے باشندے قرار دیتے تھے۔ یہ معلوم ہے کہ ان لوگوں کی سلطنتیں صرف باہمی رزم و پیکار کے باعث کمزور ہوئیں۔ پھر روس نے آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے انہیں مسخر کر لیا۔

اقبال نے اتحاد کا پیغام تیمور کی زبان سے دیا ہے، جو اسلامی دور میں ترکستان کا سب سے بڑا فاتح گزرا ہے اور یہ پیغام خواب ہی کی شکل میں دیا جا سکتا تھا۔ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ایک تاتاری عالم خواب میں ملک و قوم کی حالت زار بیان کرتا ہے۔ یہ سنتے ہی سمرقند کی زمین میں جنبش پیدا ہوئی اور تیمور نے جو سمرقند میں مدفون ہے، اپنا پیغام دیا۔

سجّادہ: جائے نماز۔ عمامہ: دستار۔ ترسا بچہ: یہ لفظ عموماً شراب فروشوں کے ملازموں کے لئے استعمال ہوتا رہا جنہیں حسن و جمال میں امتیاز کی بنا پر ساقی گری کے کام پر لگایا جاتا تھا۔ چونکہ اسلامی دور میں شراب فروشی کا پیشہ عموماً یہودیوں اور عیسائیوں سے متعلق ہوتا تھا، اس لئے یہ لڑکے بھی انہیں کے ہم قوم ہوتے تھے۔ آج کل مختلف ہوٹلوں یا تجارتی فرموں اور دکانوں میں اسی غرض سے خوبصورت لڑکیاں ملازم رکھی جاتی ہیں کہ گاہک

نظر بازی کے شوق میں آئیں اور تجارت فروغ پائے۔ پرانے زمانے میں شراب فروش یہ کام خوب صورت لڑکوں سے لیتے تھے۔ ردا: چادر۔

(۱) تاتاری خواب میں دیکھتا ہے کہ کہیں جبائے نماز اور دستار عوام کے لئے رہزن بنی ہوئی ہے، یعنی علماء اور صوفیہ انہیں غلط راستہ پر لگا رہے ہیں، کہیں ساقی گری کرنے والے خوب صورت لڑکوں کی بیباک نگاہیں ایمان کی دولت پر ڈاکے ڈال رہی ہیں۔

(۲) دین اور ملت کی چادر پارہ پارہ نظر آتی ہے، یعنی نہ دین سلامت ہے، نہ ملت میں اتحاد کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ ملک اور سلطنت کا لباس چاک چاک اور تار تار ہو رہا ہے۔

(۳) بےشک میرا ایمان باقی ہے لیکن مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ کہیں فتنوں کا گھاس پھوس ایمان کے شعلے کو بجھا کے نہ رکھ دے۔
شاید کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو کہ گھاس پھوس شعلے کو نہیں بجھا سکتا، لیکن شعلہ معمولی ہو اور گھاس پھوس کا انبار ایک دم اس پر ڈال دیا جائے تو شعلہ دب کر افسردہ ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ اقبال کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایمان اگرچہ باقی رہ گیا ہے، تاہم فتنوں کی جو قیامت بپا ہے اس میں یہ باقی رہتا نظر نہیں آتا۔

(۴) آہ! میں کس منہ سے کہوں کہ سمرقند اور بخارا کی سرزمین تیز و تند ہوا کی لہروں میں گھر گئی ہے اور اس کی حفاظت خطرے میں پڑ گئی ہے۔

(۵) اپنے ارد گرد جہاں تک نگاہ جاتی ہے، مجھے یہی نظر آتا ہے کہ فتنیں اور بلائیں ایک انگوٹھی کی حیثیت رکھتی ہیں اور میری حیثیت اس انگوٹھی میں

نگینے کی ہے گویا حادثوں کی اس بارش میں ترکستان بالکل بے بس نظر آتا ہے۔[۱]

(۶) خواب دیکھتے دیکھتے اچانک ایک عجیب نظارا سامنے آیا یعنی سمرقند کی سرزمین میں بھونچال سا آگیا اور وہ لرزنے لگی تیمور کی قبر سے نور کی ایک لہر اٹھی۔

(۷) نور کی سفیدی میں شفق کی سرخی ملی ہوئی تھی۔ اس میں سے صدا بلند ہوئی کہ میں تیمور کی روح ہوں۔

(۸) اگر تاتار کے مردان مجاہد مصیبتوں میں گھر گئے ہیں اور فتنوں کے سیل نے انہیں نرغے میں لے لیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کی تقدیر بھی گھر سکتی ہے مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کا کوئی فتنہ خدا کی تقدیر پر اثر انداز نہیں ہو سکتا لیکن اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو خدا کے حکموں پر چلیں اور اس کے مقرر کئے ہوئے قاعدوں کے پابند رہیں۔ اگر تاتاری ان مصیبتوں سے نجات پانا چاہتے ہیں تو انہیں خدا کے حکموں کا پابند ہونا چاہیئے اور اپنی قوتوں کو متحد کر کے مجاہدوں کی طرح فتنوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

(۹) تاتاریوں کی حالت کیا ہے؟ وہ ایک دوسرے سے جدا جدا اور باہم دگر ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ کیا عزت کی زندگی کا تقاضا یہی ہے؟ کیا قومیں پھوٹ ہی کے ذریعہ سے سربلند ہوتی ہیں اور اپنے آپ کو فتنوں اور مصیبتوں کے سیل سے بچاتی ہیں؟

گویا تیمور کے نزدیک تاتاری اپنی مصیبتوں کے آپ ذمہ دار ہیں۔ وہ

---

[۱] اقبال نے خود لکھا ہے کہ معلوم نہیں یہ شعر کس کا ہے؟ خواجہ نصیر الدین طوسی غالباً شرح اشارات میں سے نقل کیا ہے۔

متحد ہو جائیں تو انہیں کسی فتنہ کا ڈر نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) اے میرے ہم قومو! اپنی خودی میں تازہ حرارت اور نئی آب و تاب پیدا کرو۔ ایسا کر لو گے تو اس دنیا میں نیا انقلاب بپا کر سکو گے۔

حال و مقام

اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ہر شے کی حیثیت افراد کے احوال و مقامات کی بنا پر الگ الگ ہوتی ہے۔

حال: لفظی معنی عام کیفیت۔ یہاں فرد کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی کیفیت مراد ہے جو کسی بھی وقت اس پر طاری ہو۔ **مقام:** لفظی معنی درجہ اور جگہ۔ سلوک کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ روحانی درجہ ہے جس پر سالک پہنچا ہوا ہو۔ احوال کی طرح مقامات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ **بتدریج:** درجہ بدرجہ، آہستہ آہستہ۔ **چشم نگراں:** دیکھنے والی آنکھ۔ **سالک:** لفظی معنی راہ چلنے والا۔ اصطلاحاً وہ شخص مراد ہے، جو محبوب حقیقی کی تلاش میں روحانی منزلیں طے کر رہا ہو۔ **تفاوت:** فرق۔ **کرگس:** گدھ۔

(۱) اگر انسان کے پہلو میں زندہ اور جاگتا ہوا دل موجود ہو تو اسے آہستہ آہستہ ایسی دیکھنے والی آنکھ عطا کرتے ہیں جس کی کیفیت بالکل دوسری ہو۔ یعنی انسان حقیقت کو دیکھنے کا مشتاق ہو تو چاہیئے کہ اپنے دل کو زندہ اور بیدار رکھے۔

(۲) سالک کے لئے زمان و مکان کی کیفیت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ وہ جس حال میں اور جس مقام پر ہوگا، اس کا تصور زمان و مکان اسی کے مطابق ہوگا۔

(۳) بے شک اذان ایک ہے۔ اس کے الفاظ اور معنی میں کچھ فرق نہیں لیکن دیکھو، ملا کی زبان پر اذان حیثیت ایک ہوتی ہے اور مجاہد کی زبان پر بالکل دوسری۔

مراد یہ ہے کہ ملا صرف اذان کے عربی الفاظ بولتا ہے اور ان کے عام معنی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک اذان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن مجاہد اس زندگی کی ہر شے خدا کی راہ میں بے تامل قربان کر دینے کا ارادہ لے کر اٹھتا ہے۔ اس کی زبان پر یہ اذان جاری ہوگی تو اس کا رنگ قوت ایمان کی بدولت بالکل دوسرا ہو جائے گا۔ ملا محض زبان سے الفاظ ادا کرتا ہے، لیکن اذان کی روح حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ مجاہد کی زبان پر اذان جاری ہوتی ہے تو وہ براہ راست قلب کی گہرائیوں سے اٹھ کر آتی ہے۔

(۴) ایک اور مثال سنیئے، گدھ اور شاہین ایک ہی فضا میں اڑتے ہیں، لیکن گدھ کا نصب العین ایک ہوتا ہے اور شاہین کا بالکل دوسرا۔ گدھ انتہائی بلندیوں پر اڑنے کے باوجود مردار کھاتا ہے۔ شاہین کی زندگی کا طریقہ اس سے بالکل مختلف ہے۔

تیسرے اور چوتھے شعر میں جو مثالیں دی گئی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ ہر فرد کا تصور حیات اس کے حال اور مقام کی بنا پر متعین ہوتا ہے۔ ملا اور مجاہد نہ حال میں مساوی ہیں، نہ مقام میں۔ لہذا اذان کی کیفیت ایک نہ رہی۔ اسی طرح گدھ اور شاہین کا ایک فضا میں اڑنا ان کے اندر یکسانی نہ پیدا کر سکا، اس لئے کہ دونوں کے حال اور مقام الگ الگ ہیں۔

ابو العلا معرّیؔ

اس نظم کا بنیادی نکتہ آخری مصرع میں بیان کر دیا گیا ہے یعنی ضعیف اور کمزور کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ قوت اور ہمت ہی زندگی کے اصل سامان ہیں۔

ابو العلا معرّی: عربی کا مشہور شاعر۔ نام احمد بن عبداللہ بن سلیمان جنوبی عرب کے قبیلۂ تنوخ سے تھا۔ اس قبیلے کے کچھ لوگ وطن سے ہجرت کر کے شام کے ایک مقام معرۃ النعمان میں جا بسے تھے۔ ابو العلا وہیں ۳۶۳ھ (۹۷۳ء) میں پیدا ہوا۔ اسی وجہ سے معرّی کہلایا۔ چھ سات کی عمر میں چیچک نکلنے کے باعث بینائی کھو بیٹھا۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو کچھ سن لیتا وہ یاد ہو جاتا۔ پینتیس سال کی عمر میں بغداد آیا اور کم و بیش دو سال وہاں رہا۔ ایک مشہور عالم سے کسی معاملہ میں بحث چھڑ گئی۔ عالم نے پریشان ہو کر کہا کہ یہ کون کتّا ہے۔ ابو العلا نے کہا وہ کتّا ہے جسے کتّے کے ستّر نام یاد ہیں۔ غرض بغداد سے واپس جا کر خانہ نشین ہو گیا۔ پھر باہر نہ نکلا۔ چھیاسی برس کی عمر پا کر ۴۴۹ھ (۱۰۵۷ء) میں فوت ہوا۔ اس کا دیوان بھی چھپ گیا ہے۔ دو مشہور رسالے اس سے منسوب ہیں، جن کا ذکر اقبال نے اس نظم میں کیا ہے یعنی رسالۂ غفران اور رسالۂ لزوم ما لا یلزم جسے لزومیات بھی کہتے ہیں۔ اقبال نے اسے لزومات لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ ابو العلا نے چالیس اکتالیس سال کی عمر میں گوشت ترک کر دیا اور زندگی کے آخری پینتالیس سال میں سبزیوں کے سوا کچھ نہ کھایا۔

اقبال نے پہلے مصرع میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شاطر: لفظی معنی شطرنج کا ماہر۔ اصطلاحاً چالاک: مکافات: بدلہ۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ ابو العلا معری گوشت بالکل نہ کھاتا تھا اور پھول پھل کھا کر گزارہ کر لیتا تھا۔

(۲) ایک دوست نے بھنا ہوا تیتر اس کے پاس بھیج دیا کہ شاید اسے کھائے اور اسی تدبیر سے وہ چالاک آدمی اپنی قسم توڑ دے اور گوشت کھانے لگے۔

(۳-۴) معری نے دستر خوان پہ یہ تر و تازہ اور لذیذ کھانا دیکھا تو 'غفران' و'لزومات' کا وہ مصنف بولا کہ اے غریب و مسکین پرندے! ذرا یہ تو بتا کہ تیرا وہ کیا گناہ تھا جس کے بدلے میں تجھے ذبح کر کے بھونا گیا؟

(۵) افسوس تجھ پہ سو مرتبہ افسوس کہ تو شاہین نہ بنا اور تیری آنکھ فطرت کے اشارے نہ سمجھ سکی۔

(۶) اشارے کیا تھا؟ یہ کہ تقدیر کے مفتی نے ازل کے دن سے فتویٰ دے رکھا ہے، کمزوری کے جرم کی سزا ناگہانی موت کے سوا کچھ نہیں یعنی جو کمزور اور بے قوت ہیں وہ اسی طرح دوسروں کا شکار ہوتے رہتے ہیں جس طرح تیتر شکار ہو گیا۔ اگر وہ اپنے اندر شاہین کی قوت پیدا کر کے بلندیوں پر اڑتا رہتا، تو کسی شکاری کا تیر اس تک نہ پہنچ سکتا۔

سنیما

(۱) سنیما کیا ہے؟ یہ تو حضرت ابراہیمؑ کے والد آزر کی صنعت ہے۔ یہاں

اسی طرح بت بنائے اور بیچے جاتے ہیں جس طرح آزر بناتا اور بیچتا تھا۔

(۲) آزر کی بت گری اور بت فروشی کو صنعت نہ کہنا چاہیے۔ وہ تو اصل میں کافری کا ایک طریقہ تھا اور سینما کی صنعت بھی صنعت نہیں بلکہ جادوگری کا ایک طریقہ ہے۔

(۳) بت گری اور بت فروشی پرانے زمانے کی قوموں کا مذہب تھی اور وہ اسی کو کارِ ثواب سمجھتی تھیں سینما موجودہ زمانے کی تہذیب کا پیشہ ہے یعنی موجودہ زمانے کے بت گر اس کے ذریعے سے اپنی تجارت کو فروغ دیتے اور روپیہ پیدا کرتے ہیں۔

(۴) پرانے کی بت گری میں دنیا کی مٹی استعمال کی جاتی تھی۔ سینما کے لئے دوزخ کی مٹی استعمال ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کی بت گری کو خاکی بت خانہ کہ سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کے بت دنیا کی مٹی سے بنتے تھے سینما کو راکھ کا بت خانہ کہنا چاہیے، اس لئے کہ وہ دوزخ کی مٹی سے بنا ہے جہاں راکھ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ ان شعروں میں اقبال نے سینما کی سخت مذمت کی ہے۔ وہ اس لئے کہ موجودہ زمانے کی تہذیب نے جادوگری کے طریقہ سے کام لے کر تجارت کا نیا ڈھنگ پیدا کیا اور اس تہذیب کے علم داروں کی بنائی ہوئی فلموں سے ہر سال کروڑوں روپے انہیں ملتے ہیں۔ فلمیں دیکھنے والے نظر بازی کے شوق میں کھنچے کھنچے وہاں پہنچ جاتے ہیں، ان کے اخلاق پر حد درجہ برا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سینما کا بت خانہ دوزخ کی مٹی سے بنا ہے۔

پنجاب کے پیرزادوں سے

اس نظم میں پنجاب کے پیرزادوں کی موجودہ حیثیت بیان کی گئی ہے۔ ان کے اسلاف بہت بڑے بزرگ تھے جنہیں درویشی کی بدولت لوگوں نے بڑی بڑی جاگیریں نذرانے میں دے دیں۔ اخلاف نے آبائی گدیوں کی درویشی سے چشم پوشی کر لی اور جاگیروں کو دنیوی مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگے۔ یہی لئے فقر یا کہ فقیری کی کلاہ نے دستار کا طرّہ پیدا کر لیا۔ جہاں یہ کیفیت رونما ہو جائے، وہاں فقیری اور درویشی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی

لطف کی بات یہ ہے کہ پنجاب کے پیرزادوں کی یہ حقیقت حضرت مجدد شیخ احمد سرہندیؒ کی زبان مبارک سے بیان کی گئی جو ہندوستان میں اسلامی فقر کے بہت بڑے علم بردار تھے۔

حضرت مجدّد: شیخ احمد سرہندی جن کا لقب مجدد الف ثانی ہے۔ حضرت ممدوح ۹۷۱ھ (۱۵۶۳ء) میں بمقام سرہند پیدا ہوئے اور تریسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۰۳۴ھ (۱۶۲۵ء) میں وفات پائی۔ انھوں نے اس وقت دین کی تجدید کا کام شروع کیا جب اس پر ایک ہزار سال کی مدت گزر چکی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں الف ثانی (دوسرا ہزار سالہ دور) کا مجدد کہا جاتا ہے۔

جہانگیر کے عہد میں دربار کے اندر ایرانی پارٹی کا زور ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے حضرت مجدّد کے خلاف شکایتیں کیں، اس لئے کہ دربار کے اکثر سنی اکابر اور فوج کے بڑے بڑے سالار ان کے مرید تھے۔ جہانگیر نے انہیں

دربار میں بلایا تو حضرت مجددؒ نے وقت کے رواج کے خلاف نہ تعظیمی سجدہ کیا اور نہ غیر مسنون طریق سلام گوارا فرمایا۔ یہ امر جہاں گیر پر گراں گزرا اور انہیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دینے کا حکم دے دیا۔ پھر خود ہی رہا کر دیا اور ان کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا بلکہ خاصی مدّت تک اپنے ساتھ رکھا اور ایک مرتبہ کشمیر جاتے ہوئے حضرت مجددؒ کی دعوت بھی قبول کی۔

(۱) میں حضرت شیخ مجددؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ اس مزار مبارک کی مٹی کو وہ شرف حاصل ہے کہ آسمان کے نیچے وہ نورانی تجلیوں کے ظہور کی جگہ ہے۔

(۲-۳) اس مٹی کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اس کے ذرّوں کی چمک سے ستارے بھی شرمندہ ہوتے ہیں۔ اسی مٹی میں وہ معرفت کے بھیدوں کا جاننے والا بلند مقام عارف دفن ہے، جس کی گردن جہاں گیر جیسے عظیم الشان بادشاہ کے آگے بھی نہ جھکی۔ اسی کے نفسِ گرم کی بدولت خدا کے پاک بندوں کی محفل میں گرمی اور چہل پہل ہے۔

(۴) وہی مبارک وجود ہندوستان میں ملّت اسلامیہ کے سرمایہ کا نگہبان تھا۔ وہی تھا، جسے خدا نے اسلامیّت کی حفاظت کے لئے بروقت آگاہ کر دیا۔ اور اس نے اپنی زندگی اسی حفاظت کے لئے وقف فرما دی۔

واضح رہے کہ اقبالؔ اسلامیّت کی حفاظت کے لئے ہندوستان کی تین بڑی شخصیتوں کے معتقد تھے۔ صوفیہ عظام میں سے حضرت مجددؒ کے، سلاطین میں سے عالمگیر اعظمؒ کے، علما کرام میں سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ تین شخصیتیں پیدا نہ ہوتیں تو اسلام

اپنی حقیقی صورت میں یہاں محفوظ رہ سکتا۔ بروقت خبردار ہونے سے مراد یہ ہے کہ حضرت مجدد نے بادشاہ، حکمراں طبقے اور درباریوں کی روش نیز زمانے کے حالات و رجحانات کو دیکھتے ہوئے بروقت اندازہ کر لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر تجدید دین کے لئے خاص کوششیں نہ کی گئیں تو اسلام اس سر زمین میں اپنی حقیقی شان کے ساتھ قائم نہ رہ سکے گا۔ حضرت مجدد کی پہلی عظمت اسی آگاہی اور حقائق بینی پر موقوف ہے۔ پھر انہوں نے دینی مقاصد کے لئے سرگرم کوششوں میں اپنی گراں مایہ زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دیا۔

(۵) میں نے حضرت مجدد سے عرض کیا کہ مجھے بھی فقر کی دولت عطا ہو۔ میری آنکھوں میں دیکھنے کا جوہر تو موجود ہے، لیکن ان میں حقیقی بیداری پیدا نہیں ہوئی یعنی وہ کھلی نہیں کہ نیک و بد کا امتیاز کر سکیں۔

(۶) حضرت کے مزار سے یہ آواز میرے کانوں میں آئی کہ پنجاب کے لئے فقر کا دروازہ بند ہو گیا کیونکہ اہل حق اس ولایت (پنجاب) سے بیزار ہو چکے ہیں؛ کیوں بیزار ہو چکے ہیں؟ سوال کا جواب اگلے شعر میں دیا گیا ہے۔

(۷) وہ خطہ اہل معرفت معرفت کا ٹھکانا نہیں بن سکتا اور اللہ والے لوگ وہاں نہیں رہ سکتے، جہاں درویشی کی کلاہ سے طرۂ دستار پیدا ہو یعنی فقیری کی جگہ امیری اور دنیا داری کا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔

واضح رہے کہ یہاں عام دنیا داروں کا طریقہ مقصود نہیں بلکہ ان پیر زادوں کا طریقہ مقصود ہے جو فقیری اور درویشی کی گدیوں کے مالک بن کر امیری کے درجے پر پہنچے لیکن انہوں نے دین کی خدمت چھوڑ کر دنیا داری کا طریقہ

اختیار کرلیا۔ انہیں دولت اور عزّت اپنے بزرگوں کی وجہ سے ملی، جو اونچے درجے کے درویش تھے لیکن اس دولت اور عزّت کو انہوں نے خدمتِ خلق کے بجائے ذاتی اغراض کے لئے استعمال کیا۔

(۸) جب تک فقر کی کلاہ قائم رہی اور درویشی کے سلسلے میں کوئی فرق نہ آیا، اس وقت تک ان لوگوں کے دل میں خدا کی محبّت موج زن تھی اور ان میں کلمۂ حق کہنے کا سچّا جوش موجود تھا۔ جب درویشی کی کلاہ اتر گئی اور اس کی جگہ دستار کے طرّے بلند ہوگئے تو خدامستی ختم ہوگئی اور حکومت کی خدمت کا نشہ دل و دماغ پر چھا گیا، یعنی ان لوگوں کا کام صرف یہ رہ گیا کہ حکومت کے مقاصد پورے کریں اور اپنے درجے بڑھائیں۔

سیاست

تعین: مقرر کرنا۔ مراتب: مرتبہ کی جمع۔ فرزیں: لفظی معنی وزیر۔ اصطلاح میں شطرنج کا وہ مہرہ جس کا درجہ بادشاہ کے بعد ہوتا ہے۔ پیادہ: شطرنج کا سب سے چھوٹا مہرہ۔

(۱) اجنبی حکومت نے یہاں شطرنج کی جو بساط بچھائی ہے، اس میں درجوں اور مرتبوں کا مقرر کرلینا ضروری تھا چنانچہ شطرنج کھیلنے والے نے اس کا انتظام کردیا۔ ایک کو اپنی عنایت سے وزیر بنادیا اور دوسرے کو پیادہ۔

اس سے سیاسی شطرنج کا وہ کھیل مقصود ہے، جو متحدہ ہندوستان میں دوعملی کے نظام کے ماتحت یا اس کے بعد بڑی حد تک صوبائی خودمختاری کے

نظام میں کھیلا جاتا رہا۔ اقبال کی مراد یہ ہے کہ یہ کھیل بھی مختلف درجوں کے مہرے تجویز کئے بغیر کھیلا نہ جا سکتا تھا۔ لہٰذا حکمرانوں نے جسے عنایت کا مستحق سمجھا، وزیر بنا دیا۔ جسے مستحق نہ سمجھا، اسے پیادہ رہنے دیا۔ اس حقیقت کو خوب ذہن نشین کر رکھئے کہ یہ درجے استحقاق یا صلاحیت کی بنا پر نہ ملے۔ صرف حاکموں کی عنایت ہی سے وابستہ رہے۔ اقبال بعض اوقات ایک لفظ ایسا استعمال کر جاتے ہیں جس کے معارف بیان کئے جائیں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ یہ دقیقہ سنجیاں ان کی حقیقت گوئی کا ایک امتیازی پہلو ہیں۔

(۳) بے چارہ پیادہ تو ایک ناچیز مہرہ ہے۔ وہ اگر شطرنج کھیلنے والے کے مقصد سے واقف نہیں تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ وزیر بھی اونچے مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود شطرنج کھیلنے والے کے اصل ارادے سے آگاہ نہیں۔ یہ ارادے وزیر کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہیں۔

مراد یہ ہے کہ انگریزی سیاست کے نظام میں جن ملکی لوگوں کو انگریزوں نے اونچے عہدے دے دیئے، وہ بھی انگریزوں کی اصل غرض سے واقف نہ ہو سکے۔

فقر

اس نظم میں فقر کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہ جسے ہمارے زمانے میں عام لوگ فقر کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ دوم حقیقی اسلامی فقر۔ دونوں کے اوصاف اقبال نے واضح کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک پہلا فقر ہرگز فقر نہیں۔ وہ حقیقی فقر ہی کی دعوت دیتے ہیں۔

نخچیری: شکار کرنا یا ہونا۔ میری: سرداری، برتری۔

(۱) ایک فقر وہ ہے جو شکاری کو شکار بناتا ہے یعنی اس کی عملی قوتوں میں ضعف اور افسردگی پیدا کر کے اسے بے بس بنا دیتا ہے۔ دوسرا فقر وہ ہے جس کی برکت سے دنیا کو مسخر کر لینے کے بھید آشکارا ہوتے ہیں۔

(۲) ایک فقر وہ ہے جو قوموں میں مسکینی، بے چارگی اور رنج وغم پیدا کرتا ہے یعنی ان کی قوت زائل کر دیتا ہے حکومت کی گدی سے اتار دیتا ہے اور زندگی بسر کرنے کے ضروری سامانوں سے بھی محروم کر کے رنج وغم میں الجھا دیتا ہے۔ دوسرا فقر وہ ہے جس سے مٹی میں کیمیا کی تاثیر پیدا ہوتی ہے یعنی وہ مٹی کو سونا نہیں بناتا بلکہ اکسیر کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ وہ جس سے چھوئے سونا بن جائے۔

(۳) ایک فقر وہ ہے جو حضرت امام حسینؓ کو نصیب ہوا۔ اسی فقر میں سرداری اور برتری ہے۔ اور حضرت امام حسینؓ ہی کا فقر دراصل مسلمان کی میراث ہے۔ یہی میراث اس کے لئے موجب فخر ہے یعنی مسلمان کو حضرت امام کے طریقے پر چلنا چاہیئے۔

خودی

روشن بصر: جس کی نظر روشن ہو۔

(۱) خودی کو سونے چاندی کے بدلے میں نہ بیچ شعلے کو چنگاری کے بدلے میں کوئی نہیں دیتا۔

اس شعر میں خودی کو شعلہ اور سیم و زر کو چنگاری کہا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ خودی کے مقابلے میں سیم و زر کی کوئی حیثیت نہیں۔

(۲) ایران کا مشہور شاعر فردوسی جسے قدرت نے حقیقت کو دیکھنے والی آنکھ عطا کی تھی جس کے پیش کئے ہوئے سرمے سے ایرانیوں کی نگاہیں روشن ہوگئیں — کہتا ہے:

(۳) روپے پیسے کے لئے غصے میں نہ آ اور اپنی عادت نہ بگاڑ۔ چاہیئے کہ تو اپنی اصل حالت برقرار رکھے۔ پیسہ نہیں ملتا تو نہ ملے۔ تیرے لئے کہاں زیبا ہے کہ اس کے پیچھے اپنی انسانیت کو برباد کرلے؟

جدائی

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں میں سے صرف انسان کو اپنی اصل سے جدائی کا احساس عطا ہوا ہے۔

(۱) سورج سنہرے تاروں سے دنیا کے لئے نور کی چادر بن رہا ہے۔ یعنی سورج کی کرنیں اپنی روشنی سے کائنات کی ہر شے کو منور کر رہی ہیں۔

(۲) دنیا اس طرح خاموش اور مست نظر آتی ہے۔ گویا ہر چیز کو حضوری کا شرف حاصل ہوگیا۔

(۳) دریا، پہاڑ، چاند اور تارے کیا جانیں کہ جدائی اور اس کی وجہ سے بے قراری کیا ہوتی ہے؟ انہیں جدائی کا احساس ہی کہاں ہے؟

(۴) جدائی کے غم کا صرف میں (انسان) مستحق ہوں۔ یہی مٹی (انسان)

جدائی کا احساس رکھتی ہے۔

خانقاہ

قُم باذن اللہ: خدا کے حکم سے اٹھ۔

(۱) اشارے کنایے میں بات کہنا ویسے بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اور مجھے بات بنانے کا فن بھی نہیں آتا۔ صاف گو ہوں اور لگی لپٹی رکھے بغیر سچّی بات کہ دیتا ہوں۔

(۲) سچّی بات یہ ہے کہ خانقاہوں میں رہنے والے جو لوگ قُم باذن اللہ کہتے تھے اور مردہ دلوں میں زندگی کی روح پیدا کر دیتے تھے، وہ تو چل بسے۔ اب یا تو وہ باقی رہ گئے ہیں جو قبروں کی مجاوری کر کے پیٹ پالتے ہیں یا وہ لوگ جو پیسے لے کر قبریں کھودتے ہیں۔

غالباً آج کل کی عام خانقاہوں کا اتنے مختصر الفاظ میں اس سے بہتر نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ البتہ سب خانقاہوں کی یہ حالت نہیں۔ ہر کلیہ میں استثناد ہوتے ہیں اور حکم اکثریت پر لگتا ہے۔

ابلیس کی عرضداشت

مغربی تہذیب کے باعث دنیا میں جو برائیاں پیدا ہوئیں، اس نظم میں ان کا ذکر ابلیس کی زبان سے کیا گیا ہے۔ ابلیس بارگاہ باری تعالے' میں عرضداست پیش کرتا ہے کہ دنیا میں ایسے ارباب سیاست پیدا ہو چکے ہیں،

جن کی کارکردگی کے بعد دنیا کو میری ضرورت نہیں رہی۔

عزازیل: ابلیس کا اصل نام۔ پرکالۂ آتش: لفظی معنی آگ کا ٹکڑا، مراد سخت فتنہ کا انگیز۔

(۱) ابلیس دنیا کے مالک و خالق کی بارگاہ میں عرض کر رہا تھا کہ انسان کی مٹھی بھر خاک تو فتنہ انگیزوں کے باعث آگ کا ٹکڑا بن گئی۔

(۲) اس کی حالت کیا ہے؟ جان حد درجہ کمزور، بدن خوب موٹا تازہ، لباس خوب موزوں اور نفیس، دل کی کیفیت یہ گویا اس پہ نزع کا عالم طاری ہے۔ عقل خوب منجھی ہوئی اور چالاک و ہوشیار۔

جن قوموں نے خدا کے حکموں ہی کو نہیں بلکہ خدا کو بھی بھلا رکھا ہے، ان کے افراد کی حالت کا اتنا صحیح نقشہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ کمال یہ ہے کہ چند لفظوں میں ظاہر و باطن دونوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

(۳) جن چیزوں کو اہل مشرق کی شریعت میں ناپاک قرار دیا گیا تھا، مثلاً شراب، جوا، سود وغیرہ مغرب کے مفتیوں نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ وہ سب چیزیں پاک ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے۔ شراب عام طور پر بے تکلف پی جاتی ہے اور ایسے انداز میں پی جاتی ہے، گویا یہ نیکی کا خاص کام ہے۔ جوئے کے لئے مستقل قمار خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ گھڑ دوڑیں، لاٹریاں اور تاش جوئے ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ بنکوں کے ذریعے سے سود کا بھی عام رواج ہو گیا ہے۔

(۴) اے خدا! کیا تجھے معلوم نہیں، انسان کی بد عملیوں کو دیکھتے ہوئے

بہشت کی حوروں کو یقین ہو گیا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بہشت کے لائق نہیں!
لہٰذا وہ بہشت کے لیئے بے آباد ہو جانے کا خیال کرتی ہوئی غم میں مبتلا ہیں۔
آج کل کے سیاست داں عوام کے حق میں ابلیس بن گئے ہیں اور انہوں نے میری مسند سنبھال لی ہے۔ پھر اب آسمان کے نیچے میری ضرورت کیا رہی؟

لہو

اس نظم میں لہو سے مراد بظاہر ہمت و جواں مردی ہے۔
(۱) اگر لہو بدن میں موجود ہو تو ڈر اور خوف پاس نہیں پھٹکتا اور دل میں کسی خطرے کا وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔
(۲) جسے لہو جیسا قیمتی سرمایہ مل جائے اسے نہ چاندی سونے سے محبت ہوتی ہے، نہ غریبی اور ناداری کا غم رہتا ہے یعنی وہ اپنی ہمت و جرأت کی بدولت ضرورت کی ہر چیز حاصل کر لیتا ہے۔

پرواز

اس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جو وجود خاک کی کشش سے آزادی حاصل نہیں کرتا اسے پرواز کی لذت نصیب نہیں ہو سکتی۔
غم کدۂ رنگ و بو: لفظی معنی رنگ و بو کا وہ مقام جو غم کا گھر ہے یعنی دنیا۔ عالمِ ایجاد: مراد دنیا۔
(۱) ایک دن درخت نے جنگلی پرندے سے کہا کہ اس دنیا کی بنیاد تو ظلم پر ہے۔
(۲) خدا اگر مجھے بھی بال و پر عطا کر دیتا تو اس جہان کی رونق اور چہل پہل

اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

(۳) جنگلی پرندے نے درخت کو خوب جواب دیا اور کہا کہ غضب ہے، تو نے انصاف کو ظلم سمجھ رکھا ہے۔

(۴) اس دنیا میں اڑنے کی لذّت حاصل کرنے کا اسے کوئی حق نہیں جس کا وجود مٹی کی کشش سے آزاد نہ ہو۔

مقصود یہ ہے کہ ہر وجود اپنی ہمّت اور عزم کی بدولت جو چاہے، بن سکتا ہے، لیکن ہر حالت کے لئے خاص شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کو پورا کرنا چاہیے۔ درخت یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مجھے بال و پر عطا نہ ہوئے اور قدرت کا یہ ظلم تھا۔ پرندے نے ثابت کر دیا کہ تو جب تک مٹی میں گڑا ہوا ہے اور اس کی کشش سے نجات نہیں پا سکتا تو بال و پر مل جانے پر بھی کیا کر لیتا؟ تیری حالت کے مطابق جو کچھ تجھے ملا وہ عین انصاف ہے لیکن تو غلطی سے اسے ظلم سمجھ رہا ہے۔

شیخ مکتب سے

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ مدرسے میں استاد طلبہ کی روح کو سنوارنے اور سیرت کا صحیح سانچا تیار کرنے کا ذمّہ دار ہے۔ نظم میں خطاب خود استاد سے ہے۔

قاآنی: ایران کا مشہور شاعر جسے پرانی ایرانی شاعری کا خاتم کہا جاتا ہے۔

(۱) اے مدرسہ کے استاد! تو معمار ہے۔ تیرا کام یہ ہے کہ انسانی روح کی

عمارتیں صحیح اصول پر بنائے یعنی طلبہ کی سیرتیں اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کرے۔

(۲) تیرے لئے ایران کا مشہور شاعر حکیم قاآنی ایک دل نشین نکتہ بیان کر گیا ہے۔

(۳) وہ نکتہ کیا ہے؟ یہ کہ اگر تو اپنے گھر کا صحن روشن رکھنا چاہتا ہے تو ایسی دیوار نہ بنا جو سورج کی روشنی کو روک دے۔

مراد یہ ہے کہ مدرسے کے استاد کو ایسی تعلیم نہ دینی چاہئے جس سے طلبہ کی روحوں میں تاریکی پیدا ہو اور وہ فطرت کے سورج کی روشنی سے محروم ہو جائیں۔

فلسفی

بلند بال: اونچا اُڑنے والا۔ جسور: جسارت والا۔ دلیر

(۱) فلسفی اگرچہ بہت اونچا اڑتا تھا لیکن اس میں نہ دلیری تھی نہ غیرت اس لئے شکار کے لذت سے اسے حصہ نہ مل سکا۔

(۲) گدھ اگرچہ شاہین کی طرح فضاؤں میں اڑتا رہا، لیکن اسے زندہ شکار کی لذت نصیب نہ ہوئی۔ وہ مردار ہی کھاتا رہا۔

جرأت اور غیرت شاہین کی خصوصیتیں ہیں۔ جرأت اس لئے کہ وہ خود شکار کرتا ہے اور یہ جرأت و دلیری کا فعل ہے۔ غیرت اس بنا پر کہ نہ کسی کا مارا ہوا شکار کھاتا ہے، نہ مرا ہوا۔ گدھ اگرچہ بلندی پر اڑ لیتا ہے لیکن جرأت و غیرت دونوں سے محروم ہو گیا۔ یہی حالت فلسفی کی ہے۔

شاہین

اقبال نے اس نظم میں شاہین کو پرندوں کی دنیا کا درویش قرار دیا ہے اور اس تمام خصوصیتیں نہایت خوبی سے بیان کی ہیں۔ یہی حقیقت میں فقرو درویشی کی خصوصیتیں ہیں۔ شاہین اپنا حال خود بیان کرتا ہے۔

خاکدان: لفظی معنی مٹی کا گھر۔ مراد دنیا۔ راہبانہ: درویشوں جیسی خیابانی: باغوں رہنے والا۔ ضربت: چوٹ، وار۔ حمام: وہ پرندہ جس کے گلے میں طوق ہو، مثلاً قمری فاختہ یا طوق والا کبوتر۔ بے کرانہ: بے کنارہ۔

(۱) شاہین کہتا ہے کہ میں اس دنیا سے الگ ہو گیا ہوں جہاں رزق کا نام دانہ پانی رکھا گیا ہے۔ دنیا سے الگ ہوجانا درویشی کی پہلی خصوصیت ہے۔

(۲) جنگل کی تنہائی مجھے بہت پسند آتی ہے۔ جہاں کی پیدائش ہی وقت سے میری طبیعت درویشوں جیسی چلی آرہی ہے۔

(۳) جنگل میں نہ فصل بہار آتی ہے، نہ پھول پیدا ہوتے ہیں، نہ وہاں پھول چننے والے پائے جاتے ہیں، نہ بلبل نظر آتی ہے، نہ اس کے عشق و محبت سے بھرے ہوئے نغموں کی بیماری کا کوئی وجود ہے۔

(۴) باغ میں بسنے والوں سے الگ تھلگ رہنا میرے لئے لازم ہے۔ ان کے طور طریقوں میں دلبری کے پہلو ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے دلبری سے کیا واسطہ؟ میں تو عزم و ہمت کا قائل ہوں۔

(۵) جنگل میں رہنے سے جوانمردوں کی غازیوں جیسی چوٹ میں اور بھی قوّت آتی ہے اور وہ زیادہ کاری بن جاتی ہے۔

(۶) میں قمری، فاختہ اور کبوتر کا بھوکا نہیں، کیونکہ شاہیں تو زاہدوں اور درویشوں جیسی زندگی بسر کرتا ہے۔

(۷) میں پہلے شکار پر جھپٹتا ہوں، پھر پلٹ آتا ہوں، دوبارہ مڑ کر جھپٹتا ہوں۔ یہ سب لہو گرم رکھنے کی تدبیریں ہیں۔

(۸) پورب، پچھم چکوروں کی دنیا ہے جنہیں عزم و ہمت سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں نیلے آسمان کی فضاؤں میں اڑتا ہوں، جن کا کوئی کنارہ نہیں۔

(۹) ان خصوصیتوں کی بنا پر میں پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں اور گھونسلا نہیں بناتا۔

باغی مرید

اس نظم میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مریدوں میں بغاوت کی لہر پیدا ہو رہی ہے اور پیروں کی بداعمالیاں دیکھ کر وہ ارادت سے کنارہ کش ہونے لگے ہیں۔ پیروں کی بداعمالیاں باغی مرید کی زبان سے بہت موزوں معلوم ہوتی ہیں۔

خرقۂ سالوس: مکر و فریب کا لباس۔ زاغ: کوّا۔

(۱) باغی مرید کہتا ہے کہ ہم لوگوں کو تو مٹی کا دیا بھی میسّر ہے نہیں اور پیر کے گھر میں بجلی کے چراغ جل رہے ہیں۔

(۲) مسلمان شہری ہو یا دیہاتی، نہایت سادہ مزاج اور بھولا بھالا ہوتا ہے۔ وہ سادگی کے باعث ان پیروں کو جنہیں کعبے کے برہمن کہنا چاہیئے، بتوں کی طرح پوجتا ہے۔

کعبے کے برہمن کی ترکیب غور طلب ہے، پیر کو برہمن اس لئے کہا کہ اس کے طور طریقے برہمن جیسے ہوتے ہیں۔ کعبے کی نسبت اس لئے ضروری ہوئی کہ وہ مسلمان تھے۔

(۳) پیر مریدوں سے جو نذر و نیاز لیتے ہیں، اسے نذر نہیں بلکہ حرم کے پیروں کا سود سمجھنا چاہیئے۔ مکر و فریب کے جس لباس کو بھی دیکھو گے، اس میں تمہیں مہاجن نظر آئے گا۔ مطلب یہ ہے کہ سود لینا مہاجن کا کام ہے۔ جب پیروں کی نذر و نیاز سود ٹھہری تو پیر خود بخود مہاجن بن گیا۔

(۴) حیرت اس بات پر ہے کہ یہ لوگ وعظ و نصیحت کی مسند پر سنبھالے بیٹھے ہیں، گویا عقابوں کے ٹھکانوں پر کووں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

ہارون کی آخری نصیحت

اس نظم کا مقصد یہ ہے کہ کافر چونکہ خدا کا منکر ہوتا ہے، اس لئے موت اسے یاد نہیں رہتی، نیز وہ حیات بعد الموت کا قائل نہیں اور اسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو شخص یہاں نیک کام کرے گا، وہ موت کے بعد کی زندگی میں ان کا پھل پائے گا، لہٰذا اسے ہر قدم پر موت یاد رہتی ہے۔

صاحب ایمان کی شان ۔۔۔ یہی ہے کہ موت کو ایک لمحے کے لئے بھی نہ بھولے۔ دنیا میں موت کی یاد کا تازہ رہنا بھی انسان کے لئے نیک کاموں کا محرک ہوتا ہے۔

ہارون: عباسی خاندان کا پانچوں خلیفہ مہدی کا بیٹا اور منصور کا پوتا ۱۷۰ھ (۷۸۹ء) میں مسند نشین ہوا اور ۱۹۳ھ (۸۰۹ء) میں وفات پائی۔ عباسی خاندان کا کمال عروج اسی کے عہد میں ہوا اور یہ دور عروج اس کے بیٹوں المامون اور معتصم کے زمانے تک رہا۔ بغداد نے ہارون ہی کے عہد عظمت کی انتہائی منزلیں طے کیں۔ ملکہ زبیدہ جس کے نام سے مکۂ معظمہ کی نہر زبیدہ موسوم ہے، ہارون ہی کی چہیتی ملکہ تھی۔ اس کے تین بیٹوں نے شہرت پائی۔ ایک امین الرشید، دوسرا مامون الرشید، تیسرا معتصم باللہ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہارون نے ان میں سے کسے یہ نصیحت کی تھی؟

(۱) ہارون نے اس دنیا سے کوچ (موت) کے وقت اپنے بیٹے سے کہا کہ تجھے بھی آخرکار اسی راستے سے گزرنا ہے اپنی موت سے تو بچ نہیں سکتا۔

آج میں کل تمہاری باری ہے

(۲) جو شخص خدا کا منکر ہو، اس کی نظروں سے موت کا فرشتہ چھپا رہتا ہے۔ اس لئے کہ موت اسے یاد نہیں رہتی۔ لیکن مسلمان کی نظروں سے وہ چھپا نہیں رہ سکتا کیونکہ مسلمان موت کو ہر وقت یاد رکھتا ہے۔

ماہر نفسیات سے

(۱) اے نفسیات کی جانچ پڑتال میں زندگی گزار دینے والے! تجھ میں جرأت ہے تو خیالات کی دنیا سے گزر کر آگے نکل جا۔ خودی کے سمندر میں صرف یہی دنیا نہیں اور بھی بہت سے جزیرے ہیں۔

(۲) یہ سمندر حد درجہ خاموش اور پر اسرار ہے۔ اس میں کہیں طوفان کا جوش و خروش نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کے بھید معلوم کرنا چاہیئے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اسے ضرب کلیمی سے چیر ڈال۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم سے سمندر پر عصا کی ضرب لگائی اور وہ پھٹ گیا۔ اسی طرح تو بھی خودی کے سمندر پر حضرت موسیٰؑ کی ضرب سے کام لے۔ حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ کا ذکر سورۂ شعراء میں ہے۔

فاوحینا الیٰ موسیٰ	پھر ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ
ان اضرب بعصاک البحر	تو اپنے عصا کو سمندر پر مار (موسیٰؑ
فانفلق فکان کل فرق	نے یہی کیا) پس سمندر پھٹ گیا اور
کالطود العظیم۔	ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ جیسا ہو گیا۔

غرض خدا کے سچے بندوں کا طریقہ یہی ہے کہ وہ خلوص سے اس کے حکموں کی پیروی کرتے ہیں مشکلات سے کبھی نہیں گھبراتے۔ خدا کی رضا پر مر مٹنا ہی ان کی تمام مشکلات کو ختم کرنے کا سبب بن جاتا ہے حضرت موسیٰؑ کے

پاس کوئی سامان نہ تھا۔ فرعون کے لاؤ لشکر سے دنیا کانپ رہی تھی۔ خدا کی رحمت سے حضرت موسیٰ کو راستہ مل گیا اور فرعون غرق ہو گیا۔

یورپ

یہ نظم جیسا کہ اقبالؔ نے خود لکھا ہے، نیٹشے سے ماخوذ ہے، جس کا خیال تھا کہ سود خوار یہودی یورپ پر چھائے جا رہے ہیں۔ یورپ کی حیثیت پکے ہوئے پھل کی ہے۔ وہ شاخ سے ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس کی جھولی میں گرے؟ یہودیوں کی یا کسی دوسرے کی؟ نیٹشے کا یہی خیال تھا جسے ہٹلر نے جامۂ عمل پہنانے کے جوش میں آریائی نسل کے تعصب کی آگ بھڑکائی اور یہودیوں کو نسلاً سامی قرار دے کر جرمنی کے حدود سے باہر نکال دیا۔ ان میں بڑے بڑے اہل علم بھی تھے، جیسے آئن سٹائن، تاجر، صناع اور کارخانہ دار بھی۔

(۱) یہودی سود خوار مدت سے تاک لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کی مکاری اور فریب کاری کے سامنے چیتے جیسے تند خو جانور کی قوت بھی بالکل بے کار اور بے بس ہے، یعنی کسی کے قبضے میں کیسی ہی قوت ہو، مگر وہ یہودیوں کی مکاری کے سامنے ضرور شکست کھا جائے گا۔

(۲) آج کل یورپ کی حیثیت ایک ایسے پھل کی ہے، جو خوب پک چکا ہو اور جس کے متعلق یقین ہے کہ وہ شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گرنے والا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ پھل آخر کار کس کی جھولی میں گرتا ہے۔

آزادیِ افکار

اس نظم میں اقبالؔ نے مادر پدر آزادی کی مذمت کی ہے، جس کا رجحان نوجوانوں میں بڑھ رہا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو خدا بلند فکری کی نعمت عطا کرتا ہے تو یقیناً اس پر خوش ہونا چاہیے۔ زمانے میں ایسے ہی افکار کی بدولت روشنی پھیلتی ہے لیکن جس قوم کے لوگ اخلاق، مذہب یا انسانی شرافت کی پابندیوں سے آزاد ہو چکے ہوں، وہاں افکار کی آزادی ایسے فتنے پیدا کرتی ہے کہ ماننا پڑتا ہے، یہ ابلیس کی ایجاد ہے۔ بالکل اسی قسم کے خیالات اقبالؔ نے اپنی ایک مثنوی میں بھی پیش کئے تھے۔ فرماتے ہیں:

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

واقعی جہاں اخلاقی مذہبی قیود ختم ہو چکے ہوں، وہاں مادر پدر آزادی کا نتیجہ فتنوں کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا اور فتنے پیدا کرنا ابلیس کا کام ہے۔

(۱) جو مسکین پرندہ اپنی فطری پستی کے باعث اڑنے کے لائق نہیں، وہ اگر اڑے گا تو گرنے کے سوا اس کا کوئی انجام نہیں ہو سکتا۔

(۲) ہر آدمی کا سینہ جبریلؑ کے اترنے کا مقام نہیں ہو سکتا اور ہر فکر فردوس کے پرندوں کا شکار نہیں کر سکتی۔ جبریل کے اترنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق خدا سے استوار ہو اور وہ جو کچھ کرے خدا کے حکموں کے مطابق کرے۔ فردوس کے پرندوں کا شکار سے مراد یہ ہے کہ وہ صحیح اور اعلیٰ قسم کے مطالب پیش کر سکے اور اس فکر میں حق کے سوا کسی جانب رُخ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔

(۳) جس قوم کے افراد ان تمام بندشوں اور پابندیوں سے آزاد ہوں، جو انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے ضروری سمجھی گئی ہیں، اس قوم میں فکر و خیال کی سوخی ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔

(۴) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی عطا کی ہوئی فکر ہی کے چراغ سے زمانے کے اندھیرے میں اجالا ہوتا ہے لیکن افکار کی غیر مشروط آزادی سخت کشتوں کا باعث ہے اور یہ ہتھکنڈا ابلیس کا ایجاد کیا ہوا ہے۔

شیر اور خچّر

اقبالؔ نے خود لکھا ہے کہ یہ خیال جرمن زبان کی کسی تصنیف سے لیا گیا ہے۔

(۱) شیر خچر سے کہتا ہے کہ جنگل اور بیابان میں جتنے جانور رہتے ہیں، میں نے سب دیکھے ہیں۔ تیری وضع قطع ان سب سے الگ اور نرالی ہے، بتا تیرے باپ دادا کون تھے اور تو کس قبیلے سے ہے؟

(۲) خچر نے سوچا کہ اگر باپ کا ذکر کروں تو کہنا پڑے گا کہ گدھے کی اولاد ہوں، اور یہ امر ہتک کا باعث ہے۔ لہٰذا ماں کا سلسلہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ حضور آپ میرے ماموں کو نہیں پہچانتے یعنی وہ گھوڑا جو ہوا کی طرح چلتا ہے اور جس سے شاہی اصطبل کی آبرو اور عزت بڑھتی ہے۔

چیونٹی اور عقاب

(۱) ایک چیونٹی عقاب سے کہتی ہے کہ لوگ مجھے پاؤں کے نیچے روندتے ہیں۔ میں خوار و ذلیل، پریشان اور دکھی ہوں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اور تیرا رتبہ کس لئے ستاروں سے بھی اونچا ہے؟

(۲) عقاب جواب دیتا ہے۔ تیری پامالی خواری، پریشانی اور دردمندی کا باعث یہ ہے کہ تو اپنا رزق راستہ کی خاک سے تلاش کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہر چلنے والا تجھے روندے اور تو دکھ اٹھاتی رہے۔ میں تو آسمانوں کو بھی نگاہ میں نہیں لاتا۔

کاتب مشتاق احمد خاں رامپوری - اپریل ۱۹۶۳ء

یہ کتب ہم سے طلب فرمائیں

مطالب بانگ درا	غلام رسول مہر	۷/۵۰
مطالب بال جبریل	″	۶/۰
مطالب ضرب کلیم	″	۴/۵۰
ولادت نبوی	مولانا آزاد	۲/۰
حضرت یوسف علیہ السلام	″	۲/۲۵
فلسفہ	″	۲/۰
ہجر و وصال	″	۳/۵۰
انسان کی حیات صالحہ	″	۳/۵۰
صدائے حق	″	۲/۲۵
مضامین الہلال	″	۳/۷۵
مضامین البلاغ	″	۳/۷۵
مسلمان عورت	″	۴/۰
شہید اعظم	″	۱/۵۰
فلسفہ تعلیم و تربیت	رئیس احمد جعفری	۶/۰
مزید حماقتیں	شفیق الرحمٰن	۶/۰
الفاروق	مولانا شبلی	۶/۰
رسول اکرم کی سیاسی زندگی	ڈاکٹر حمید اللہ	۸/۰

فاطمہ کا لال	محمد رحیم چمن دہلوی	۲/۵۰

بہترین ناول

معظم علی	نسیم حجازی	۷/۵۰
اور تلوار ٹوٹ گئی	"	۸/۵۰
خاک خیبر	"	۳/۵۰
بغداد کی حسینہ	عبد الحلیم شرر	۳/۵۰
نرملا	منشی پریم چند	۲/۵۰
کنیز	سردار محمود	۳/۰
دشوار ہوا جینا	زلیخا حسین	۶/۰
حسرت ساحل	"	۴/۰
پروین	راشد سہسوانی	۳/۰
قصر فراموش	نیازی	۴/۵۰
شفق	قیسی رامپوری	۴/۰
خطا	"	۳/۵۰
تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبد الغفار مرحوم	۲/۵۰
عجیب	"	۲/۰
یزید	رئیس احمد جعفری	۸/۰
رابعہ	"	۳/۰
جواری	"	۳/۰

پتہ:- چمن بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد، دہلی ۶